یادگارِ غالب

یعنی

جناب مرزا اسد اللہ خاں متخلص غالب دہلوی کی زندگی کے حالات

اور

انکی اقسامِ نظم و نثرِ اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر ایک قسم پر جداگانہ ریمارکس

مرتبہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی

سنہ ۱۸۹۷ء

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور میں چھپی

فہرست مضامین یادگار غالب

شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک جناب مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب مرحوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور اُنکی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسنِ اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہلِ کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جنکی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں؛ اور جنمیں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود   باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ   حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اِس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے؛ مگر جو باقی تھے اور جنکے دیکھنے کا مجھکو ہمیشہ فخر رہیگا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اُٹھتا نظر نہیں آتا؛

کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا؛ اور جس ہوا میں اُنھوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔

زمانہ دگرگونہ آئیں نہاد　　　شد آں مرغ کو بیضۂ زریں نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خاں **غالب** جنکی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ اُنکو بارھویں یا تیرھویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے۔

مرزا نے اپنی کتاب "مہر نیمروز" میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں **کلیم شاعر** کو سیم و زر میں تولا گیا تھا؛ مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے۔" اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رتبے سے واقف نہیں ہیں شاید خودستائی اور تعلی پر محمول کرینگے؛ مگر ہمارے نزدیک مرزا نے اسمیں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا؛ بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو اُنکے زمانے کے اہلِ نظر اور اہلِ تمیز اُنکی نسبت رائے رکھتے تھے۔

اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی؛ اُن کا تمام کلام؛ اُردو، فارسی، نظم اور نثر اُنکے جیتے ہی جی اطرافِ ہندوستان میں پھیل گیا تھا؛ اُنکے ماننے والے اور مداح و ثناخواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں؛ مدحیہ قصائد پر اُنکو کم و بیش صلے اور خلعت و انعام بھی ملتے رہے؛ مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق اُنکی خاصی قدر کی؛ ریاستِ رامپور سے اُنکے لیے اخیر دم تک معقول وظیفہ جاری رہا؛ یہ سب کچھ ہوا؛ مگر جب مرزا کے اُس اعلیٰ مرتبے کا جو شاعری و انشا پردازی میں فی الواقع اُنھوں نے حاصل کیا تھا۔ ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرزال کی سی قدردانی تھی جو ایک سوت کی

اَنٹی لیکر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا؛ یا جہانگیر و شاہجہاں؛ مگر جس قدر اس اخیر دَور میں اُنکو مانا گیا اُسکو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیے۔

بکے مُفت یہاں ہم زمانے کے ہاتھوں　　　یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُنکی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف اسی ایک کام نے اُنکی لائف کو دار الخلافہ کے اخیر دَور کا ایک مُہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس مُلک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا ہے؛ اور اردو نظم و نثر پر بھی اُنکا کچھ کم احسان نہیں ہے؛ اسی لیے کبھی کبھی مجھکو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور اُنکی شاعری و انشا پردازی کے متعلق جو اُمور کہ احاطۂ بیاں میں آسکیں اور ابنای زماں کی فہم سے بالاتر نہوں؛ اُنکو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں۔

پچھلے برسوں میں جبکہ مَیں دلی میں مقیم تھا۔ بعض احباب کی تحریک سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ مَیں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لیکر جمع کیا؛ اور جس قدر اسمیں اُنکے حالات اور اخلاق و عادات کا سُراغ ملا اُنکو قلمبند کیا؛ اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں۔ اُنکو بھی ضبطِ تحریر میں لایا۔ مگر ابھی ترتیبِ مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اَور کاموں میں مصروف ہو گیا؛ اور کئی برس تک وہ تمام یادداشتیں کاغذ کے مُٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔

ان دنوں میں دوستوں کا پھر تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور۔ باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام میں مصروف تھا۔ دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اُس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا؛ اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے

جمع کی گئی ہیں ؛ اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہو سکتی ہیں۔ اُنکو اب زیادہ حالت منتظرہ میں رکھنا مناسب نہیں
مَیں نے اُن مسودوں کو کھولا اور اُن یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا ؛ مگر اُن کے دیکھنے سے
معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی ؛ اور اِسکے سوا کچھ اور کتابیں بھی
درکار ہونگی۔ میں نے دِلّی کے *بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور اُنھوں نے مہربانی فرما کر میری
تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات اُنکو معلوم ہو سکے لکھکر میرے پاس بھیجدیے ؛ اور
اِس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اُسکی تکمیل ہو سکتی تھی مکمل کی گئی۔

مَیں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی معتد بہ اور عالیشان واقعہ اُنکی شاعری و اِنشاپردازی
کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہذا جس قدر واقعات اُنکی لائف کے متعلق اِس کتاب میں مذکور ہیں اُنکو ضمنی اور
استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اِس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اُس عجیب و غریب ملکہ کا
لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالےٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا ؛ اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرائے
میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشقبازی اور رندمشربی کے لباس میں، اور
کبھی تصوّف اور حُبِّ اہلبیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر اِن چاروں باتوں سے علاقہ نہیں
رکھتا اُسکو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

لٹریری دنیا میں بہت سے صاحب کمال ایسے گذرے ہیں جنکے زمانے میں اُنکی قدر و منزلت کا پورا
پورا اندازہ نہیں کیا گیا ؛ مگر آخر کار اُن کا کمال ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ سعدی کے زمانے میں اُسکے

* یعنی نواب سعید الدین احمد خاں خلف الصدق نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور سید اکبر مرزا و سید مظفر مرزا نبائر نواب
حسام الدین حیدر خاں مرحوم اور میر مہدی حسین مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق ۱۲

اکثر ہمعصر امامی ہروی کو اُسپر ترجیح دیتے تھے ؛ مگر کچھ بہت عرصہ نہ گذرا تھا کہ سعدی کا نام اور اُسکا
کلام اطرافِ عالم میں منتشر ہو گیا ؛ اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا۔ شکسپیر کے عہد میں
اُسکو ایک ایکٹر سے زیادہ رتبہ نہیں دیا گیا، مگر آج اُسی شکسپیر کے ورکس بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔
خود مرزا بھی اپنے کلام کی نسبت ایسا ہی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں۔

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن؟ — ایں مَی از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است — شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

اگرچہ اِس لحاظ سے۔ کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یورپین سولزیشن میں روز بروز جذب ہوتا جاتا ہے
اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا ہے کہ بظاہر اُسکے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی۔
یہ امید رکھنی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آیندہ زمانے میں مقبولِ خاص و عام ہوگی ؛
لیکن جو تو بر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر اُنکی زندگی میں پڑے رہے اور جو اب تک
مرتفع نہیں ہوے ؛ کیا عجب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔

مرزا کو بحیثیت شاعری پبلک سے روشناس کرنے اور اُنکی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر
کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ اُنکے اصنافِ کلام میں سے ایک معتد بہ حصہ نقل کیا جاتا، ہر صنف میں جو
باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں، جو کلام نقل کیا جاتا اُسکی لفظی و معنوی خوبیاں،
نزاکتیں، اور باریکیاں ظاہر کی جاتیں، شعرا کے جس طبقے میں مرزا کو جگہہ دینی چاہیے اُس طبقے کے
شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، اُنکی غزل سے مرزا کی غزل کو، قصیدے سے
قصیدے کو، اور اِسی طرح ہر صنف سے اُسی صنف کو ٹکرایا جاتا، اور اِسطرح مرزا کے پایۂ شاعری اور اُنکے

کلام کی حقیقت سے اہلِ وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گذار تھا اُسی قدر پبلک کے لیے خاصکر اس زمانے میں غیر مفید بھی تھا؛ اگر ہم اس دشوار گذار منزل کے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثل ہوتی کہ "مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانیوالونکو کچھ مزا نہ آیا"

ناچار ہم نے بجاے طریقۂ مذکور کے جو حالتِ موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لیے سہل تر اور پبلک کے لیے مفید تر معلوم ہوتا ہے۔ ہمنے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے؛ نظم اُردو، نثر اُردو، نظم فارسی اور نثر فارسی۔ اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے۔ ہر قسم پر اوّل کچھ مختصر ریمارکس کیے ہیں۔ پھر اُس قسم کا انتخاب لکھا گیا ہے۔ اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں اُنکی جا بجا شرح بھی کردی گئی ہے۔ اور کہیں کہیں محاسنِ کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں۔ خاصکر اُن لوگوں کے لئے جو فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلّم الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کرکے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال بہم پہنچایا تھا۔

مذکورۂ بالا انتخاب سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ مرزا کے کلام میں جس قدر بلند اور پاکیزہ خیالات تھے وہ سب لے لئے گئے ہیں؛ اور جو اُن سے پست درجے کے خیالات تھے وہ چھوڑ دیے گئے ہیں؛ نہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس رسالے کی بساط اور وسعت کے موافق تا بمقدور ہر ایک صنف میں سے کم و بیش ایسا کلام لے لیا گیا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے مذاق سے بیگانہ اور اُنکی فہم سے بعید تر نہو؛ اور باوجود اسکے مؤلف کی نظر میں بھی بوجہ من الوجوہ انتخاب کے قابل ہو۔

اس انتخاب سے جسکو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے کئی فائدے تصوّر کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ

جو لوگ شعر کی سمجھ اور اُسکا عمدہ مذاق رکھتے ہیں؛ اُنکو بغیر اسکے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو۔ مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا مل جائیگا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بسبب اسکے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معنی حل کردیے گئے ہیں۔ مرزا کے خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل کرسکیں گے۔ اور دونو طبقوں کو معلوم ہو جائیگا کہ مرزا نے قوتِ متخیلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا؛ اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اُردو اور فارسی دونو زبانوں میں ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

الغرض یہ رسالہ دو حصّوں پر تقسیم کیا گیا ہے؛ پہلے حصّے میں مرزا کی زندگی کے واقعات۔ جہاں تک کہ معلوم ہوسکے۔ اور اُنکے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے۔ اِنھیں حالات کے ضمن میں اُنکی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں، اور اُنکے لطائف و نوادر جن سے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہر اور اُنکی امیجنیشن کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے اپنے موقع پر ذکر کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصّے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اُردو اور فارسی کا انتخاب؛ اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو؛ اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلّم الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کیا گیا ہے؛ خاتمۂ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور اُن کی طرزِ شاعری و انشا پردازی پر لکھا گیا ہے؛ جسکو ساری کتاب کا لُبِّ لباب سمجھنا چاہیے۔

اگرچہ مرزا کی لائف۔ جیسا کہ ہم آیندہ کسی موقع پر بیان کرینگے۔ اُن فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیوگرفی سے حاصل ہونے چاہئیں۔ لیکن اگر اِن فائدوں سے قطع نظر کیجائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہو۔ ہماری پژمردہ اور

دل مردہ سوسائٹی کے لیے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اسکے سوا ہر قوم میں عموماً، اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً، ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں جنکی ذات سے (اگرچہ قوم کو براہِ راست کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہنچا ہو) لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو؛ اور سلف کے ذخیرے میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا، اُنکے ورکس میں چھان بین کرنی، اور اُنکے نوادر افکار سے مستفید ہونا، قوم کے اُن فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے۔ جیسا کہ خود مرزا ایک جگہ لکھتے ہیں "دریغ کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتارِ مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیابِ شناسائی فرۂ ایزدی نگشتند؛ و ازیں نمایشہای نظر فروز - کہ، نظم و نثر بکار بردہ ام - سرگراں گذشتند۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز کتاب

نام

ولادت

خاندان

میرزا اسد اللہ خان **غالب** المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ؛ شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوے۔ مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال - جیسا کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا ظاہر کیا ہے - یہ ہے کہ اُنکے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے؛ اور اُن کا سلسلۂ نسب تورِ ابن فریدوں تک پہنچتا ہے - جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہو گئے، اور تورانیوں کا جاہ و جلال دنیا سے رخصت ہو گیا؛ تو ایک مدتِ دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی۔ مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی؛ کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا؛ اور کل مال و اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ بارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بختِ خفتہ نے پھر کروٹ بدلی؛

اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہوگئی۔ کئی سو برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم (یعنی ایشیائے کوچک) پر حکمراں رہے۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا؛ اور سلجوق کی اولاد جا بجا منتشر و پراگندہ ہوگئی۔ انھیں میں سے ترسم خاں نام ایک میرزادے نے سمرقند میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔ مرزا مہر نیمروز کے دیباچے میں لکھتے ہیں "از واپسیان ایں قافلہ نیائے من۔ کہ در قلمرو ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الراس وے بود۔ چوں سیل کہ از بالا بپستی آید از سمرقند بہند آمد" اور درفش کاویانی میں اسطرح لکھا ہے "بالجملہ سلجوقیاں بعد زوال دولت و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراء النہر پراگندہ شدند۔ ازاں جملہ سلطان زادہ ترسم خاں کہ ما از تخمۂ اوئیم سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیائے من از سمرقند بہندوستان آمد"

مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی؛ اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ اُس زمانے میں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوا دیا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کردیا۔ اُنکے کئی بیٹے تھے جنمیں سے دو کے نام معلوم ہیں: ایک مرزا کے باپ **عبد اللہ بیگ خاں** عرف میرزا دولھا اور دوسرے **نصر اللہ بیگ خاں**۔ عبد اللہ بیگ خاں کی شادی **خواجہ غلام حسین خاں** کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی؛ جو کہ سرکار[*] میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبد اللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی

[*] سرکار ملک کے اُس حصے کو کہتے تھے جو صوبے کی نسبت چھوٹا اور پرگنہ و محال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا تھا۔

تمام عمر سسرال میں بسر کی؛ اور اُن کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا عبد اللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے؛ ایک **مرزا اسد اللہ خاں**؛ اور دوسرے **میرزا یوسف خاں**۔ جو ایام شباب میں مجنون ہوگئے تھے اور اُسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔

مرزا کے والد عبد اللہ بیگ خاں۔ جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے۔ اوّل لکھنؤ میں جاکر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے؛ اور چند روز بعد وہاں سے حیدر آباد پہونچے؛ اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی؛ اور وہ واپس آگرے میں چلے آئے۔ یہاں آکر اُنھوں نے الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ نے ابھی اُنکو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے اُنھیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے۔ جو فوج اُس گڑھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی اُسکے ساتھ مرزا عبد اللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اُن کے گولی لگی اور وہیں اُنکا انتقال ہوگیا؛ اور راج گڈھ میں دفن ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے دو گانو سیر[*] حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دو نو لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کردیا؛ جو ایک مدت دراز تک جاری رہا۔ مرزا کے والد کی وفات کے بعد اُنکے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے اُنکو پرورش کیا۔

جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہوگئی، اور نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں

[*] مرزا نے جو قصیدہ راجہ شیودھیان سنگھ کی مدح میں لکھا ہے اسمیں لکھتے ہیں

در یکتائی شدہ ام چو کر حضور ÷ نگیں سخن ہرازم دریں فلیفہ خور ÷ دارم بگوش حلقۂ زیبادہ ہشت سال ÷ اکنوں کہ عمر شصت و سہ سال ست شمار ÷

باید شنید رزناہ میان بارگاہ ÷ باید شناخت تحفہ زیبراں آں دیار ÷ کاتی بود مشاہرہ شاہد عزور ہست ÷ در خاک راج گڈھ پدرم را بود مزار ÷

لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے؛ تو اُنھوں نے مرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کو، جن سے نواب موصوف کی ہمشیر منسوب تھیں۔ سرکاری فوج میں بعہدۂ رسالداری ملازم کرا دیا۔ اُن کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا۔ جو نواح آگرہ میں واقع ہیں۔ سرکار سے اُن کے نام پر مقرر ہوگئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے اُن کے نامزد رہے؛ اور اُنکی وفات کے بعد اُنکے وارثوں اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرا دیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب پنشن بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی تو پنشن پھر جاری ہو گئی؛ اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔ جب تک پنشن بند رہی مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا۔

اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا تھا؛ اسکے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں "میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھکو آگیا ہے؛ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رزاق ہے؛ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے"

مرزا نے اپنے علو خاندان پر جا بجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے چونکہ اُن میں سے بعض اشعار لطف سے خالی نہیں اسلیے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔ قطعہ

غالب از خاکِ پاک تورانیم　　لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے　　بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم+ از جماعۂ اتراک　　در تمامی ز ماہ دہ چندیم

+ ایبک ترکی لفظ ہے مرکب آے اور بک سے۔ آے چاند کو اور بک کامل اور بزرگ کو کہتے ہیں پس ایبک کے معنی ماہ تمام و بزرگ کے ہیں۔ اسی لئے مرزا نے کہا ہے اور "در تمامی ز ماہ دہ چندیم" ۱۲

فنِ آبائے ما کشاورزیست　　مرزبان زادۂ سمرقندیم
ورز معنی سخن گزاردۂ　　خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم　　عقل کل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہمنفسیم　　ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم　　بمعاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمے گرییم　　ہمہ بر روزگار می خندیم

قطعہ

ساقی! چو من پشنگی** و افراسیابیم　　دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم ست
میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار　　زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم ست

رباعی

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم*　　زاں رو بصفای دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر　　شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سنِ شعور تک آگرے ہی میں رہے؛ اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک اُنکی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اُس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اُسکے بعد ایک شخص پارسی نژاد جسکا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہُرمُزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے

** پشنگ افراسیاب کے باپ کا نام ہے ۱۲　* زادشم افراسیاب کے دادا اور پشنگ کے باپ کا نام ہے

عبد الصمد رکھا گیا ؛ غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا ؛ جو کہ دو برس تک مرزا پاس اوّل آگرے میں اور پھر دلّی میں مقیم رہا ؛ میرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سُنا گیا ہے کہ "مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمّذ نہیں ہے ؛ اور عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھکو لوگ بے اُستاد کہتے تھے اُن کا مُنھ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے"۔ مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جا بجا اُسکے تلمّذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اُسکو بلفظِ "تیمسار" جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے۔ مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبد الصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کُل دو برس اُسنے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُسکی صحبت میسر آئی ، اور کس قدر قلیل مدت اُسکی صحبت میں گذری ؛ تو عبد الصمد اور اُسکی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمّذ نہیں ہے۔

ایک جگہ مرزا نے مبدأ فیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے اور وہ شعر یہ ہے

انچہ در مبدأ فیاض بود آنِ من ست — گل جدا نا شدہ از شاخ بداماںِ من ست

ایک اور مقام پر اس سے بھی عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے ! وہ کہتے ہیں

باخذِ فیض ز مبدأ فزونم از اسلاف — کہ بودہ ام قدرے دیر تر دراں درگاہ

ظہورِ من بجہاں در ہزار و بست و دو نیست[*] — ظہورِ خسرو و سعدی بشش صد و پنجاہ

ملا عبد الصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اُسکی مادری زبان اور اُسکی قوم کی مذہبی زبان تھی۔ عربی زبان کا بھی۔ جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے۔ بہت بڑا فاضل تھا۔ اگرچہ مرزا کو اُسکی صحبت بہت کم میسر آئی ؛ مگر مرزا جیسے جوہر قابل کو صغر سن میں ایسے شفیق ، کامل ، اور جامع اللسانین اُستاد کا مل جانا اُن نوادر اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو اُس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا ؛ مگر اُسکے فیضِ صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابر ست ؛ و اگر حاصل نشود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر"۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی حُسنِ قابلیت اور حُسنِ استعداد نے مُلا عبد الصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ مُلا کے ایک خط میں جو اُسنے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا "اے عزیز چہ کسی ؟ کہ با ایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطرم گذری"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا اُسمیں ہرگز مضایقہ نہ کیا ہوگا اور جیسا کہ قاطع برہان اور درفشِ کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اُسنے تمام فارسی زبان کے مقدم اُصول اور گر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جنکو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ احسن تہ نشین کر دی تھیں۔

[*] دو نیست یعنی دو صد۔ اہل زبان اکثر دو کے لفظ کے ساتھ بجائے صد کے نیست کا لفظ استعمال کرتے ہیں ۱۲

چونکہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لئے اُنکے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا؛ مرزا کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی۔ اور۔ جیسا کہ مرزا نے ایک رقعہ میں اشارہ کیا ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں ۷۔ رجب ۱۲۲۵ ہجری۔ کو اُن کا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے اُن کی آمد و رفت دِلّی میں زیادہ ہو گئی۔ اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اور اخیر عمر تک دِلّی ہی میں رہے۔

مرزا کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھی۔ وہ منشی شیو نرائن رئیسِ آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزندِ دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار۔ تمکو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم؟ مجھسے سنو! تمہارے پردادا نواب نجف خاں میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی، اور گھر بیٹھے، تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولدی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر۔ خاں صاحب کے ساتھ ہیں؛ اور اُنھوں نے جو کیتھم گانو اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں؛ اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہمعمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھسے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی؛ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت؛ آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی؛ چونکہ گھر اُن کا بہت دُور نہ تھا اسواسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے۔ بس ہمارے اور اُنکے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر

اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جواَب لکھمی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگیں بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اُسکے ایک کھٹیا والی حویلی، اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی، اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی، اور اُس سے آگے بڑھکر ایک کٹڑا۔ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹڑا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا؛ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیشدست رہتا تھا اور وہ کٹڑوں کا کرایہ اُگاہکر جمع کرواتا تھا۔ بھائی تم سنو تو سہی! تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا۔ علاقے مول لیے تھے۔ اور زمینداره اپنا کر لیا تھا۔ وہ بارہ ہزار روپئے کی سرکار کی مالگذاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمہارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اسکا حال ازروے تفصیل جلد مجھکو لکھو" اِس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جسکی بدولت اُنکے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے مالگذار بن گئے تھے؛ اور مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے اَللّے تللّوں میں بسر ہوا تھا۔

اہلِ دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا اُن سے سُنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی۔ جبکہ راقم نے پہلی ہی بار اُن کو دیکھا ہے۔ حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلتِ خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا قد کشیدہ اور ہاتھ پانو زبردست تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نو وارد و تورانی معلوم ہوتے تھے۔

دلی میں مکان

دلی میں اُنکے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اِس تمام مدت میں انھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا۔ ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہا کیے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے رہے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اُکتایا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اُسکے قرب جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جسکی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے　　　یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

کتب مطالعہ

جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسیطرح مطالعے کے لیے بھی۔ باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گذری۔ کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لا دیا کرتا تھا؛ مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

سفر کلکتہ

ظاہرا مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اِسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے۔ کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اُس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور اُن کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد اُن کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے۔ جنمیں مرزا اور اُنکے بھائی بھی شریک تھے۔ جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروزپور جھرکہ پر محوّل کر دی تھی جبتک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی بھی ہو گئی۔

عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہو گیا؛ لاچار فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروزپور سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اُس قدر ہمکو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا؛ اِدھر قرضخواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا؛ اُدھر چھوٹے بھائی کو جنون ہو گیا؛ مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا؛ اُس کشمکش میں اُنکو اِسکے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہونچکر سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں۔ چنانچہ مرزا اُس حالت کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "ہنگامۂ دیوانگی برادر یک طرف، و غوغای دام خواہان یک سو؛ آشوبے پدید آمد کہ نفس راہ لب، و نگاہ روزنۂ چشم فراموش کرد؛ و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ بالبے از سخن دوختہ، و چشمے از خویش فرو بستہ، جہاں جہاں شکستگی؛ و عالم عالم خستگی باخود گرفتم؛ و از بیدادِ روزگار نالاں، و سینہ بردمِ تیغ مالاں بکلکتہ رسیدم"

غرضکہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جبکہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ کلکتے میں لوگوں نے اُنکی بہت خاطر و مدارات کی اور اُن کو کامیابی کی امید دلائی۔ اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جنکی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ اُنکے کلیات میں موجود ہے؛ وعدہ کیا کہ تمھارا حق ضرور تمکو ملے گا۔ کول برک صاحب جو اُس وقت دلی میں رزیڈنٹ تھے اُنھوں نے دلی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ اِن امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے؛ مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان میلکم

گورنربمبئی سے - جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے، اور اُنھیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں؛ مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ اُنھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جس قدر پنشن فیروزپور سے ملنی قرار پائی تھی اُسکی مفصل کیفیت - جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی - گورنمنٹ میں بھیجدی۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو اُنھوں نے ولایت میں اپیل کیا؛ مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

مرزا صاحب نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی تھیں؛ ایک تو یہی کہ اُنکے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سرکار نے مقرر کی ہے وہ آیندہ پوری ملا کرے۔ دوسری یہ کہ اب تک جس قدر کم پنشن ملتی رہی ہے اُسکی واصلات ابتدا سے آج تک ریاست فیروزپور سے دلوائی جائے۔ چونکہ پہلی درخواست نامنظور ہوئی تھی (اس لیے دوسری درخواست کیونکر منظور ہوتی) تیسری درخواست یہ تھی کہ کُل پنشن میں جو حصہ میرا قرار پائے وہ اور شرکا سے علیحدہ کردیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروزپور سے خزانۂ سرکار میں منتقل ہوجاے؛ تاکہ رئیس فیروزپور سے مانگنی نہ پڑے۔ (یہ دونو درخواستیں منظور ہوگئیں اور اُنکے موافق اخیر تک عملدرآمد رہا) پانچویں درخواست خطاب اور خلعت کی تھی۔ جہاں تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے مرزا کو نہیں ملا۔ لیکن گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹ سے اُن کو "خانصاحب بسیار مہربان دوستان" لکھا جاتا تھا۔ اور جب کبھی دلّی میں ویسراے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو اُنکو بھی مثل دیگر رؤسا و عمائدِ شہر کے بُلایا جاتا تھا۔ اور سات پارچہ کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالاے مروارید کے اُنکو برابر ملتا رہا۔ اور تمام لوکل حکّام اور افسر اُنسے رئیس زادوں کی طرح ملتے رہے۔

کلکتے کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسیکو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اہل ہند میں سواے خسرو دہلوی کے کوئی مسلّم الثبوت نہیں؛ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے" اسی لیے وہ قتیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے قتیل کا نام سُنکر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوالی سنگھ فریدآباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہل زبان کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کیے۔ اسپر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔ اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتے میں بہت تھے مگر چونکہ مرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت چزبز ہوتے تھے۔ اُنکے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔ اُنھوں نے تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ **بادِ مخالف** - جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور اُنکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور درد انگیز طریقے سے بیان کیے ہیں - لکھی۔ یہاں اُس مثنوی کے کچھ کچھ اشعار مختلف مقامات سے نقل کیے جاتے ہیں۔

اے تماشائیانِ بزمِ سخن — وے مسیحا دمانِ نادرہ فن

اے گرانمایگانِ عالمِ حرف — خوش نشینانِ ایں بساطِ شگرف

* مرزا قتیل نومسلم تھے: اسلام لانے سے پہلے اُن کا نام دلوالی سنگھ تھا، وہ فریدآباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں اُن کی نہایت قدر ہوئی ۱۲

اے سخن پروران کلکتہ   وے زبان آوران کلکتہ

ہر یکے صدر بزم بار گہے   شمع خلوت سراے کار گہے

ہر یکے پیش تاز قافلہ   ہر یکے کتخداے مرحلہ

اے بہ شغلِ وکالت آمادہ   دادِ غمخوارئِ جہاں دادہ

اے شگرفانِ عالم انصاف   بسفارت رسیدہ از اطراف

اے سخن را طراز جاں دادہ   صفحہ را ساز گلستاں دادہ

عطر بر مغزِ گیتی افشاناں   پہلوانانِ پہلوی داناں

اے گرامی فنانِ ریختہ گو   نغز دریاکشان عربدہ جو

اے رئیسان این سوادِ عظیم   وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم

ہمچو من آرمیدۂ این شہر   بہرِ کارے رسیدۂ این شہر

اسد اللہ بخت برگشتہ   در خم و پیچ بحث سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست   بے سخن۔ ریزہ چین خوانِ شماست

بہ تظلم رسیدہ است اینجا   باامید آرمیدہ است اینجا

آرمیدن دہید روزے چار   خستہ را بہ سایۂ دیوار

کار احباب ساختن رسمست   میہماں را نواختن رسمست

آں رہ و رسمِ کارسازی کو   شیوۂ میہماں نوازی کو

کیستم؟ دل شکستہ غمزدۂ   بیدلے خستہ ستم زدۂ

برق بیطاقتی بجاں زدۂ   آتشِ غم بخان و ماں زدۂ

از گداز نفس تباب و تبے   در بیابانِ یاس تشنہ لبے

خسِ طوفانیِ محیطِ بلا   سر بسر گردِ کاروانِ فنا

دردمندے جگر گداختۂ   از غم دہر زہرہ باختۂ

درِ آگاہیے فنا زدۂ   ہمہ بر خویش پشت پا زدۂ

چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر   کہ بدینجا رسیدہ ام آخر

بہ سیہ روز غربتم بینید   تیرہ شبہاے وحشتم بینید

اندہ دوریے وطن نگرید   غمِ ہجرانِ انجمن نگرید

نہ ہمیں نالہ و فغاں باہم   من و جاں آفریں کہ جاں بلبم

مویہ چوں موے کردہ است مرا   غصہ بہ خوے کردہ است مرا

ذوقِ شعر و سخن کجاست مرا   کے زبانِ سخن سراست مرا

دارم آرے ز ہرزہ لائی خویش   نوحہ بر خویش و بینوائیِ خویش

گردشِ روزگارِ خویشتنم   حیرتِ کار و بارِ خویشتنم

با من این خشم و کیں!! دریغ دریغ   من چناں تاں چنیں!! دریغ دریغ

بہ غریباں کجا رواست ستم   رحم اگر نیست خود چراست ستم

بندہ ام بندۂ مہربانان را   رمز فہمان و نکتہ دانان را

نہ زآویزشِ بیاں ترسم — من وایماں من گزاں ترسم

کہ پس از من بسالہائے دراز — بزباں ماند ایں حکایت باز

کہ سفیہے رسیدہ بود ایں جا — چند روز آرمیدہ بود ایں جا

با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت — زحمتے داد وراہِ خویش گرفت

شوخ چشمے و زشت خوئے بود — بیحیائے و ہرزہ گوئے بود

ہم سفیہانہ گفتگوئے داشت — ہم خراباتیانہ ہوئے داشت

برگ دنیا نہ سازِ دینش بود — ننگ دہلی و سرزمینش بود

آہ ازاں دم کہ بعد رفتنِ من — خونِ دہلی بود بگردنِ من

تا بُوم رنجِ دوستاں باشم — بردلِ انجمن گراں باشم

شاد گردند کز میاں بروم — آہ ازمن کہ من چناں بروم

خستہ و دستمند برگردم — دژم آیم نژند برگردم

بودہ اعم کس از شما نرسد — شوق را مژدۂ وفا نرسد

دوستاں را اگر زمن گلہ است — کہ خرامت خلافِ قافلہ است

می رویم از پئے قتیل ہمہ — ساختہ فرد را دلیل ہمہ

توازیں حلقہ چوں بدر زدۂ — گام بر جادۂ دگر زدۂ

اے تماشائیانِ نزرت نگاہ — ہاں بگوئید حسبۃً للہ

کہ چساں از غریں بپیچم سر؟ — آں بجادہ دمی بہ ہر سفر

دل دہد کز اسیر برگردم؟* — زاں نوائیں صفیر برگردم

دامن از کف کنم چگونہ رہا — طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح و روانِ معنی را — آں ظہوری جہانِ معنی را

آنکہ از سر فرازیِ قلمش — آسماں ساست پرچمِ علمش

طرزِ اندیشہ آفریدۂ اوست — درتنِ لفظ جاں دمیدۂ اوست

پشتِ معنی قوی زپہلویش — خامہ را فربہی زبازویش

طرزِ تحریر را نوی ازوے — صفحہ را تنگ مانوی ازوے

فتنۂ گفتگوے ایناںم — مستِ لائے سبوے ایناںم

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را — چہ شناسد قتیل و واقف را

لیک با اینہمہ۔ کہ ایں دارم — گنجِ معنی در آستیں دارم

دل و جانم فدائے احباب ست — شوق وقفِ رضائے احباب ست

میشوم خویش را بہ صلح دلیل — می سرایم نوائے مدحِ قتیل

تا نماند ز من بہ گر گلۂ — رسد از پیروانِ وے صلۂ

گفتن آئین ہوشیاری نیست — لیک دانستن اختیاری نیست

گرچہ ایں رانیش نخواہم گفت — سعدی ثانیش نخواہم گفت

* یعنی آیا دل اجازت میدہد کہ از سیر برگردم۔ اہلِ زبان کا محاورہ ہے کہ "دل دہد" بجائے "دل دستوری دہد" کے بولتے ہیں۔

نیک از من ہزار بار بہ است	از من ہیچو من ہزار بہ است
من کفِ خاک و او سپہر بلند	خاک را کے رسد بچرخ کمند
وصفِ او حدِ چون منے نبود	مہر در خوردِ روزنے نبود
مرحبا سازِ خوشبیانیِ او	حبذا شورِ نکتہ دانیِ او
نظمش آبِ حیات را ماند	در روانی فرات را ماند
نثرِ او نقشِ بالِ طاؤس ست	انتخابِ صراح و قاموس ست
پادشاہے کہ در قلمرو حرف	کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
خامہ ہندوی پارسی دانش	ہندیاں سر بخطِ فرمانش
ایں رقمہا کہ ریخت کلکِ خیال	بود سطرے ز نامۂ اعمال
از منِ نارسائے ہیچمداں	معذرت نامۂ ایست نزیِ یاراں
بو کہ آید ز عذر خواہیِ ما	رحم بر ما و بیگناہیِ ما
آشتی نامہ و داد پیام	ختم شد والسّلام والاکرام

جب مرزانے دلّی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا اُسوقت راہ میں ٹھیرنے کا قصد نہ تھا. مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں ؛ اس لیے کانپور پہنچ کر اُنکو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے . اُس زمانے میں نصیرالدین حیدر فرمانروا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے . اہلِ لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوانِ شائستہ

اُنکی تقریب کی گئی . مرزا سے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہوسکا ؛ مگر ایک مدحیہ نثر صنعتِ تعطیل میں - جو اُنکے مسودات میں موجود ہے - نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں ؛ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں ، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جاے . اسی وجہ سے مرزا - بغیر اسکے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں - وہاں سے کلکتے کو روانہ ہوگئے . مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ دلّی سے نصیرالدین حیدر کی شان میں لکھکر ایک دوست کے توسط سے گذرانا تھا . اور اُسپر پانچ ہزار روپیے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا . شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے ؛ تین ہزار روشن الدولہ کھاگئے ؛ اور دو ہزار متوسط کو دیکر کہا کہ اسمیں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو - مرزا صاحب نے یہ سُنکر پھر کچھ تحریک کی . مگر تین دن بعد یہ خبر پہونچی کہ نصیرالدین مرگئے . پھر واجد علیشاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی ؛ اور پانسو روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے مقرر ہوگئے . لیکن صرف دو برس گذرے تھے کہ ریاست ضبط ہوگئی ؛ اور وہ دفتر گاؤ خورد ہوگیا .

لکھنؤ کی ایک صحبت میں - جب کہ مرزا وہاں موجود تھے - ایک روز لکھنؤ اور دلّی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی . ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں اہلِ لکھنؤ آپ کو بولتے ہیں ؛ آپ کی رائے میں فصیح آپکو ہے یا اپنے تئیں ؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں ؛ مگر اسمیں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ مَیں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں ، اور میں اُسکے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض

کروں کہ میں تو آپ کو کتّے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں ؛ تو سخت مشکل واقع ہوگی ۔ میں تو اپنی نسبت
کہونگا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں ۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سُنکر پھڑک گئے ۔ مرزا کا
مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ آپ کو مخاطب کے لئے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے ؛ اگر متکلم
کے لئے بھی اسکا استعمال ہوگا تو بعض مواقع پر التباس واقع ہوگا ۔ اس مطلب کو اُنھوں نے
اس لطیف پیرایے میں بیان کیا ۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہلِ صحبت کے خوش کرنے کے لئے تھا ۔
ورنہ اہلِ دہلی بھی اکثر بجاے اپنے تئیں کے آپ کو بولتے ہیں ؛ اسمیں کچھ اہلِ لکھنؤ
کی خصوصیت نہیں ہے ۔

زبان کے متعلق مرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے ۔ دلّی میں رتھ کو بعضے مؤنث
اور بعض مذکّر بولتے ہیں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت ! رتھ مؤنث ہے یا مذکّر ؟
آپ نے کہا بھیّا ! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو
مذکّر سمجھو ۔

تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں ۔ جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا ۔
مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند ۔ جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہوگئے تھے ۔
مدرسین کے امتحان کے لئے دلّی میں آئے ۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرّس
کالج میں مقرر ہے ؛ اسی طرح ایک فارسی کا مدرّس مقرر کیا جائے ۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خاں
اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا ۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا ۔ مرزا پالکی میں سوار ہوکر صاحب
سکرٹری کے ڈیرے پر پہونچے ۔ صاحب کو اطلاع ہوئی ؛ انھوں نے فوراً بلالیا ۔ مگر یہ پالکی

سے اُترکر اس انتظار میں ٹھیرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری اُنکے لینے کو آئینگے ؛
جب بہت دیر ہوگئی ، اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے ؛ وہ خود باہر چلے آئے
اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں تشریف لاوینگے تو آپ کا اُسی طرح استقبال کیا جائیگا
لیکن اسوقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا ۔ مرزا صاحب نے
کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز
میں بھی فرق آئے ۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں ۔ مرزا صاحب نے کہا مجکو اِس
خدمت سے معاف رکھا جائے ؛ اور یہ کہکر چلے آئے ۔

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی ۔ اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ
بازی بدکر کھیلا کرتے تھے ۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ ہجری میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گذرا ۔
مرزا نے خود اس واقعہ کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم اس مقام پر
لکھتے ہیں " کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف ؛ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں ۔ باوجودیکہ
مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے ؛ میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر
کردیا ۔ سشن جج ۔ باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھسے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور
اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا ۔ اُسنے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا ۔ صدر میں اپیل کیا گیا
مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا ۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گذرگئی تو مجسٹریٹ
کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکّام صدر نے ایسی
رپورٹ بھیجنے پر اُسکی بہت تعریف کی ۔ سُنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور

میری خاکساری اور آزادہ روی سے اُسکو مطلع کیا؛ یہاں تک کہ اُسنے خودبخود میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی۔ اگرچہ میں - اِس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جاسکتا - جو کچھ گذرا اُسکے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اُسپر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں؛ اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے؛ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئیگا کہ درماندگی کی قید سے جو اِس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اِسکے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھپر گذرا اور یہ ہے جسکا میں آرزومند ہوں،،

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گذرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو انکو قیدخانے میں گذرے اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی؛ وہ بالکل قیدخانے میں اُسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے۔ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسبِ دلخواہ گھر سے اُنکو پہونچتی تھیں۔ اُنکے دوست اُن سے ملنے جاتے تھے۔ اور وہ صرف بطور نظربندوں کے جیلخانے کے ایک علحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ مگر چونکہ اُسوقت تک شہر کے شرفا و اعیان کے ساتھ کبھی اِس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اِس لیے وہ اسکو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو ترکیب بند اُنھوں نے قیدخانے میں لکھا تھا اُسمیں کہتے ہیں

رانز دانا غم رسوائی جاوید بلاست	بہر آزار غم از قیدِ فرنگم نبود
جورِ اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن	طعنِ احباب کم از زخم حسنگم نبود

نواب مصطفٰے خاں مرحوم نے اُس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا۔ اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر اُنکی غمخواری اور ہر طرح کی خبرگیری میں مصروف رہے۔ چنانچہ اُسی ترکیب بند میں نواب مرحوم کی نسبت کہتے ہیں۔

خود چرا خوں خورم از غم کہ بغمخواری من	رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے	پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفٰے خاں - کہ دریں واقعہ غمخوارِ منست

گر بمیرم چہ غم از مرگ - عزادارِ منست

حاشیہ

جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے* صاحب کے مکان میں آکر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے؛ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ مرزا نے کہا "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؛ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"

مرزا نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسبِ حال لکھکر دوستوں کو بھیجا تھا۔ اِس نظم میں کُل سات بند اور ہر بند میں بارہ بارہ شعر ہیں۔ مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیاتِ فارسی میں اِس نظم کو چھپنے نہیں دیا تھا؛ مگر مرزا صاحب نے مرنے سے کسی قدر پہلے اپنی جدید نظم کا ایک مجموعہ موسوم بہ سبدچین شائع کیا تھا؛ اُسمیں اِس ترکیب بند کو بھی شامل کردیا تھا۔ لیکن سبدچین کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی؛ اِس لئے یہ ترکیب بند بہت کم لوگوں کی نظر سے گذرا ہے۔ چونکہ

* حضرت محمد نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب بہادر شاہ مرحوم کے پیر اور مولانا فخرالدین قدس سرہٗ کے پوتے تھے۔ مرزا مدت تک اِن کے مکان میں رہے ہیں۔ وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور اُنھیں کی تقریب سے قلعے میں تعلق پیدا ہوا تھا ۱۲

یہ ترکیب بند مرزا کی عمدہ ترین حالیہ نظموں میں سے ہے اِسواسطے اُسکے مختلف بندوں میں سے کچھ کچھ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

بند اول

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم — غمِ دل پردہ دری کرد۔ فغاں ساز کنم

بہ نوائے کہ زمضراب چکاند خوناب — خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم

چوں سرایم سخن انصاف زمجرم خواہم — چوں نویسم غزل اندیشہ زغمّاز کنم

یارِ دیرینہ! قدم رنجہ مفرما کاینجا — آں نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم

اہلِ زنداں لبِ مہر و چشمِ خودم جا دادند — تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

ہلہ دزدانِ گرفتار! وفا نیست بشہر — خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

بند دوم

پاسباناں بہم آئید کہ من مے آیم — درِ زنداں بکشائید کہ من مے آیم

ہر کہ دیدے بدرِ خویش سپاسم گفتے — خیر مقدم بسرائید کہ من مے آیم

جادہ نشناسم و ز انبوہِ تماشی ترسم — راہم از دور نمائید کہ من مے آیم

رہروِ جادۂ تسلیم درشتی نکند — سخت گیرندہ چرائید کہ من مے آیم

ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید — بخت خود را بستائید کہ من مے آیم

تا بہ دروازۂ زنداں پئے آوردنِ من — قدمے رنجہ نمائید کہ من مے آیم

چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من ست — بہرہ از من بربائید کہ من مے آیم

بند چہارم

آنچہ فرداست ہم امروز درآمد گوئی — آفتاب از جہتِ قبلہ برآمد گوئی

دل دو دستے کہ مرا بود فرد ماند ز کار — شب و روزیکہ مرا بود سرآمد گوئی

بہرۂ اہلِ جہاں چوں زجہاں درد و غم ست — بہرۂ من زجہاں بیشتر آمد گوئی

خستن و بستنِ من چند عسس نیست - برو — برمن اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی

ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع — خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی

چرخ یک مردِ گرانمایہ بزنداں خواہد — یوسف از قیدِ زلیخا بدر آمد گوئی

ہمدماں! درد لم از دیدہ نہانید ہمہ — غالبِ غمزدہ را روح و روانید ہمہ

للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ — للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ

من بخوں خفتہ و بینم ہمہ بینید ہمہ — من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ

درمیاں ضابطۂ مہر و وفائے بود ست — من بریم کہ ہر آئینہ برآنید ہمہ

روزے از مہر نگفتید فلانی چوں ست — بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ

چارۂ گر نتواں کرد دعائے کافی ست — دل اگر نیست خداوند زبانید ہمہ

ہفت بند ست کہ در بند رقم ساختہ ام — بنویسید و بہ بینید و بخوانید ہمہ

آں نہ باشم کہ بہر بزم زمن یاد آرید
دارم امید کہ در بزمِ سخن یاد آرید

سنہ ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اور چھہ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید کے - دربار عام میں عنایت فرمایا اور خاندانِ تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا۔ اور یہ قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کرکے مرزا کے حوالے کیا کریں؛

اور مرزا اُن تمام مطالب کو اپنی طرزِ خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں۔ اور کتاب دو حصّوں پر تقسیم کی جائے۔ پہلے حصّے میں کچھ مختصر حال ابتداے آفرینش سے صاحبقران تیمور گورکاں تک، اور کسی قدر مفصّل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے اخیر زمانے تک بیان کئے جائیں۔ اور دوسرے حصّے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے تک تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کئے جائیں۔ مرزا نے تمام کتاب کا نام **پرتوستاں** اور اُسکے پہلے حصّے کا نام **مہرِ نیمروز** اور دوسرے حصّے کا نام **ماہِ نیم ماہ** تجویز کیا تھا۔ اُن کو اپنی دو ترکیبوں پر ناز تھا؛ ایک ماہِ نیم ماہ اور دوسرے رستخیزِ بیجا[†]۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہِ چہاردہ اور ماہِ دو ہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے؛ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ماہِ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا۔ یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دوسرا حصّہ یعنی ماہِ نیم ماہ۔ بالکل نہیں لکھا گیا۔ مہرِ نیمروز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لئے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصّہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہوگیا اور اُس حصّے کا صرف نام ہی نام رہگیا۔

حیدرآباد سے ایک صاحب نے مرزا سے ماہِ نیم ماہ کو طلب کیا تھا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "ماہِ نیم ماہ اسمیست کہ مسمّی ندارد۔ چوں از سرنوشت گردن نتواں پیچید سرگذشت باز گویم ہرگاہ یک نیمہ از پرتوستان انجام یافت، و مہرِ نیمروز نام یافت، لختے درنگ ورزیدہ شد؛ تا نفس راست کردہ آید۔ ناگاہ کار فرمارا روز فرو رفت، و روزگار سر آمد؛ و دولتِ دیرینۂ ترکمانانِ قراچاریہ سپری گشت۔ ماہِ نیم ماہ بچوں

[†] رستخیزِ بیجا غدر کی تاریخ کا مادّہ ہے۔ اس میں رستخیز کے اعداد یعنی ۱۲۷۷ میں سے جا کے عدد یعنی (۴) کا تخرجہ کیا ہے ۱۲

ماہ بست و ہشت شبہ ناپدیدار، و نامش بعنوانِ بے نشانی در مہرِ نیمروز آشکار۔ ماند"

سنہ ۱۲۷۱ ہجری میں۔ جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوگیا۔ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہوگئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے۔ ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوانِ عام میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھیر جاؤ؛ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اُسکو کھولا تو اُسمیں سے آٹھ نو پرچے۔ جن پر ایک ایک دو دو مصرع لکھا ہوا تھا؛ نکالے۔ اور اُسی وقت دوات قلم منگوا کر اُن مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں؛ اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھکر چوبدار کے حوالے کیں۔ ناظر مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں اُن کو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشّاق اُستاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کردے جب چوبدار غزلیں لیکر چلا گیا تو مجھسے کہا کہ حضور کی کبھی کبھی کی فرمائشوں سے آج مدّت کے بعد سبکدوشی ہوئی ہے اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرزِ خاص میں لکھتے تھے۔ نظم ہو یا نثر۔ اُسکو بڑی کاوش اور جانکاہی سے سرانجام کرتے تھے؛ چنانچہ خود اُنھوں نے جابجا اسکی تصریح کی ہے؛ مگر جب کبھی اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہوتی تھی اُس وقت اُن کو فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا۔

سنہ ۱۸۶۱ع میں۔ جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے ہیں۔ مولوی محمد عالم مرحوم نے۔ جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے۔ نواب صاحب سے بیان کیا کہ۔ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک مجلس میں۔ جہاں مرزا بھی موجود تھے، اور میں بھی حاضر تھا۔ شعرا کا ذکر

ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا "فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے"، اسپر بات بڑھی۔ اُس شخص نے کہا فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا۔ اُسنے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہکر پڑھا تھا۔ مرزا بولے "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں"، مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اِس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کرکے پڑھ دیا۔ جو کہ اُنکے دیوانِ ریختہ میں موجود ہے۔ اور جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچھا کہیے

اولاد

مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے در پے ہوئے؛ مگر کوئی زندہ نہیں رہا اس لئے ایک مدت سے وہ اور اُنکی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر غدر سے چند سال پہلے جبکہ اُنکی بی بی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوگیا، اور اُنکے دو نو بچے ایک باقر علیخاں اور دوسرے حسین علیخاں صغیر سن رہگئے۔ تو مرزا اور اُنکی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علیخاں کو جو اُس وقت بہت کم عمر تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ مرزا حسین علیخاں کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھکر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ نازبرداری کرتے تھے۔

جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا تو حسین علیخاں کے بڑے بھائی باقر علیخاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ دونو خوش فکر اور راہل اور نیکخو اور نہایت شریف مزاج تھے

افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونو تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہوگئے۔

زین العابدین خاں عارف سے مرزا صاحب کو غایت درجے کا تعلق تھا۔ کچھ تو قرابت کے سبب، اور زیادہ تر اِس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے، اور باوجود پُرگوئی کے نہایت خوش گو تھے؛ اُنکو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی لئے جب وہ جوان عمر میں فوت ہوگئے تو مرزا اور اُنکی بی بی پر سخت حادثہ گذرا۔ مرزا نے اُنکے مرنے پر ایک غزل بطور نوحہ کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ چنانچہ اُسکے چند شعر ہم اِس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں؟ اب ہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملینگے — کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھسے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش! — کرنا تھا جواں مرگ! گذارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب! — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے۔ جونہیں بغاوت کا فتنہ اُٹھا اُنھوں نے گھر کا دروازہ بند کرلیا، اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے۔

اگرچہ فتح دہلی کے بعد مہاراج پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور انکے ہمسایوں کے مکان پر۔ جسمیں ایک مرزا بھی تھے۔ حفاظت کے لئے پہرہ بیٹھ گیا تھا؛ اِس لئے وہ فتحمند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے؛ مگر پھر بھی اُنکو طرح طرح کی کلفتیں اُٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہوگئے تھے، اور اخیر دم تک اُسی حالت میں رہے؛ جب مرزا نے دلی میں سکونت اختیار کی تو اُنکو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے اُنکا مکان تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز۔ کہ دونو عمر رسیدہ تھے۔ اُنکے پاس رہتے تھے۔ جب دلی فتح ہوگئی، اور شہر اہلِ دہلی سے خالی ہوگیا، اور رستے بند ہوگئے؛ اُس وقت مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے سونے مرنے اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی۔ ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاہی گھس آئے تھے، اور جو کچھ اسباب ملا۔ لے گئے۔ پھر ایک دن وہی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہکر آج آدھی رات گذرے مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت نہ کفن کے لئے کپڑا بازار میں مِل سکتا تھا؛ نہ غسال اور گورکن کا کہیں پتا تھا، نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا؛ مگر مرزا کے ہمسایوں نے اُنکی بڑی مدد کی۔ پٹیالہ کی فوج کے ایک سپاہی کو۔ جو حفاظت کے لئے تعینات تھا۔ اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا؛ اور مرزا صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لیکر مرزا یوسف کے مکان پر پہونچے۔ اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے مسجد کے صحن میں۔ جو مکان کے قریب تھی۔ دفن کر دیا۔ مرزا نے دستنبو میں اس مقام پر یہ اشعار لکھے ہیں۔

دریغ آں کہ اندر رہِ ننگ سہ بیست* — سہ دہ شاد وسی سال ناشاد زیست

بہ خاک بالیں ز خشتش نہ بود — بجز خاک در سرنوشتش نہ بود

خدایا بریں مردہ بخشائشے — کہ نادیدہ در زیست آسائشے

سروشے بہ دلجوئے او فرست — روانش بجاوید مینو فرست

اور بھائی کے مرنے کی تاریخ اِس طرح لکھی ہے،

ز سالِ مرگ ستمدیدہ میرزا یوسف — کہ زیستے بجہاں در۔ ز خویش بیگانہ

یکے در انجمن از من ہمے پژوہش کرد — کشیدم آہے وگفتم دریغ دیوانہ

اسمیں لفظ آہے کا تخرجہ دریغ دیوانہ میں سے کیا ہے۔

ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے۔ راجہ کے سپاہیوں نے ہر چند روکا مگر اُنھوں نے کچھ التفات نہیں کیا۔ مرزا دستنبو میں لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا؛ مگر مجھے، اور دونو بچوں کو، اور دو تین نوکروں کو، مع چند ہمسایوں کے کرنل برون کے روبرو۔ جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے۔ لیگئے۔ کرنل برون نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا حال پوچھا اور ہمکو رخصت کردیا۔ سنا ہے کہ مرزا جب کرنل برون کے روبرو گئے تو اُسوقت کلاہ پاپاخ اُنکے سر پر تھی۔ اُنھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھکر پوچھا کہ وِل تم مسلمان؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنیل نے کہا اِسکا کیا مطلب؟ مرزا نے کہا "شراب پیتا ہوں؛ سُوَر نہیں کھاتا"، کرنیل یہ سُنکر ہنسنے لگا۔ پھر مرزا نے وزیر ہند

* سہ بیست یعنی ساٹھ۔ دوسرے مصرع میں سہ دہ سے مراد تیس ہے۔

کی چٹھی - جو ملکۂ معظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں آئی تھی - دکھائی ۔ کرنیل نے کہا تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے ؟ مرزا نے کہا "میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے ؛ میں کیونکر حاضر ہوتا ؟ کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور اُنکے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

اِس مقام پر مرزا اپنی کتاب دستنبو میں لکھتے ہیں کہ "سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں ہے ۔ میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قیدِ کیش و ملت سے آزاد ہوں اِسی طرح بدنامی اور رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں - میری مدت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرنچ† کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا، اور اگر وہ نہ ملتی تھی تو مجھکو نیند نہ آتی تھی ۔ اگرچہ مہیش داس، خدا دوست، خدا شناس، دریا دل ہندوستانی شراب - جو رنگ میں فرنچ سے مشابہ، اور بو میں اُس سے بہتر تھی - مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جاں بر نہ ہوتا ۔ اِسکے بعد یہ رباعی لکھی ہے

رباعی

اندیدہ دلم وایہ زہر درمی جست | از بادۂ ناب یک دو ساغر می جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بمن | آبے کہ برائے خود سکندر می جست [یعنی آبِ حیواں]

چونکہ اُس وقت مسلمانوں سے شہر خالی ہو گیا تھا مرزا کے ہندو دوستوں کے سوا - جو اُنکے پاس برابر آتے رہتے تھے، اور ہر طرح سے اُنکی غمخواری کرتے تھے - کوئی اُن کا غمخوار نہیں رہا تھا ۔ مرزا کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے ؛ سرکاری پنشن، اور قلعے کی تنخواہ ؛ سو یہ دونو ذریعے مسدود

† فرنچ وہ چیز جو فرانس سے منسوب ہو اور یہاں اُس سے فرانس کی شراب مراد ہے ۔

ہو گئے تھے ۔ شہر کے تمام مسلمان عمائد - جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے - اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے ۔ اِسکے سوا گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا کوئی اور قیمتی چیز تھی ؛ جب شہر لٹنے لگا - تو وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لئے بھیج دیا ؛ جہاں سے فتحمند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا ۔ مگر مرزا نے اِس تنگی و عسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا، اور جو حالت اُن پر اور اُنکے متعلقین پر خوش و ناخوش گذری اُسمیں نوکر بھی برابر شریک رہے ۔ نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اِس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار و ناچار اُنکی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی ۔ مرزا لکھتے ہیں کہ "اِس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا، اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا" اِسکے بعد کتاب کو اِس طرح ختم کرتے ہیں کہ "اِس بازیچۂ اطفال - یعنی کتاب دستنبو - کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کیجائے ؛ جو حالت کہ اِس وقت درپیش ہے ظاہر ہے ؛ کہ اُسکا انجام یا موت ہے، یا بھیک مانگنا ۔ پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے، اور دوسری صورت میں نتیجہ اِسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؛ کہ کسی دکان سے دھتکارے گئے، اور کسی دروازے سے کوڑی پیسا کچھ مل گیا ۔ پس اپنی ذلت و رسوائی کے سوا اب اُسمیں لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا ۔ قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا، اور نہ ملی تو تو کام ہی تمام ہے ۔ مشکل یہ ہے کہ دونو صورتوں میں - چونکہ اِس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی - ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جا کر بسرام کرنا پڑیگا"

غدر کے بعد دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا ۔ مگر دو برس بعد نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیسِ رامپور

نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لئے مرزا کے واسطے مقرر کردیا۔ جو نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا۔ اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بری ثابت ہوئے سرکاری پنشن بھی جاری ہوگئی۔

جب نواب یوسف علیخاں کا انتقال ہوگیا اور مرزا تعزیت کے لئے رام پور گئے چند روز بعد نواب کلب علیخاں مرحوم کا نواب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا آنکی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے چلتے وقت نوابصاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا حضرت. خدانے تو مجھے آپکے سپرد کیا ہے آپ پھر اُلٹا مجھکو خدا کے سپرد کرتے ہیں"

جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے، اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا؛ اس وقت سوا اسکے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں، اور کچھ لکھ پڑھکر اپنا غم غلط کریں۔ اور دل بہلائیں مرزا پاس اس وقت سوائے برہانِ قاطع اور دساتیر کے کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ برہان کو اُٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی۔ ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا۔ شعرا نے جو الفاظ بطور مجاز و کنایہ کے استعمال کئے ہیں اُن کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا۔ طریقۂ بیان اکثر بھونڈا اور اصولِ لغت نگاری کے خلاف پایا۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جسکے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابلِ اعتراض نظر آئے اُنکو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی۔ جسکا نام قاطع برہان رکھا گیا، اور ۱۸۶۱ء میں چھپ کر شائع ہوگئی۔ پھر مرزا نے ۱۸۶۵ء میں باضافۂ دیگر مضامین و فوائد اُسکو دوسری بار چھپوایا اور اُسکا

نام درفشِ کاویانی رکھا۔

یہاں دو چار مثالیں اُن الفاظ کی دینی مناسب معلوم ہوتی ہیں جن پر مرزا نے صاحبِ برہان کا تخطیہ کیا ہے۔ مثلاً صاحبِ برہان نے عنبر ارزاں کے معنی گیسوے رسول مقبول کے لکھے ہیں؛ اور پھر کہتا ہے کہ اُسکو عنبر لرزاں بھی کہتے ہیں۔ مرزا صاحبِ برہان کی غلطی کا منشا یہ بتاتے ہیں کہ اُسنے نظامی کا یہ شعر دیکھا ہے جو نعت میں ہے "بوے کزاں عنبر لرزاں دہی * گر بدو عالم دہی ارزاں دہی" پس عنبر لرزاں میں اِستعارہ کو اصلی لغت قرار دیا اور دوسرے مصرع میں ارزاں کے موقع اور محل کو بالکل نہیں سمجھا اور آنحضرت کی زلفِ عنبر بوچو دو توجہان کے بدلے میں بھی ارزاں ہو اُسکا نام عنبر ارزاں رکھدیا یا مثلاً برہان میں لکھا ہے "قافلہ شد بمعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت کہ کنایہ از فوت شدن پیغمبر باشد" اوّل تو قافلہ شد کو ایک لغت قرار دینا ہی بے معنی ہے پھر اُسکے معنی قافلہ سالار رفت کہنا اور قافلہ سالار کے جانے سے وفات سرورِ کائنات مراد لینا غلط در غلط اور خبط در خبط ہے مرزا غلطی کا منشا مولانا نظامی کے اِس شعر کو بتاتے ہیں "قافلہ شد واپسیِ ما ببیں * اے کسِ ما بیکسیِ ما ببیں * یہ شعر مخزنِ اسرار کی مناجات میں واقع ہوا ہے مگر مرزا نے سہو سے اسکو جامی کی طرف منسوب کیا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دوست اور رفیق اور ساتھی سب چل دیے اب تیرے سوا کوئی ہمارا یار و مددگار نہیں ہے یا مثلاً صاحبِ برہاں لکھتا ہے کہ "شش ضرب نتیجہ خوب کنایہ از گوہر و زر باشد و کنایہ از شکر و عسل و اقسامِ میوہ ہا ہم ہست و بحذفِ ضرب ہم بنظر آمدہ کہ شش نتیجہ خوب باشد" مرزا نے جو اسکا خاکا اُڑایا ہے وہ طول طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ اِس مرکب اور بے معنی جملے کو لغت قرار دینا صاحبِ برہاں ہی کا کام ہے اور اِس طرح کے صدہا الفاظ ہیں جن پر مرزا نے گرفت کی ہے اور طرح طرح

لغزشیں اور بے ربطیاں ہیں جو بغیر اسکے کہ درفش کاویانی کو اوّل سے آخر تک دیکھا جائے ذہن نشیں نہیں ہو سکتیں۔

جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اُس وقت اُنکے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی، اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیقِ لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ پس جو کچھ اُنھوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا۔ باایںہمہ چند مقامات کے سوا جہاں فی الواقع مرزا سے لغزش ہوئی ہے، اور بعض غلطیوں کا اُنھوں نے خود بھی اقرار کیا ہے۔ اُنکے تمام ایراد واجبی معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ درفشِ کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلائے کلکتہ کی مصححہ و مطبوعہ برہان مرزا کے پیشِ نظر تھی۔

قاطع برہان کی مخالفت

اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ ایک قاطع برہان کے جواب میں مُحرقِ قاطع، قاطع قاطع، مؤید برہان، ساطع برہان وغیرہ چند رسالے لکھے گئے۔

مخالفت کی وجہ

مخالفت کی وجہ ظاہر ہے۔ تقلید نہ صرف امورِ مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم، اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے؛ اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سَو دو سَو برس پہلے لکھی جا چکی ہے وہ وحیِ مُنزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات برہانِ قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجبی ہوتے؛ ممکن نہ تھا کہ اُنکی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کیجاتی۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہ شوخیِ طبع کے صاحبِ برہان کا جا بجا خاکہ اُڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظِ ناملائم بھی غیظ و غضب میں اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں زیادہ تر اس وجہ سے

مخالفت ہوئی؛ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا صاحبِ برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کے پُرانے تعلیم یافتہ جو آجکل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں۔ اُنکے لئے کُنجِ خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اسکے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا ردّ لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔

جو رسالے قاطع برہان کے جواب میں لکھے گئے ہیں جب اُن کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے اعتراضوں کے اکثر جواب بہت صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک مجیب برہان کی تائید اسطرح کرتا ہے کہ جس طرح صاحبِ برہان نے لغت کی تحقیق کی ہے؛ اسی طرح فرہنگ جہانگیری، یا فرہنگ رشیدی، یا سراج اللغات، یا مؤید الفضلا، یا ہفت قلزم، یا کسی اور فرہنگ میں لکھا ہے۔ اور اس سے بادی النظر میں صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے۔ مگر جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، اور جو فرہنگ سب سے پہلے لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اُسیکا تتبع کیا ہے؛ تو کسی مجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔

ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں ہدایت نے ۱۲۸۸ھ میں یعنی مرزا کی وفات سے چار برس بعد فارسی لغت کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ جو فرہنگِ ناصری کے نام سے موسوم ہے، اور مرزا کی وفات سے دس بارہ برس بعد ہندوستان میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی لغات کے متعلق جو کچھ اُسنے لکھا ہے وہ بہرحال اُن فرہنگ نگاروں کی تحقیقات سے۔ جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھکر فارسی لغت کی کتابیں لکھی ہیں۔ زیادہ معتبر اور زیادہ اطمینان کے لائق ہوگا۔ اُسنے اپنی فرہنگ کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی، اور برہان قاطع

تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے اور اُسکے بعد ایک باب میں صرف برہانِ قاطع کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ہے ایک پہاڑ کے اوپر، یا غرناطہ ایک صوبہ ہے ہندوستان کا، یا چکاک کے تین معنی لکھے ہیں؛ پیشانی، قبالہ نویس، اور مہرکن (اور یہ تینوں معنی غلط لکھے ہیں) یا کروخ جو ایک قریہ ہے مضافات ہرات میں اُسکو برہان میں لکھا ہے۔ قریہ ایست از قرائے عالم۔ یہاں ازراہِ طنز صاحبِ فرہنگِ ناصری لکھتا ہے "فی الحقیقت تحقیقے دقیق فرمودہ است" اسی طرح بہت سی غلطیاں صاحبِ برہان کی اس باب میں ظاہر کی ہیں۔ اور اِسکے سوا اپنی تمام فرہنگ میں جا بجا اُسکا تخطیہ کیا ہے۔

جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے ہیں؛ اُنکی بھی جا بجا فرہنگِ ناصری سے تائید ہوتی ہے۔ ازاں جملہ لفظ آجیپں، استخر و اصطخر، جمدر، باختر، راوش و زاوش، کارکیا، ویژہ و اویژہ، اور اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگِ ناصری میں مرزا کے بیان کے مطابق پائی جاتی ہے۔ اِسکے سوا برہان کے بیان کو جہاں مرزا نے بے معنی اور مہمل بتایا ہے؛ رضا قلی خاں بھی اُسکو مہمل بتاتا ہے۔ مثلاً لفظ انجلک کی تفسیر میں صاحبِ برہان لکھتا ہے "ہر چند فراشِ خیال جاروب سنبل بر جل خرسک ریش زند از پوست آں پاک تواند" مرزا اِسکی نسبت لکھتے ہیں "فقرۂ اخیر مگر کلامِ دیو ست؛ ہرگاہ خوبیِ تحقیق چناں و حسنِ عبارت چنیں باشد مقصودِ اصلی کہ معلوم کردن مجہولات ست از برہانِ قاطع چگونہ حاصل تواں کرد" رضا قلی ازراہ طنز اسی فقرے پر یہ لکھتا ہے "دریں مقام ایں انشائے بدیع و بیانِ بلیغ زادۂ طبع لطیف ایشاں بودہ۔ برہانِ ذوقِ سلیم و سلیقۂ مستقیم صاحبِ برہاں خود ہمیں عبارات بس است تا از یں سپس

از تو چہ آید" اسی طرح برہان کی اکثر مہمل عبارتیں نقل کر کے اُسپر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ "در ولایتِ ہند کہ نہ ترکی دانند و نہ پارسی ضبط و تصحیح لغاتِ فارسی کے توانند" ایک جگہ صاحبِ برہانِ جامع (جو کہ ایرانی ہے) کا قول برہانِ قاطع کے باب میں نقل کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "برہانِ قاطع میں لغات بغیر سند اور شواہد کے ذکر کئے گئے ہیں؛ اُنپر اعتبار نکرنا چاہیے۔ اسمیں کنایات کو بھی علٰحدہ لغت قرار دیتا ہے، اور سُریانی و عبرانی و ترکی و ژند و پاژند کے غیر مستعمل لغات کے بیان میں، اور ایک ایک لغت کو بار بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں؛ تطویلِ لاطائل کرتا ہے" اسکے بعد رضا قلی، صاحبِ برہانِ جامع کی تصدیق، اور اُسکے ساتھ اتفاق رائے، کرتا ہے۔ چونکہ مرزا کی لائف میں یہ بیان بے مزہ معلوم ہوگا اس لئے ہم اِس سے قطع نظر کرتے ہیں جس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو وہ فرہنگِ ناصری کو خود ملاحظہ کرے۔

اگرچہ مرزا نے قاطع برہاں میں بعض اعتراض غلط کئے ہیں؛ خصوصاً لفظِ افسوس کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے۔ کہ اُسکو لفظ عربی الاصل ماخوذ از اسَف قرار دیا ہے۔ اور اِس غلطی کا اُنھوں نے آخرکار خود بھی اعتراف کیا ہے۔ اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے، اور ممکن ہے کہ اِسکے سوا اور بھی کہیں کہیں اُن سے غلطی ہوئی ہو؛ لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع برہاں کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتیِ طبع اور ذوقِ صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے اور۔ جیسا کہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "فارسی زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر" فی الواقع فارسی زبان سے اُن کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ جو رائے کہ اُنھوں نے محض اپنے وجدانِ سلیم کی ہدایت سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے

محققوں نے اُسکی نسبت ظاہر کی ہے، اور جو غلطیاں اور بے ربطیاں مرزانے برہان میں بتائی ہیں وہ اور اُنکے سوا اور بے شمار غلطیاں صاحب فرہنگ ناصری نے اُسمیں نشان دی ہیں۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتی طبع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

مرزانے قاطع برہان کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں؛ اُنمیں سے فائدۂ اول کا ماحصل یہ ہے کہ "ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خود نمائی کی بو آتی ہے اس لئے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہو کر اور ہندوستانیوں کو مسلّم نہ جاننا اور خود زباندانی کا دعوے کرنا بے معنی ہے۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توران سے آیا تھا، اور میرا باپ دلّی میں پیدا ہوا، اور میں آگرے میں۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہلِ زباں سمجھتا ہوں میں بلاشبہ زباندان ہوں اور میری زباندانی اولاً خداداد سلامتی طبع کی بدولت ہے؛ جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلّی نہیں پاتی۔ دوسرے اِس وجہ سے ہے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرۃً مناسب واقع ہوئی ہے۔ تیسرے مولانا عبدالصمد کے فیضِ صحبت سے جو مجھکو دو برس تک برابر حاصل رہا۔ چودہ برس کی عمر میں میں نے اُس سے تربیت پائی؛ اور باوٗن برس مشقِ سخن کی۔ اب کہ مجھکو چھیاسٹھواں سال ہے۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں۔ اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ کہ ان باوٗن برسوں میں اُسنے کس قدر معنی کے دروازے مجھپر کھولے ہیں؛ اور میری فکر کو کس درجہ کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا؛ اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شانِ ایزدی کی شناخت سے محروم رہے؛ اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ گویا نظیری جنّت آرامگاہ کا مقطع میرے حسبِ حال ہے۔

"تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح ‏ ‏ ‏ ‏ باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ"

جتنے آدمیوں نے قاطع برہان کے جواب لکھے ہیں اُن میں سے بعض کے جواب مرزانے بھی لکھے ہیں

اور ان جوابوں میں زیادہ تر ظرافت اور شوخیِ طبع سے کام لیا ہے۔ کہیں اُنکے طرزِ بیان کا خاکا اُڑایا ہے کہیں اُن کی تحقیقات کا مضحکہ کیا ہے۔

لطیفہ

مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع قاطع" کا جواب مرزانے کچھ نہیں دیا؛ کیونکہ اُسمیں فحش اور ناشایستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اُسکا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزانے کہا "اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اُسکے لات مارو گے؟"

ایک شخص مرزا احمد علی بیگ متوطنِ کلکتہ ہیں؛ جنھوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب مؤید البرہان لکھی ہے؛ جسکے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برہان کے چند اوراق کی تردید کے لئے چھان مارا ہے۔ اور شل اور مجیبوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا۔ اور جو سبک الفاظ مرزانے صاحبِ برہان کی نسبت استعمال کئے تھے ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کئے ہیں۔ اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ہے اور ٹیک چند بہار اور قتیل کی بہت تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تاریخیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ہیں اُسکے جواب میں مرزانے ایک رسالہ موسوم بہ تیغِ تیز لکھا ہے؛ اور ایک فارسی قطعہ بھی اُن کو لکھکر بھیجا ہے۔ جسکے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں، جو لطف سے خالی نہیں۔

خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود ‏ ‏ ‏ ‏ خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است

با قتیل و جامعِ برہان و لالہ ٹیک چند ‏ ‏ ‏ ‏ لابہ* و شوگیری و لطف و مدارا کردہ است

داوری گاہے** بنا فرمود و در وے ہر سہ را ‏ ‏ ‏ ‏ منصف و صدر امین و صدرِ اعلیٰ کردہ است

* لابہ خوشامد۔ شوگیری طرفداری ۱۲ ** داوری گاہ محکمہ ۱۲

گرچنیں باہندیاں دارد تولّا در سخن | من ہم از ہندم چرا از من تبرّا کردہ است
مطلب از بدگفتنِ من چیست ؟ گویا نیک مرد | مُزد ایں کار از حق - آمرزش تمنّا کردہ است
صاحبِ علم و ادب ! وانگہ ز افراطِ غضب | چوں سفیہاں دفترِ نفرین و ذم وا کردہ است
درجدل دشنام کارِ سوقیاں باشد بلے ! | ننگ دارد علم از کارے کہ آغا کردہ است
انتقامِ جامعِ برہانِ قاطع می کشد | آں چہ ما کردیم با وے خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت | وائے بر وے گر بتقلیدِ من ایما کردہ است
زشت گفتم - لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام | شوخیِ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است
میکند تائیدِ برہاں لیک برہاں ناپدید | نیست جز تسلیمِ قولش ہرچہ انشا کردہ است
شستہ طرزِ خرامِ خامۂ برہاں نگار | یا نمی دانست یا دانستہ اخفا کردہ است
بہرِ من توہین و بہرِ خویش تحسیں جا بجا | ہم مرا، ہم خویش را ، وردِ ہر سوا کردہ است
یا قتم از دیدنِ تاریخہائے آں کتاب | خود بدم گفت و بہ احبابِ خود ایما کردہ است
غازیاں ہمراہِ خویش آورد از بہرِ جہاد | تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

قاطع برہان اور اُسکے متعلق مرزا کی جس قدر تحریریں ہیں اُن میں اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ حکایتیں اور لطائف و ترہات بھی درج ہیں ۔

(لطیفہ) لفظِ فراز کو صاحبِ برہان اضداد میں سے گنتا ہے اور فراز کردن کے معنی بند کرنا اور کھولنا دونو بتاتا ہے ۔ مگر مرزا اسکو اضداد میں نہیں گنتے ؛ بلکہ اُسکے معنی صرف بند کرنے کے بتاتے ہیں ؛ اور جو اشعار مخالف نے سند میں پیش کیے ہیں مرزا نے اُنھیں اشعار سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے ۔ مگر چونکہ ہندوستان کے

تمام فرہنگ نگاروں نے فراز کو اضداد میں شمار کیا ہے - اِسکی بابت مرزا لکھتے ہیں کہ ،، اسکو اضداد میں قرار دینا ویسا ہی اجماع ہے جیسا کہ اہلِ شام نے خلافتِ یزید پر اجماع کیا تھا ،،

(لطیفہ) صاحبِ برہان کی چند عامیانہ غلطیاں اور اُسکے بیان کی بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں ،، خدا پرستاں ! از بہرِ خدا ایں عربی نفہم فارسی نداں (یعنی جامع برہان) نمی پرسم کہ کیست ؟ می پرسم کہ چیست ؟ ایک اور جگہ نہایت طیش میں آکر لکھتے ہیں ،، چوں شناسائی حقیقتِ جوہرِ لفظ ندارد فرہنگ چرا می نگارد ؟ بوریا می بافت ، رسن می تافت ، ہیزم می فروخت ، گلخن می افروخت ،،

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر - جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا ، اور جو فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا - ازالہ حیثیتِ عرفی کی نالش بھی کی تھی ؛ مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخرکار اُنھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا ۔ اثنائے تحقیقات میں دلّی کے بعض اہلِ علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لئے بُلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں آیا فی الواقع اُن سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں ؟ اُنھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لئے اُن فقروں کے ایسے معنی بیان کئے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہو ۔ اِن مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا ۔ کسی نے پوچھا حضرت ! اُنھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی ؟ (لطیفہ) مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا

بہر چہ در نگری جز بجنس مائل نیست | عیارِ بیکسیِ من شرافتِ نسبی ست

* یعنی میری بیکسی کی وجہ شرافت نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے چونکہ شرافتِ نسبی میں کوئی میرا ہمجنس نہیں ہے اس لئے کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا ،،

گمنام خطوں میں گالیاں

جب یہ مقدمہ داخلِ دفتر ہوگیا ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن سب و شتم بھیجنے شروع کئے - جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی وغیرہ پر سخت نفریں اور طعن و ملامت لکھی ہوتی تھی - اُن دنوں میں مرزا کی عجب حالت تھی ؛ نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے - اور جب چٹھی رساں ڈاک لیکر آتا تھا تو - اِس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط نہ آیا ہو - اُن کا چہرہ متغیر ہوجاتا تھا - اتفاق سے اُنھیں دنوں میں نواب مصطفٰے خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلّی میں آنا ہوا - چونکہ مجھکو اِن نالائق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا ؛ ایک روز مجھسے ایک ایسی غلطی ہوگئی جس کے تصور سے مجھکو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے - یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے - خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو ، اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے اہلِ سنّت کو ، اور اہلِ سنّت میں سے صرف حنفیہ کو ، اور اُن میں سے بھی صرف اُن لوگوں کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقیّد کے ساتھ پابند ہیں ؛ نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے - گویا دائرہ رحمتِ الٰہی کو کوئن وکٹوریا کی وسعتِ سلطنت سے بھی - جس میں ہر مذہب اور ملّت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں - زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے - جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اُسی قدر اِس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اُسکا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لئے ناگزیر ہے - چونکہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجہ غایت تھا اِس لئے ہمیشہ اُنکی حالت پر افسوس آتا تھا - گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائیگا ؛ اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہوسکیگی - ایک روز مرزا کی بزرگی اُستادی ، اور کبرسنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھکر خشک مغز واعظوں کی

طرح اُنکو نصیحت کرنی شروع کی - چونکہ اُن کا ثقلِ سماعت انتہا کے درجے کو پہونچ گیا تھا ، اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعے سے کیجاتی تھی - نمازِ پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھکر اُن کے سامنے پیش کیا - جسمیں اُن سے اِس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہوکر ، یا بیٹھکر ، یا ایما و اشارے سے ؛ غرض جس طرح ہوسکے نمازِ پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں - اگر وضو نہ ہوسکے تو تیمم ہی سہی ؛ مگر نماز ترک نہو -

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گذری ؛ اور ناگوار گذرنے کی بات ہی تھی - خصوصاً اِس وجہ سے کہ اُنھیں دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں اُنکے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے ، اور بازاریوں کی طرح کھُلم کھُلا گالیاں لکھتے تھے - مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھکر جو کچھ فرمایا وہ سُننے کے لائق ہے - اُنھوں نے کہا " ساری عمر فسق و فجور میں گذری ؛ نہ کبھی نماز پڑھی ، نہ روزہ رکھا ، نہ کوئی نیک کام کیا - زندگی کے چند انفاس باقی رہگئے ہیں ؛ اب اگر چند روز بیٹھکر ، یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی ؛ تو اِس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہوسکے گی ؟ میں تو اِس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا مُنھ کالا کریں ، اور میرے پاؤں میں رسّی باندھکر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں ، اور پھر شہر سے باہر لیجاکر کتّوں ، اور چیلوں ، اور کوّوں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں - اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اِس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے ؛ لیکن اِس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں - ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں " لا الٰہ الا اللّٰہ ، لا موجود الا اللّٰہ ، لا موثر فی الوجود الا اللّٰہ "

شاید اُسی روز جب کہ یہ گفتگو ہوچکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے - چٹھی رساں نے ایک لفافہ لاکر دیا - لفافہ کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے اُنکو یقین ہوگیا کہ کوئی مخالف کا

ویساہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آچکے ہیں۔ لفافہ مجھکو دیا کہ اسکو کھولکر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اُسکے اظہار میں تامّل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگردِ معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اوّل سے آخر تک خود پڑھا۔ اُس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مُسکرا کر کہنے لگے کہ "اِس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بُڈّھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں؛ تاکہ اُسکو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں؛ کیونکہ اُسکو جورو سے زیادہ تعلّق ہوتا ہے۔ بچّے کو ماں کی گالی دیتے ہیں؛ کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو بہتّر برس کے بُڈّھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اِس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟

اِسکے بعد میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھکر میرے پاس بھیجی۔ جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلّص کی تصریح نہ تھی لیکن اُسکے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اُسمیں جو طعن و تعریض ہے وہ میرے ہی نسبت ہے۔ غزل یہ ہے

بمقصدے کہ مرآں را رہِ خدا گویند — برو برو کہ ازاں سو بیا بیا گویند

کسیکہ پاے ندارد چگونہ راہ رود — خود اہلِ شرع دریں داوری چہا گویند

ز رمزِ تخل انا اللہ گوے۔ ناآگاہ — حدیثِ جلوہ گہ و موسیٰ و عصا گویند

مگر ز حق نبود شرم حق پرستاں را — کہ نامِ حق نبرند و ہمیں انا گویند

ز قولِ شاں نبود دل نشینِ اہلِ نظر — جز آں صفات کہ از ذاتِ کبریا گویند

نخواندہ در کتب و ناشنیدہ از فقہا — بغیرِ سے مزہ واگویہ ہا کہ واگویند

دم از "وجودک ذنب"* زدند بےخبراں — چہ ساں عطیۂ حق را گناہ ما گویند

بلے! گناہ بود دعوےِ وجود از ما — باہلِ راز چنیں گوے تا بجا گویند

دگر ملامتیاں را چہ زہرہ یا سنخ — اگر بہ خشم گرایند و ناسزا گویند

نکردہ زر مسِ خود را و بہر عرضِ فریب — بہ پیشِ خلق حکایت ز کیمیا گویند

کساں کہ دعوےِ نیکی ہمی کنند۔ مرا — اگر نہ نیک شمارند۔ بد چرا گویند!

طمع مدار کہ یابی خطابِ "مولانا" — بس ست ہمچو توئے را کہ پارسا گویند

بگوے مردہ۔ کہ در دہر کارِ غالبِ زار — ازاں گذشت کہ درویش و بےنوا گویند

اس غزل کو دیکھکر مجھکو اِس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمالِ شاعری کی نسبت جو خیالات مکنونِ خاطر ہیں؛ اور کبھی اُنکے اظہار کی نوبت نہیں آئی؛ اُن کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعہ میں بیان کیا جائے۔ چنانچہ قطعۂ ذیل ترتیب دیکر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔

قطعہ

تو اے کہ رونقِ پیشینیاں بہم شکست — ز نظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی

چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی — چہ بذلہ ہا کہ بہ اندازِ دلربا گفتی

*یہ ایک مشہور قول صوفیۂ کرام کا ہے۔ میں نے جو کچھ مرزا صاحب کو لکھکر دیا تھا اُس میں ایک موقع پر یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا۔ مرزا اُسپر اعتراض کرتے ہیں اور اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ "وجود ایک عطیۂ الٰہی ہے؛ پس اُس کو ہمارا گناہ کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ البتہ دعویِ وجود گناہ ہے۔ اگر اہلِ راز سے اِس طرح کہا جائے تو وہ تسلیم کرسکتے ہیں"، مگر معلوم رہے کہ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ "وجودک ذنب" وہ ایک وجودِ واجب کے سوا اور کسی وجود کے قائل نہیں ہیں۔ وحدتِ وجود اُن کا اصل اصول ہے۔ پس اُن کے نزدیک وجودِ ماسوا عطیۂ حق نہیں ہے بلکہ وہم و خیالِ انسانی کے مخترعات میں سے ہے اِسی لئے وہ کہتے ہیں کہ "وجودک ذنب"۔ ۱۲

رسید نشئہ عرفاں چو ذکر مے راندی … شگفت خاطر یاراں گر از صبا گفتی
دوید ریشہ بدلہا جو حرف مہر زدی … دمید نخل تمنا چو از وفا گفتی
گہر بہ بزم فشاندی اگر ثنا خواندی … اثر ز لفظ دماندی اگر دعا گفتی
ہزار عقدۂ سربستہ باز بکشودی … ہزار نکتۂ پوشیدہ بر ملا گفتی
ز سر تفرقہ و جمع قصہ ہا راندی … ز سیر انفس و آفاق رازہا گفتی
بر آمد از دل بیگانگاں ترانۂ ذوق … بہ محفلے کہ سخن ہائے آشنا گفتی
لطیفہ ہا کہ بہ لفظ و بیاں نمی گنجید … تو چوں فرشتہ ز غیب آمدی و وا گفتی
بحق لطف کلامت کہ ہست بر دل ما … کہ پایۂ سخن افراشتند تا گفتی
تو اے کہ ہر سخن نغز تو بدل جا کرد … جز آں کہ در حق حالی بر مزد وا گفتی
ہر آنچہ گفتۂ اندر جواب عرض نیاز … خطا بود کہ بگیرم اگر خطا گفتی
ولے بعربدہ از حرف چند با خویشم … کہ گر نگفتہ ام آخر تو از کجا گفتی
عجب کہ قاعدہ دان نیازمندی را … سفیہ و معجب و خود بین و خودنما گفتی
عجب کہ چاشنی اندوز خاکساری را … رہین ذوق نوا سنجے انا گفتی
عجب کہ منفعلے راز نقد ناسرہ اش … بہ زرق در گرہ عرض کیمیا گفتی
نہ راہ حرف بسویت نہ جائے من بہ لبت … جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی
اگر نہ روئے سخن با تو بود می گفتم … چگونہ گفتی؟ و چوں گفتی؟ و چرا گفتی
ولیک شرط ادب نیست بر تو خردہ گرفت … ہر آنچہ در حق من گفتہ بجا گفتی

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اُس زمانے میں مجھکو نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم تخلص بہ شیفتہ وحسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا، اور اُن دنوں میں وہ دلی آئے ہوے تھے، اور میں انھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گذرا تو اُنھوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھکر بھیجا جو ذیل میں درج ہے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری … ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب بخید … تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال … بر آں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ … دگر بہ پیشگہ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھکو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقعت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعہ کا ذکر چھڑ گیا ہے اُسکو انجام تک پہونچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعہ پر میں نے ایک اور قطعہ لکھکر ان کی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

قطعہ

تو اے کہ عذر فرستادہ بسوے رہی … سزد کہ جان گرامی بر آں نثار کنم
شکایتے کہ تواں گفت عین اخلاص … گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم
نماند قاعدۂ شکر بے ریا بجہاں … اساس دوستی از شکوہ استوار کنم

چو شکوه جز بتقاضاے دوستی نبود | زغیر شکر و شکایت ز دوست دار کنم
سرشت پاک و دلِ صاف داده اند مرا | بحرفِ تلخ دلے خالی از غبار کنم
خوش آں کہ ساز کنم از تو شکوه بیجا | تو اعتذار کنی و من افتخار کنم
خوش آں کہ عذرِ تو چوں در کند مراز بیں | دگر بہ پیشِ تو تمہیدِ اعتذار کنم
براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد زیں پس | ز کار ہاے جہاں خاصہ ایں کار کنم
ز کرده توبہ نمایم ز گفتہ استغفار | دگر سپاسِ تو پنہان و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہونچا اُسپر یہ لکھکر کہ "بس اب بیت بحثی موقوف" میرے پاس بھیج دیا اِسکے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں پڑھا تھا؛ مگر چونکہ علم لسان سے اُن کو فطری مناسبت تھی۔ اُنکی نظم و نثر اُردو و فارسی کے دیکھنے سے کہیں اِس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گذرتا کہ یہ شخص عربیت اور فنِ ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو اُنھوں نے ہر جگہہ اُسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اَچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے۔ شاعری جسکا ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُس سے قطع نظر کرکے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہلِ زبان کے اسالیب بیان پر مرزا کو اِس قدر عبور تھا کہ خود اہلِ زبان میں بھی مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اِس قدر عبور ہوگا۔ اِسکے سوا فنِ عروض میں بھی اُن کو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سُنا گیا ہے کہ باوجود کمال شاعری کے اِس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں، اور سیدھی سیدھی بحروں کے سوا جنکے وزن اور

قول کا اندازہ صرف استقامتِ طبع سے ہو سکتا ہے۔ اور بحروں میں کلام موزوں نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں "من ندانم فاعلاتن فاعلات * شعر می گویم بہ از قند و نبات *" مرزا کا ایسا حال نہ تھا چنانچہ فارسی اور اُردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیده ایسی ٹیڑھی بحروں میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے اُن بحروں میں نہیں چل سکتے۔ علم نجوم سے کسی قدر، اور اُسکی اصطلاحات سے پوری واقفیت اُن کو تھی۔ چنانچہ اُنکی نظم فارسی میں جابجا اِس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ علم تصوّف سے جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "براے شعر گفتن خوب ست"، اُن کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُنکے مطالعے سے گذرے تھے۔ اور سچ پوچھیے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔ فنِ تاریخ اور سیاق و مساحت وغیرہ سے اُن کو مطلق لگاؤ نہ تھا جس زمانے میں کہ وہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ یعنی مہرِ نیمروز لکھ رہے ہیں کسی نے اُن کو مورخ سمجھکر کچھ سوالات کئے ہیں جسکے جواب میں لکھتے ہیں "میں فنِ تاریخ و مساحت و سیاق سے آشنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازانِ دفترِ شاہی خلاصۂ حالات از روی کتب اُردو میں لکھکر میرے پاس بھیجتے ہیں، میں اُسکو فارسی کرکر حوالے کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں میں اِسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں؛ مورخ نہیں ہوں"

"ما قصۂ سکندر و دارا نخوانده ایم | از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس"

مرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز نہایت شیریں اور دلاویز تھا جیسا کہ اکثر اہلِ ایران کا ہوتا ہے اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاصکر مشاعروں میں حد سے

* لطیفہ۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ سے کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں؟ اُنھوں نے کہا ایسا ہی دخل تھا جیسا مجھے شاعری میں ہے"

زیادہ دلکش اور موثر تھا ۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے ۔ جب کہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سُنا ہے ۔ چونکہ اُنکے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی اِس لئے صبح ہوگئی تھی ۔ مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں ؛ یہ کہکر اوّل اُردو طرح کی غزل اور اُسکے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُردرد آواز سے پڑھی ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے ؛ اور اِس لئے غزلخوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے ۔

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنوں شاہ صاحب کے پُرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک مشاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستن اور تنہا گریستن جو جناب سیدالشہدا کی منقبت میں اُنھوں نے لکھا تھا پڑھا ۔ سُنا ہے کہ مجلس مشاعرہ بزم عزا بن گئی تھی ۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے ؛ مفتی صدرالدین خاں مرحوم بھی موجود تھے اتفاق سے اُسی حالت میں مینہ بھی برسنے لگا مفتی صاحب نے کہا "آسماں ہم گریست"

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلف الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندر گاہ بصرہ میں ایک جگہ مجلس عزا تھی ، اور بارش ہو رہی تھی ۔ بانیِ مجلس نے مجھسے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو ۔ میرے پاس اُسوقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتاب نہ تھی ۔ اسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے ؛ میں نے وہی پڑھ دیے ۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی ۔ عرب ، عجم ، اور ہندی سب اِس مجلس میں شریک تھے ۔ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھسے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے بخصوصاً اِس شعر کی بہت تعریف کرتے رہے ۔

مزدِ شفاعت وصلۂ صبر د خونبہا ۔۔۔ ہیچ از کسے نخواستہ الا گریستن

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اِسی شعر پر مصرعے لگائے تھے مگر اُنکو خود پسند نہ آئے اور کہا کہ جس رتبے کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکتے ۔

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے ۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے ۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مِل آتا تھا اُسکو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا ۔ دوستوں کو دیکھکر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے ؛ اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے ۔ اِسلئے اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے ۔ جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اُن کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے ۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمّے فرضِ عین سمجھتے تھے ۔ اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا ۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے ۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے ۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں اُنکے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُنکی تعمیل کرتے تھے ۔ لوگ اُنکو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گذرتا تھا ۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھکر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے ۔ اُنھوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے اُسنے کتاب کی رسید لکھی ہے ، اور قیمت دریافت کی ہے ۔ اُسکے جواب میں لکھتے ہیں "حرفِ پرسشِ مقدارِ قیمت چرا بر زبانِ قلم رفت ؟ ہنجارِ نوازشِ نیازمنداں بے نوا نہ اینست ۔ بے سرمایہ ام نہ فرومایہ ۔ سخنورم نہ سوداگر ۔ مؤمنیہ پوشم نہ کتاب فروش ۔ پذیرندۂ عطایم نہ گیرندۂ بہا ۔ ہرچہ آزادگاں بشہزادگاں فرستند نذرست ؛ و ہرچہ شاہزادگاں

بآزادگاں بخشند تبرک ۔ بیع وشرا نیست ۔ چون وچرا نیست ۔ ہرچہ فرستادہ ام ارمغان ست ۔ وہرچہ خواہم فرستاد ارمغاں خواہد بود "

مروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے ؛ بااینہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے ۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں " جہاں تک ہوسکا احباب کی خدمت بجالایا ۔ اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا ۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے ، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے ۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبرسِن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی ۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمتِ اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں ۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھدیا کرونگا "

باوجود اسکے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے ۔ ایک دفعہ کسی مرزا تفتہ نے یہ لکھدیا تھا کہ آپ نے بسبب ذوقِ سخن کے اصلاحِ اشعار منظور فرمائی تھی ۔ اسکے جواب میں لکھتے ہیں " لاحول ولاقوۃ ! کس ملعون نے بسبب ذوقِ شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی ؟ اگر میں شعر سے بیزار نہوں تو میرا خدا مجھسے بیزار ۔ میں نے تو بطریقِ قہرِ درویش بجانِ درویش لکھا تھا : جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے "

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا ۔ سائل اُنکے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا ؛ اُنکے مکان کے آگے اندھے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے ۔ غدر کے بعد اُنکی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی ؛ اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا ؛ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے ؛ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے ۔

غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹننٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسبِ معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقومِ جواہر کے ملا تھا ۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے ۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اِس لئے اُنھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقومِ جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں ۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دے کر رخصت کیا ۔

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑگئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے ۔ دلّی کے عمائد میں سے ایک صاحب ۔ جو مرزا کے دلی دوست تھے ، اور غدر کے بعد اُنکی حالت سقیم ہوگئی تھی ۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے ۔ مرزا نے کبھی اُنکو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا ۔ چھینٹ کا فرغل اُن کے بدن پر دیکھکر دل بھر آیا ۔ اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپنے کہاں سے لی ؟ مجھے اِسکی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے ؛ آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوادیں ۔ اُنھوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے ، اور میں نے اسی وقت اِسکو پہنا ہے ؛ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے ۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اِسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائینگے ؟ پھر اِدھر اُدھر دیکھکر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اِس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ اُنکی نذر کیا ۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں " قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے ۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں

اور اُس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھیرا، کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتوان، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیگ مانگے وہ میں ہوں''

جیسی مرزا کی طبیعت میں درّاکی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی اسی طرح انکا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ انکے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا، ہمیشہ کرایے کی کتابیں منگوا لیتے تھے، اور اُنکو دیکھکر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی اُن کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جسکی سند اہلِ زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے اُن کے کلام پر اعتراض کئے تھے، اور جنکے جواب میں مرزا نے مثنوی بادِ مخالف لکھی تھی، اُن کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھکر علیحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے خطوط میں اُنکو مفصل بیان کیا ہے۔ برہانِ قاطع پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے۔ اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنے آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اُسکی تہ کو پہونچ جاتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم گلشنِ بیخار میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں ''مضامینِ شعری را کما ہو حقہٗ می فہمد، و بجمیع نکات و لطائف پے می برد؛ وایں فضیلتے است مخصوص خواصِ اہلِ سخن است۔ اگر طبعِ سخن شناس داری بایں نکتہ می رسی؛ چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب ست اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حالِ کسیکہ از ہر دو شربے یافتہ، و حظّے ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ''۔ نواب ممدوح نے مجھسے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزردہ نے ''دور نہیں''، ''حور نہیں'' اِس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اُسمیں اتفاق سے مطلع بہت اچّھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سُنا کر اُنسے کہا کہ۔ اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف و قافیے میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جسکا مطلع یہ ہے ''عشق عصیانست اگر مستور نیست ÷ کشتۂ جرم زباں مغفور نیست''۔ ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں۔ جسمیں ہماری غزل ہے۔ اُردو غزل لکھتا تو اُسکا مطلع اِس طرح ہوتا ''عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں ÷ کشتۂ جرمِ زباں ناجی و مغفور نہیں''۔ آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور۔ بغیر اِسکے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سُنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے''۔ چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمے سے بہت لیست ہو گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کرینگے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دینگے۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہونچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلع ہیں، اِن میں آپ محاکمہ کیجیے

کہ کونسا مطلع اچھا ہے ؟ اور بطورِ تضمین کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اس مطلع کو سُنکر سر دُھننے لگے ؛ اور متحیر ہوکر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا ؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملیگی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا ؛ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔

[illegible] فہمی

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور اُن کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ - جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا - مطالعہ کر رہا تھا ؛ اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اُسی وقت مرزا صاحب آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ اُنھوں نے کسی قدر غور کے بعد اُسکا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ صاحب بھی شاید اُس سے زیادہ نہ بیان کرسکتے۔

حسن بیان اور ظرافت

مرزا کی تقریر میں اُنکی تحریر اور اُن کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور اُنکی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے ؛ مگر جو کچھ اُنکی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسنِ بیان، حاضر جوابی، اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُنکی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ

ایک دفعہ جب رمضان گذر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تمنے کتنے روزے رکھے ؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ اُنکے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گذر کر دیوانخانے کے دروازے پر پہنچے۔

لطیفہ

تو وہاں نواب صاحب اُنکے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے اُن کو دیکھکر یہ مصرع پڑھا " کہ آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکیست "۔ جب دیوانخانے میں پہنچے تو اُسکے دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا " ایں خانہ تمام آفتاب ست "۔ ایک صحبت میں مرزا - میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے ؛ اُنھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا " میں تو تمکو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں "

لطیفہ

مولوی امام بخش صہبائی مرحوم کی رائے پنجرقعہ اور مینا بازار کی نسبت یہ تھی کہ یہ دونو تحریریں بھی مثل سہ نثر کے مُلّا ظہوری کی ہیں مگر مرزا اِسکے خلاف تھے۔ ایک جلسے میں دونو صاحب موجود تھے۔ اتفاق سے یہ ذکر چھڑ گیا۔ مرزا نے کہا " قطع نظر اِسکے کہ سہ نثر کی اور پنجرقعہ و مینا بازار کی طرز میں بون بعید ہے - ظہوری کی شان سے نہیں ہے کہ وہ نثر کے ساتھ نظم نہ لکھے۔ تمام سہ نثر میں ایسا ایک صفحہ بھی مشکل سے نکلیگا جس میں نثر ہو اور نظم نہو۔ برخلاف اِسکے تمام پنجرقعہ و مینا بازار میں ایک شعر کے سوا - کہ وہ بھی ظہوری کا نہیں ہے - نظم کا کہیں پتا نہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم و نثر دونو چیزوں پر برابر قدرت رکھتا ہو اُسکی نثر میں کہیں نظم نہ پائی جائے "۔ مولانا صہبائی نے کہا " ایسے اتفاقات اکثر ہو جاتے ہیں یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے "۔ مرزا نے کہا " بے شک ! مگر یہ ایسا اتفاق ہوگا کہ ایک شخص ہر ایک لحاظ سے نہایت سنجیدہ، شائستہ، اور معقول آگے کا آدمی ہے ؛ مگر اتفاق سے کبھی کبھی کاٹ بھی کھاتا ہے "۔ یہ سُنکر سب لوگ ہنس پڑے ؛ اور مولانا صہبائی مُسکرا کر خاموش ہو رہے۔

لطیفہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا ؛ اور اُسکے ایک جانب ایک کوٹھڑی تنگ و تاریک تھی - جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں

بہت جھک کر جانا پڑتا تھا ؛ اُسمیں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے ۔ ایک دن - جبکہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا - مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے ۔ اُسوقت مرزا صاحب اُسی کوٹھڑی میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے ۔ مولانا بھی وہیں پہونچے ؛ اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھکر کہنے لگے کہ " ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے ؛ مگر آج اِس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہوگیا "، مرزا نے کہا " قبلہ ! حدیث بالکل صحیح ہے ؛ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھڑی تو ہے ۔

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہوتی تھی ۔ اگر کوئی اُنکے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی ۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا ؛ مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے ۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی ۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے ۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ اُنکے مکان پر نہیں آتے تھے ؛ وہ بھی کبھی اُنکے مکان پر نہیں جاتے تھے ۔ اور جو شخص اُنکے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُسکے مکان پر ضرور جاتے تھے ۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفےٰ خان مرحوم کے مکان پر آئے ؛ میں بھی اُس وقت وہاں موجود تھا ؛ نوابصاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا ؟ مرزا نے کہا مجھکو اُن کا ایک آنا دینا تھا ؛ اِس لیے اول وہاں گیا تھا ؛ وہاں سے یہاں آیا ہوں ۔

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم - چرٹ میں سوار - مرزا کے مکان کے پاس سے

بغیر ملے نکل گئے ۔ مرزا کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ " کہ آج مجھکو اسقدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں ۔ اِس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی کبھی تو اِس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہوں "، جب یہ رقعہ دیوان جی پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے ۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی ۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے ؛ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی اُنھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا ۔ اخیر میں اُن کی خوراک بہت کم ہوگئی تھی ۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے ۔ دن کو جو کھانا اُن کے لئے گھر میں سے آتا تھا اُسمیں صرف پاؤسیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا ۔ ایک پیالے میں بوٹیاں ، دوسرے میں لعاب ، یا شوربا ، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا ، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی ، ایک اور پیالی میں دو تین پیسہ بھر دہی ، اور شام کو کسی قدر شامی کباب ، یا سیخ کے کباب ؛ بس اِس سے زیادہ اُنکی خوراک اور کچھ نہ تھی ۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا ، اور دسترخوان بچھا ؛ برتن تو بہت سے تھے ؛ مگر کھانا نہایت قلیل تھا ۔ مرزا نے مسکرا کر کہا " اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے ؛ اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا "

فواکہ میں آم اُن کو نہایت مرغوب تھا ۔ آموں کی فصل میں اُن کے دوست دور دور سے اُنکے لئے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے ؛ اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کرکے آم منگواتے تھے ۔

اُنکے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتے کے قیام کے زمانے میں اُنھوں نے امام باڑہ

کے متوّلی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے۔ اُسمیں لکھتے ہیں "نخچی تشکم بندہ ام، وقدرے ناتواں
ہم آرائشِ خواں جویم، وہم آسائشِ جاں۔ خِرد وراں دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندرست؛ و
اہلِ کلکتہ برآنند کہ قلم وانبہ بنگلی بندرست۔ آرے انبہ از بنگلی، وگل از گلشن؛ انیار از جناب، وسپاس
از من۔ شوق می سگالد کہ تا پایانِ موسم دوسہ بار بخاطرِ دلی نعمت خواہم گذشت۔ وآزمی نالد کہ حاشا بدیں پایہ
برخورداری خورسند نخواہم گشت"

لطیفہ

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ۔ جن میں مرزا بھی تھے۔
باغِ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدرہے تھے۔
یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسّر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف
غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اِس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھکر
عرض کیا "پیرومرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے" بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں * کایں فلاں ابنِ فلاں
ابنِ فلاں * اِسکو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔
بادشاہ مُسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

لطیفہ

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے اُن کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن وہ مرزا
کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے؛ اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے
لئے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے؛ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا
دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔
مرزا کی نیّت آموں سے کسی طرح سیر نہوتی تھی۔ اہلِ شہر تحفۃً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے؛

باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا؛ مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفٰے خاں
مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے؛ اور آم کی نسبت
ہر شخص اپنی اپنی راے بیان کر رہا تھا کہ اُس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی
کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی راے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک
تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں؛ میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

مرزا کو مدّت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار اُنھوں نے مقرّر کرلی
تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُسکی کنجی داروغہ کے
پاس رہتی تھی؛ اور اُسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھکو زیادہ پینے کا خیال پیدا
ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا؛ اور کُنجی مجھکو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے؛ اور نشے
کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے؛ مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کُنجی نہ دیتا تھا۔ اوّل
تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے؛ دوسرے اُسمیں دو تین حصّے گلاب ملا لیتے تھے۔ جس سے اُسکی حدّت
اور تیزی کم ہوجاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست　　　آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اِس قدر احتیاط اور اعتدال کے اِس کافرنشے کی عادت نے آخرِ کار مرزا کی صحت کو
سخت صدمہ پہنچایا جسکی شکایت سے اُنکے تمام اُردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔
مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست۔ جن سے نہایت بے تکلفی تھی۔ اکثر شام کو اُن کے
پاس جاکر بیٹھتے تھے۔ اور مرزا سرور کے عالم میں اُس وقت بہت پُر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے ؛ اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے ۔ میر مہدی پانو دابنے لگے ۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے ؛ مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے ؟ اُنھوں نے نہ مانا ؛ اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا ۔ مرزا نے کہا ہاں اسکا مضائقہ نہیں ۔ جب وہ پیرداب چکے اُنھوں نے اُجرت طلب کی ۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اُجرت ؟ تم نے میرے پانو دابے ؛ میں نے تمھارے پیسے دابے ؛ حساب برابر ہوا ۔

ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے میں بھی وہاں موجود تھا اور اُنکے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا ۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں ؛ میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دونگا ۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ "نواب عبد الاحد خاں کے دسترخواں پر اُن کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لئے ہر قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے ؛ مگر خاص اُنکے لئے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی ۔ وہ اُسکے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے ۔ ایک روز اُنکے لئے مزعفر پکا تھا ؛ وہی اُنکے سامنے لگایا گیا ۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منھ لگا ہوا تھا جو اُسوقت دسترخوان پر موجود تھا ۔ نواب نے اُسکو کھانا دینے کے لئے خالی رکابی طلب کی ۔ اُسکے آنے میں دیر ہوئی ۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے ۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا ؛ اور کہا "حضور اور رکابی کیا کیجیے گا اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے" نواب یہ فقرہ سُنکر پھڑک گئے اور وہی رکابی اُسکی طرف سرکا دی "

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسماں کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھکر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے ۔ ستاروں کو تو دیکھو

کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں ؟ نہ تناسب ہے ، نہ انتظام ہے ، نہ بیل ہے ، نہ بوٹا ہے ، مگر بادشاہ خود مختار ہے ؛ کوئی دم نہیں مار سکتا ۔

ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے ۔ جب تھوڑی دیر ٹھیر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعداں لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھکر پہن لیں ۔ اُنھوں نے کہا قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی ؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا ۔ مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا ؛ بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں ۔

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے اُنھوں نے شراب کی جابجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اُسکو بہت بُرا جانتے تھے ؛ اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے ۔ باوجود اسکے اُنھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں ۔ شراب کے متعلق اُنکی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں ۔ ایک شخص نے اُنکے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی ۔ مرزا نے کہا بھائی جسکو شراب میسر ہے اُسکو اور کیا چاہیے جسکے لئے دعا مانگے ۔

ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں "بے مے نکند در کفِ من خامہ روائی ٭ سر دست ہوا آتشِ بے دود کجائی" "میر مہدی ! صبح کا وقت ہے ۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے ۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے ۔ دو حرف لکھتا ہوں ؛ ہاتھ تاپتا جاتا ہوں ۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پئے میں دوڑ گئی ۔ دل توانا ہو گیا ، دماغ روشن ہو گیا ، نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا ۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب ! ! ! ہائے غضب ہائے غضب" یہ خط غدر کے بعد اُس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند ہے اور بسبب عسرت و تنگدستی کے کچھ پیتے پلاتے نہیں ہیں ۔

میر مہدی مجروح نے جو پورے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہمانوں کے لئے کیا گیا تھا اسکا ذکر لکھا ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں

"میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامۂ شمارا خواندند و بہ ذوقِ شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب در دہن گشت سخن از بادۂ ناب نبود ورنہ مرا نیز دل از جا رفتے"

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلق جس قدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر خیام سے کم نہونگے ؛ یہاں ایک شعر اردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں　　یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

خجلت نگر کہ در خستانم نیافتند　　جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

غالب بسخن گرچہ گشت ہمسر نیست　　از نشۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست

مے خواہی و مفت و نغز و انگہ بسیار!!!　　ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصلِ اصول اور رکنِ رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہلِ حال سے نہ تھے ؛ مگر جیسا کہ کہا گیا ہے "من احب شیئاً اکثر ذکرہ" توحید وجودی انکی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انھوں نے جس قدر اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے۔

امید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را　　بہ دوستی سخن ہائے آشنا بخشند

انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیتِ نبی کی محبت ؛ اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ شاعر کے کلام سے اسکے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکماے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اسکے قائل نہ تھے چنانچہ انھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں "ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ÷ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے "در گردیدنِ زاہداں بجنت گستاخ ÷ واں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ ÷ چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ ÷ مانند بہ بہائم و علفزار فراخ"

مرزا باوجودیکہ احکامِ ظاہری کے بہت کم پابند تھے ؛ لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعہ پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ؛ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھکو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے ؟ مگر چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی۔ جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر ان سے بغیر کہے نہیں رہا جاتا تھا ؛ خواہ اس میں انکو کوئی کافر سمجھے یا رند مشرب کہے ، یا بدمذہب جانے۔

غدر کے بعد۔ جبکہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہوئی تھی۔ پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر ؛ اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار ؛ پھر میں

نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر انکا میلانِ طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسول خدا کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہمنے سُنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہوگئی۔ چند رباعیاں لکھکر حضور کو سُنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ اُن میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھکو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھسے عداوت گہری کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری

دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی ؟ شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری ؟

دہریت اور تصوف میں جو بُعدِ بعید ہے وہ ظاہر ہے ؛ دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہے پس صوفی دہری کیونکر ہو سکتا ہے؟ چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سُنی ہونے میں ضرب المثل ہیں ؛ یہاں تک کہ شیعہ اُن کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراء النہر سے تھی اِسلیے کہتے ہیں کہ ایک ماوراء النہری رافضی یا شیعی کیونکر ہو سکتا ہے ؟

جو لوگ مرزا کی طرزِ مزاج اور طرزِ کلام سے ناآشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنا مذہب غلط بیان کیا ؛ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب

رباعیاں صرف بادشاہ کے خوش کرنے اور اہلِ دربار کے ہنسانے کے لئے لکھی گئی تھیں ؛ کیونکہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔ مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اِس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کرکے پڑھا

"ملے دُو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دُو طالب نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب"

رمضان کا مہینا تھا ؛ ایک سُنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے۔ عصر کا وقت تھا۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا "کیا جناب کو روزہ نہیں ہے ؟ مرزا نے کہا "سُنی مسلمان ہوں ؛ چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں"

ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اُس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ انکا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اُسکے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائیگی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاؤنگا۔ چنانچہ اُنھوں نے لکھنؤ جاکر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے ؛ حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور اُنھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا۔ جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے۔ اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا۔

اِس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے ۔ اِس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا ؛ اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اِسکے تدارک کے لئے کچھ رسالے شائع کرائے ، اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے ، اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی - جسکا نام غالباً دمغ الباطل رکھا گیا تھا ، اور جسمیں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا ۔ اِس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے اُن کو فارسی میں نظم کر دیا تھا ۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہونچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اِس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے ؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازمِ شاہی ہوں جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اُسکی تعمیل کرتا ہوں ۔ اِس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں ۔

مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی ۔ باوجودیکہ تیزیِ ذہن اور سلامتیِ طبع دونو ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں ؛ مرزا میں یہ دونو باتیں بوجہ اتم موجود تھیں ۔ اِسی سلامتیِ طبع کا اقتضا تھا کہ ابتداے مشقِ سخن میں جو ٹیڑھا رستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا - بغیر اِسکے کہ کوئی اُستاد رہبری کرے - جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی اُسی قدر آہستہ آہستہ اُس سے انحراف ہوتا گیا ؛ اور آخرکار اساتذۂ مسلّم الثبوت کی روشِ مستقیم پر آرہے ۔

مرزا ازراہ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں انتہاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں ؛ لگر مدح و ستائش میں مجھسے اُن کا ساتھ نہیں دیا جاتا ۔ مرزا کا یہ کہنا

بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے ؛ کیونکہ جو زور اُنکی تشبیبوں میں پایا جاتا ہے وہ مدح میں آکر باقی نہیں رہتا ۔ مگر ہم اسکو اُن کے نقصِ شاعری پر محمول نہیں کرتے ؛ بلکہ غایت درجے کی سلامتِ ذہن اور استقامتِ طبع کی دلیل جانتے ہیں ۔ جھوٹی اور بے اصل باتوں کو چمکانا ، اور زمین و آسمان کے قلابے ملانا ، اور مبالغہ و اغراق کا طوفان اُٹھانا فی الحقیقہ شاعر کا کمال نہیں ہے ؛ بلکہ جس قدر اُسکی طبیعت اِن باتوں سے ابا کرتی ہے اُسی قدر جاننا چاہیے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرزا کی ساری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گذری ؛ کیونکہ ضرورت انسان سے سب کچھ کراتی ہے ، مگر فی الحقیقہ جیسا کہ ہم آگے بیان کرینگے ۔ اُن کو کھیتی کرنے کا طریقہ جیسا کہ چاہیے ویسا نہیں آتا تھا ۔

اِس مقام پر ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں - جس سے مرزا کی سلامتیِ طبع کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے ۔

مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور اُن کو فارسی زبان کا نہایت متعقد شاعر مانتے تھے ۔ چونکہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی ؛ اُنھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھدو - جس میں اُنکے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاصکر امتناع نظیر خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح اور بسط کے ساتھ بیان کرو ۔ اِس مسئلے میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے ؛ ممتنع بالذات نہیں ہے ۔ یعنی آنحضرت کا مثل اِس لئے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اُسکا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے ؛ نہ اِس لئے کہ خدا اُسکے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے ۔ برخلاف اِسکے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے ؛ اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا اِسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا ۔

مرزا صاحب پر یہ فرمائش ہوئی کہ اس مسئلے پر جو رائے مولانا فضل حق کی ہے وہ فارسی نظم میں بیان کیجائے۔ مرزا نے اوّل عذر کیا کہ مسائلِ علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے۔ مگر اُنھوں نے نہ مانا۔ لاچار مرزا نے ایک مثنوی - جو کہ اُنکے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے - لکھکر مولانا کو سُنائی۔ اُنھوں نے بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ اگر میں فارسی شعر میں تمھاری برابر مشاق ہوتا تو بھی ایسی خوبی سے اِن مطالب کو نہ ادا کر سکتا۔ مگر جو کچھ مرزا نے مسئلۂ نظیرِ خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا اُسپر مولانا سخت ناراض ہوے۔ مرزا نے صاف صاف تو یہ نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے؛ مگر اس مضمون کو اس پیرائے میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا دوسرا خاتم پیدا نہیں ہو سکتا؛ لیکن خدا قادر ہے کہ ایسا ہی ایک اور عالم پیدا کر دے اور اُسمیں خاتم النبیین کا مثل جو اس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو خلق فرما دے۔ چنانچہ اُنھوں نے اِس مضمون کو اِس طرح نظم کیا ہے۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است — قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است

خواہد از ہر ذرّہ آرد عالمے — ہم بود ہر عالمے را خاتمے

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃٌ للعالمینے ہم بود

کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر؟ — یا بیک عالم دو خاتم خوب تر؟

در یکے عالم دو تا خاتم مجوے — صد ہزاراں عالم و خاتم بگوے

جب مرزا اوّل بار مثنوی لکھکر مولانا کے پاس لائے تو مضمونِ مذکور کو اس اخیر شعر پر ختم کر کے لائے تھے۔ مولانا نے فرمایا یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں؛ نہیں بلکہ

اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا۔ پس اِس مضموں کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو اور جس طرح میں کہتا ہوں اُس طرح بیان کرو۔ مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصومت تھی اور نہ اُنکے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا؛ بلکہ صرف دوست کی رضاجوئی مقصود تھی۔ اُنھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اُسکو تو اُسی طرح رہنے دیا مگر اُسکے آگے چند اشعار اور اضافہ کر کے کلام کو اِسطرح مربوط کر دیا۔

غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمے — خُردہ - ہم بر خویش می گیرم ہمے

اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ — دانم از روے یقینش خواندۂ

ایں الف لامے کہ استغراق راست — حکمِ ناطق معنیِ اطلاق راست

منشأ ایجادِ ہر عالم یکیست — گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

اِسکے بعد اِسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے؛ اور پھر مثنوی کو اِن دو شعروں پر - جن میں نظیرِ خاتم النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے - ختم کر دیا ہے۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است — لاجرم مثلش محالِ ذاتی است

زیں عقیدت برنگردم والسلام — نامہ را درمے نوردم والسلام

اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی؟ اور اعوجاج سے کس قدر اُنکا ذہن اِبا کرتا تھا؟ باوجودیکہ مولانا فضل حق نے اِس مسئلے کے متعلق جو کچھ اُنکی رائے تھی مرزا کے خوب ذہن نشین کر دی تھی اور مرزا اُسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آکر سیدھی ہو جاتی ہے اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اُس ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے اور بغیر اِسکے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی وہ

اُنکے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی۔ پھر اُسکے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا کے جبر سے لکھا ہے؛ اُسکو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں۔

ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سُناتا ہے اُسکے ہر ایک شعر پر۔ خواہ اَچھا ہو خواہ بُرا۔ برابر تحسین و آفریں کی جاتی ہے اور اَچھے اور بُرے شعر میں کچھ تمیز نہیں کی جاتی؛ مرزا کی عادت بالکل اسکے برخلاف تھی۔ کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو جب تک اُسکا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اُسکی تعریف نہ کرتے تھے۔ اخیر عمر میں تو اُن کا ثقلِ سماعت انتہا کو پہونچگیا تھا؛ مگر پہلے ایسا حال نہ تھا۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر و سخن سُن لیتے تھے؛ مگر جب تک کوئی شعر اُن کے دل میں نہ چُبھتا تھا ٹس سے مس نہوتے تھے۔ اُنکے بعض معاصرین اِس بات سے آزردہ رہتے تھے؛ اور اسی لئے اُنکی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر۔ مرزا باوجودیکہ اُن کی طبیعت نہایت صلح جُو واقع ہوئی تھی۔ شعر کی داد دینے کا جو طریقہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا اُسکو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعر اُن کے دل میں چبھ جاتا تھا اُسکی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ذوقِ سخن اُن کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق جنکی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی۔ ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علیخاں مرحوم نے اُنکا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے　　　مر کے بھی چَین نہ پایا تو کدھر جائینگے

خانِ مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اِسکی بھنک پڑگئی فوراً شطرنج چھوڑدی اور مجھسے کہا بھیّا تُمنے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سُنکر نہایت متعجب

ہوے؛ اور مجھسے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں اِس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اِس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اِسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اِسکی بہت تعریف کی اور یہ کہا ''کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجکو دیدیتا''۔ اِس شعر کو بھی اُنھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اِسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے

دکھلائیے لیجاکے تجھے مصر کا بازار　　　لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اِس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اُسپر وجد کرتے تھے۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں　　　اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اِس قدر متاثر ہوتے تھے کہ اُنکی تعریف میں شاید اُنکا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھکر اُسکی بے انتہا تعریف کی؛ اور یہ کہا ''کہ اگر میں اب رشک کرنیکے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد''

مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں۔ اور۔ جیسا کہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقۃ بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو اور ترنج و مرنجاں واقع ہوئی تھی وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے؛ مگر تقریظ نگاری کا اُنھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہو اور صاحبِ کتاب خوش بھی ہو جاے۔ بہت سا حصہ تمہید میں، یا مصنف کی ذات اور اُسکے اخلاق، یا اُسکی محبت اور دوستی کے بیان میں، یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو محل

نهوں۔ ختم ہوجاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہوتے تھے، اور مصنف کے خوش کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے، لکھدیتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے تھے کہ آپ نے ستائش میں مضائقہ کیا ہے۔

تقریظ دیوان تفتہ

جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے دیوان کی تقریظ۔ جو کلیاتِ نثرِ غالب میں موجود ہے۔ لکھکر بھیجی تو اُنھوں نے بھی اسی قسم کی شکایت کی تھی۔ مرزا اُنکے جواب میں لکھتے ہیں ”کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھکو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کروں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤگے، اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُن کی مدح کتنی ہے؟ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ انطباعِ دیوانِ حافظ کی۔ جان جاکوب بہادر کی فرمائش سے لکھی ہے اُسکو دیکھو، کہ فقط ایک بیت میں اُنکا نام اور اُنکی مدح آئی ہے اور باقی نثر میں اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُسکی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہمکو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصۂ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اُسکے عوض ایک فقرہ اور لکھدیا ہے۔ اس سے زیادہ مبالغہ میری روش نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے۔ کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانینگے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔

تقریظ آئین اکبری

(سر) سید احمد خاں نے جب نہایت جانفشانی اور عرقریزی سے آئینِ اکبری کی تصحیح کی تو دلّی کے

مشاہیر نے اُسپر نثر میں تقریظیں لکھی تھیں، اور مرزا نے نظم میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ جو اُنکے کلیات میں موجود ہے۔ باوجودیکہ مرزا کو سرسید کی خاطر بہت عزیز تھی، اور وہ اُن سے اور اُنکے خاندان سے مثل یگانوں[†] کے ملتے تھے، مگر چونکہ مرزا۔ ابوالفضل کی طرزِ تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے، اور جو آئین اُس کتاب میں لکھے ہیں اُنکو اس زمانے کے آئینوں کے مقابلے میں ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے، اور تاریخ کا مذاق جیسا کہ خود اُنھوں نے اعتراف کیا ہے بالکل نرکھتے تھے اس لئے آئینِ اکبری کی تصحیح کو اُنھوں نے ایک فضول کام سمجھا۔ گو اُنکی یہ راے غلط ہو یا صحیح۔ مگر جو کچھ آئینِ اکبری اور اُسکی تصحیح کی نسبت اُن کا خیال تھا اُسکو تقریظ میں ظاہر کئے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ اُس مثنوی کے اوّل کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب — یافت از اقبالِ سید فتح باب

دیدہ بینا آمد و بازو قوی — کہنگی پوشید تشریفِ نوی

دیں کہ در تصحیحِ آئیں راے اوست — ننگ و عارِ ہمتِ والاے اوست

دل بہ شغلے بست و خود را شاد کرد — خود مبارک[*] بندہ آزاد کرد

گوہرش را آنکہ نتواند ستود — ہم بدیں کارش ہمی داند ستود

بر چنیں کارے کہ اصلش ایں بود — آں ستاید کش ریا آئیں بود

من کہ آئینِ ریا را دشمنم — در وفا اندازہ دانِ خود منم

[†] مرزا آثار الصنادید کی تقریظ میں سرسید کی نسبت لکھتے ہیں ”با ہمگنانش ولیست از فرزانگی بآئین بردمی دانا، وبا منش پایۂ مہرت ز دلنشینی بہ پیوند خون ما نا“

[*] مبارک بندہ آزاد کردن عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ اِسمیں لطف یہ ہے کہ ابوالفضل کے باپ کا نام مبارک تھا۔

گر بدیں کارش نگویم آفریں　　جاے آں دارد کہ جویم آفریں

اسکے بعد انگریزوں کے آئین وقانون وایجادات کسی قدر بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ان چیزوں کے سامنے پچھلے آئین سب تقویم پارینہ ہوگئے ہیں اسکے بعد لکھتے ہیں

طرزِ تحریرش اگر گوئی خوش ست　　نے فزوں از ہرچہ می جوئی خوش ست

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است　　گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است

مبدأ فیاض را مشمر بخیل　　نوز* می ریزد رطب ہا زاں نخیل

مردہ پروردن مبارک کار نیست　　خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

غالب آئینِ خموشی دلکش ست　　گرچہ خوش گفتی نگفتن ہم خوش ست

در جہاں سید پرستی دینِ تست　　از ثنا بگذر دعا آئینِ تست

ایں سراپا فرّہ و فرہنگ را　　سید احمد خانِ عارف جنگ را

ہرچہ خواہد از خدا موجود باد　　پیشکارش طالع مسعود باد

چونکہ اس تقریظ میں آئینِ اکبری کی تنقیص کی گئی تھی اور سر سید نے جو ایک نہایت مفید کام کیا تھا اُسکی کچھ داد نہیں دی گئی تھی بلکہ اُسکو غیر مفید ظاہر کیا گیا تھا اس لئے اُنھوں نے آئینِ اکبری کے آخر میں مرزا کی تقریظ کو نہیں چھپوایا۔

مرزا کی دراکی اور عالی فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ۔ باوجودیکہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلف کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اپنے فن میں محققانہ

* نوز: ہنوز ۱۲

* اپنی شاعری اور انشا پردازی کی طرف اشارہ ہے ۱۲

چال چلتے تھے؛ اور اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جامع برہانِ قاطع کی شہرت اور ناموری اُنکو اُسکا تخطیہ کرنے سے مانع نہیں ہوئی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یزداں دلِ دانا وچشمِ بینا بہرآں دادہ است کہ کارِ دانش وبینش ازیں ہر دو گوہر پُر فر گیریم؛ وہرچہ بنگریم جز بدستوریِ دانش آں را نپذیریم۔ اُستادی وشاگردی پیری ومریدی نیست کہ تنہا اعتقاد بس باشد؛ وبدیں کلمۂ مشہور کہ "پیرمن خس ست واعتقادِ من بس ست" از بازپرس ایمنی روے دہد" حالانکہ وہ ایران کے نامور شعرا کا نہایت ادب کرتے تھے اور اُنکا ذکر ہمیشہ تعظیم اور احترام کے ساتھ کرتے تھے؛ پھر بھی اندھوں کی طرح اُنکی تقلید نہ کرتے تھے۔ جو امور سماع اور نقل سے علاقہ رکھتے تھے اُن میں اُن کے کلام کو بےچون وچرا تسلیم کرتے تھے، مگر جو باتیں عقل اور درایت سے تعلق رکھتی ہیں اُن میں اُنکی تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ ایک خط میں حزیں کا۔ جسکو وہ بہت بڑا اُستاد جانتے تھے۔ یہ مطلع نقل کرتے ہیں "زِ ترکتازیِ آں نازنیں سوار ہنوز؛ زِ سبزہ می دمد انگشتِ زینہار ہنوز" پھر لکھتے ہیں کہ اس مطلع میں ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے؛ متتبع کے واسطے سند نہیں ہوسکتا، یہ غلط محض ہے، یہ ستم ہے، یہ عیب ہے، اسکی کون پیروی کریگا۔ حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اسکو سند نہ جانو؛ اور اسکی پیروی نہ کرو۔ ایک خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے، کیا آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟

مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا، یا کوئی عمدہ تصرّف اُنکے شعر میں کرتا تھا؛ اُسکو فوراً تسلیم کرلیتے تھے؛ اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔ مثنوی درد و داغ میں اُن کا ایک مصرعہ تھا "در خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد"، جب مرزا نے یہ مثنوی تحفۂ ناطقِ مکرانی کو بھیجی تو اُس نے مرزا کو

لکھا "خوک سُم دارد نہ پنجہ اگر نزدیک اساتذہ اطلاق سُم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود" مرزا نے اسکے جواب میں صاف لکھبھیجا کہ اگر کلیاتِ فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہونچ جاتا تو میں اس لفظ کو بدل ڈالتا، اور اس مصرع کو اس طرح بنا دیتا "خوک شد و بہ نفسی ساز کرد"۔ چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا تو اُنھوں نے یہ مصرعہ اسی طرح بنا دیا۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے۔

ہمچناں در تتقِ غیب ثبوتے دارند | بوجودے کہ ندارند زخارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھسے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سُنایا تو اُنھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اسکی جگہ ثبوت بنا دو، چنانچہ طبع ثانی میں اُنھوں نے بجاے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے اسیطرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرعہ یہ ہے

عیدِ اضحےٰ بسرآغازِ زمستاں آمد

مرزا نے اول عیدِ قرباں لکھا تھا پھر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے کہنے سے عیدِ اضحےٰ بنایا گیا۔ حالانکہ نوابِ موصوف خود مرزا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مومن مرحوم کے بعد ہمیشہ اُنھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں ہیں بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جسکے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کرسکتا مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی اُن کا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔

حالانکہ ایشیائی شاعری۔ جسکی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے۔ مرزا کی رگ و پے میں

سرایت کرگئی تھی باوجود اسکے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے۔ اسی لئے جو شخص اُنکے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفضل حسین خاں مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اُسکو دیکھکر واپس بھیجدوں گا۔ اُنھوں نے دیوان کے دینے سے انکار کیا ہے۔ اُن کے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دس روپیے کی! سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو؛ تمکو مبارک رہے؛ مجھکو مستعار دو؛ میں اُسکو دیکھ لوں؛ جو میرے پاس نہیں ہے اُسکی نقل کروں؛ پھر تم کو واپس بھیجدوں؛ اس طرح کی طلب پر ندینا دلیل اسکی ہے کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو؛ میرا اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھکو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ باللہ واللہ میں اُسمیں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کرکے بھیجدونگا۔ اگر تمکو واپس نہ دوں تو مجھپر لعنت، اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تمکو آفریں"

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں

"بدست مرگ دلے بدتر از گمانِ تونیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا؛ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون سی رباعیاں مانگتے ہو؛ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج؛ معنی اسکے یہ کہ تو جھوٹا ہے؛ ابکے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم؛ انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی

قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اُستا کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں ؎

بہ ہمانم کہ ہستیم و ہمماں خواہد بود"

مرزا کی اسی راستبازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں بھی کرتے تھے۔ پس اگر اُن میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا جسکو ہر کس و ناکس جانتا تھا؛ مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے

ناقدردانی کی شکایت

وہ اِس خیال سے کہ اُن کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اِس بات کی اُنھوں نے فارسی اور اُردو نظم و نثر میں جابجا شکایت کی ہے ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر آئے؛ اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے ہماری بڑی قدردانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھکر لے گیا تھا؛ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو" اِسکے بعد نوابصاحب اور مرزا زمانے کی ناقدردانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔

مہر نیمروز میں اِس مضمون کو کہ میں نے اپنا کمالِ شاعری محض ناقدردانوں کی مدح سرائی میں صرف کیا وہ ایک جگہ اِس طرح بیان کرتے ہیں "سینۂ من نفسے داشت بہ رواں آسائی نسیمے کہ از نسترن زار وزد؛ زیاں زدہ۔ من۔ کہ دم جز بہ نابالیست نہ زدم۔ بنانِ مرا تلمے بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد؛ بیہدہ کوش۔ من۔ کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم" یہی وجہ تھی کہ جب حسنِ اتفاق سے اُن کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آ جاتا تھا تو اُسکو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر تخلص۔ جو ایک زمانے میں کول میں سررشتہ دار تھے، اور جنکی سخن فہمی اور سخن سنجی کی

سخن فہمی کی قدر

منشی نبی بخش حقیر کی تعریف

بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے۔ کہیں وہ دلّی میں آئے ہیں؛ اور مرزا کے مکان پر ٹھیرے ہیں اُن کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جسکا ماحصل یہ ہے کہ "خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا؛ اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم، اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا؛ اور جسنے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اُسنے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی۔ جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی۔ دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اِس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے؟ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں؛ مگر جب تک میں نے اِس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کسکو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حُسن کے دو حصّے کئے؛ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصّے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصّے میں آیا ہو گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اِس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بیفکر ہوں؛ اور اِس نعمت پر دنیا سے قانع۔

مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو اُن سے باسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی تو وہ اِس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئیگا؛ بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اِس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سید الشہدا کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا اُنکی بہت تعظیم کرتے تھے اور اُنکے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے اُن کے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ

اِس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا ، اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جسکو اور لوگ حدِکمال تک پہنچا چکے تھے ، اور قوئے میں انحطاط شروع ہوگیا تھا ؛ مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے جنمیں سے پہلا بند ہمکو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو　　　اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو

اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو　　　اے ماتیانِ شۂ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی

اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھکر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیجدیے ، اور صاف لکھ بھیجا کہ "تین بند صرف امتثالِ امر کے لیئے لکھے ہیں ؛ ورنہ میں اِس میدان کا مرد نہیں ہوں ؛ یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اِس وادی میں عمریں بسر کی ہیں ، مجھکو اُن کے درجے تک پہنچنے کے لیئے ایک دوسری عمر درکار ہے ۔ پس مجھے اِس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے " ، اُن کا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آیندہ ہوگا ۔

لطیفہ

بعض اوقات ایسی فرمایشوں سے جنکے سرانجام کرنے میں اُن کو دقت اُٹھانی پڑتی تھی بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے ۔ یہ بات معلوم ہے کہ مادۂ تاریخ نکالنے سے وہ ہمیشہ گھبراتے تھے ۔ ایک بار نواب علاؤالدین خاں مرحوم نے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اُسکے تاریخی نام کی فرمائش کی اُسکے جواب میں لکھتے ہیں ، " شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھِلاتا ہے ؛ طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے جب جوان ہوجاتے ہیں آپ شکار کرکھاتے ہیں ۔ تم سخنور ہوگئے ، حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو ، ولادتِ فرزند کی

تاریخ کیوں نہ کہو ؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو ؟ کہ مجھ پیر غمزدہ دل مُردہ کو تکلیف دو ۔ علاؤالدین خاں ! تیری جان کی قسم !! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کردیا تھا ، اور وہ لڑکا نہ جیا ؛ مجھکو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی ۔ میرا ممدوح جیتا نہیں ؛ نصیرالدین حیدر ، اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے ۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوے ؛ پھر نہ سنبھل سکے ۔ جسکی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا ۔ نا صاحب دُہائی خدا کی ! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا ، نہ نام تاریخی ڈھونڈھونگا ۔ "

باوجودیکہ مرزا کی تمام عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گذری ، اور اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مدح ستائش کا صلہ اُن کو کچھ نہیں ملا ، اور جو محنت اور کاوش اُن کو قصیدوں کی ترتیب میں کرنی پڑی وہ سب رائگاں گئی ؛ مگر اُنھوں نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ کبھی نہیں لکھا ۔ صرف ایک قطعہ جو مرزا کے مطبوعہ کلیات میں درج نہیں ہے ۔ ہمکو اُن کے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے ۔ جو میرے دوست اور مرزا صاحب کے عزیز شاگرد لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی نے اس کتاب کے لکھتے وقت میرے پاس بھیجے ہیں ۔ اس قطعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا ہے ، اور اُسکا جواب مدتِ دراز تک مرزا کو نہیں ملا ؛ تب مرزا نے بطور تقاضے کے یہ قطعہ بھیجا ہے ۔ جسکو مشکل سے ہجوِ ملیح کہا جاسکتا ہے ۔ چونکہ اِس قطعہ کا مضمون لطف سے خالی نہیں اِس لیئے ہم اوّل اُسکا خلاصہ اُردو زبان میں لکھتے ہیں ؛ اسکے بعد قطعہ بجنسہ نقل کیا جائیگا ۔

قطعہ کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے عقل سے پوچھا کہ میں نے ایسا اور ایسا قصیدہ نواب کی خدمت میں

بھیجا تھا، اور اُسکے ساتھ عرضداشت بھی گذرانی تھی، پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟ کیا نواب مجھسے آزردہ ہوگیا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی۔ خدا جانے میں نے کیا لکھدیا ہوگا جسپر نواب کو آزردگی ہوئی۔ عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے؟ نواب جس ساز و ساماں کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہوسکتا۔ اُسنے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے سانڈنی، اصفہاں سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت، یہ سب چیزیں فراہم کرکے لائیں، تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جبکہ یہ ساری ڈھیل اس وجہ سے ہے تو اُسکو نواب کی آزردگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ جب عقل نے مجھکو یہ دم دیا تو میری تمام یاس و ناامیدی امید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لئے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اُسکے لئے آئینہ اور تاج سکندر سے، انگشتری اور تخت سلیماں سے، جامِ جمشید عالمِ غیب سے، آبِ حیواں چشمۂ خضر سے، عمرِ ابد، نشاطِ جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے، اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں،،

قطعہ

گفتم بخرد بخلوتِ اُنس — کاے شمع و چراغِ ہفت ایواں
آیا زچہ رُو بود کہ نواب — ننوشت جواب نامہ ام - ہاں!
آں گونہ عریضہ کہ دانی — درویش نوشتہ سوے سلطاں
آں گونہ قصیدۂ کہ گوئی — از صفحہ دمیدہ سُنبلستاں

ایں ہر دو رسید و نیست پیدا — زاں سو اثرے بہیچ عنواں
رنجیدہ مگر ز مدح نواب — اے کاشکی نہ گشتمے ثناخواں
ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم — از گفتۂ خویشتن پشیماں
عقلم بجواب گفت ،، غالب! — زنہار مخور فریبِ شیطاں
نواب بفکرِ ارمغان است — تا نامہ فرستدت بساماں
دانا کہ بخاطرش گذشتہ است — زودآں ہمہ جمع کرد نتواں
زود است کہ جمع میز گردد — دیر است کہ دادہ است فرماں
تا راہ روانِ بحر و بر گرد — آرند بکوششِ فراواں
دیبا ز دمشق و مخمل از روم — الماس ز معدن و زر از کاں
فیل از دکن و زمرد از کوہ — توسن ز عراق و در ز عُمّاں
فیروزۂ نغز از نشاپور — یاقوتِ گزیدہ از بدخشاں
جمازۂ تیز رو ز بغداد — شمشیرِ بُرندہ از صفاہاں
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر — زربفتِ گراں بہا ز ایراں
بالجملہ درنگ چوں ازیں رو ست — بر ریخ و ملال نیست برہاں
چوں پیرِ خرد بدلفریبی — گفت ایں ہمہ رازہاے پنہاں
گشتم بدمِ امیدواری — مرہم بہ زخمِ یاس و حرماں
گفتم کہ چو با من ایں کرم کرد — آں قبلۂ و قبلہ گاہِ اعیاں

ناچار زراہِ حق گذاری　　تا کردہ شود تلافیٔ آں

من نیز طلب کنم برایش　　ایں خواہش اگرچہ نیست آساں

آئینہ و تاج از سکندر　　انگشتر و تخت از سلیماں

از عالمِ غیب جامِ جمشید　　از چشمۂ خضر آبِ حیواں

عمرِ ابد و نشاطِ جاوید　　نیروے دل و ثباتِ ایماں

توفیقِ جوابِ نامۂ خویش　　توقیعِ عطا و بذلِ احساں

خانگی تعلقات

مرزا کی بی بی - جو الہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں - وہ نہایت متقی پرہیزگار اور نماز روزہ کی سخت پابند تھیں - جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے اُسی قدر اُن کی بی بی احکام مذہبی کی پابند تھیں ؛ یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے - با ایں ہمہ بی بی شوہر کی خدمتگذاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر اُنکے کھانے اور دوا ٹھنڈائی اور جڑا دل وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا - مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقتِ معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے - اور بی بی اور اُن کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے ، اور اپنی جان سے بڑھکر اُن کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا - مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُنکی گھٹی میں پڑی تھی اُنکی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کرسکتا ہے -

ظرافت

کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا ، اور اُسمیں یہ بھی لکھا

کہ اُسکے ننھے ننھے بچے ہیں ؛ اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے ؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو ؟ مرزا اُسکے جواب میں لکھتے ہیں ،، امراؤ سنگھ کے حال پر اُسکے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے - اللہ اللہ !!! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اُنکی بیڑیاں کٹ چکی ہیں ، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے ، نہ دم ہی نکلتا ہے - اُسکو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لونگا ؛ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے ،، وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جدا یا ہزلاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے .

لطیفہ

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا - طوطا سردی کے سبب پروں میں مُنھ چھپائے بیٹھا تھا - مرزا نے دیکھکر کہا ،، میاں مٹھو ! نہ تمھارے جورو نہ بچے ، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو ؟

لطیفہ

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے - ایک مکان آپ خود دیکھکر آئے ؛ اُسکا دیوانخانہ تو پسند آگیا ، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے - گھر پر آکر اُسکے دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا - وہ دیکھکر آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا - اُنھوں نے کہا اِسمیں تو لوگ بلا بتاتے ہیں - مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے ؟

یہاں مرزا کا ایک قطعہ اور ایک رباعی مقتضائے مقام کے موافق لکھی جاتی ہے

قطعہ

گیرم کہ در روزِ حشر چوں تو بہشتی　　بر سرِ دوزخ نمند تیرہ نشیمن
لیک نباشد دراں مضیقِ مصیبت　　در طلبِ نان و جامہ کشمکش از زن
لیک نباشد دراں مقامِ صعوبت　　شورِ تقاضاے نارواے مہاجن

رباعی

اے آں کہ براہِ کعبہ روے داری　　دانم کہ گزیدہ آرزوے داری
زیں گونہ کہ تندی خرامی - دانم　　در خانہ زنے ستیزہ خوے داری

لطیفہ

مرزا اپنی شوخی طبع کے ہاتھ سے مجبور تھے ، اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے -

مرزا الٰہی بخش خانِ معروف۔ جنکے تقدس اور بزرگی کے سبب انکے بڑے بھائی زانوے ادب تہ کرکے انکے سامنے بیٹھتے تھے، اور جو مرزا کے خسر ہونے کے سبب انکے قبلہ و کعبہ تھے۔ ان کے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ وہ لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے، اور جب بہت سے مرید ہوجاتے تھے تو ان کو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھوا کر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اسکی نقل کردو۔ آپ نے شجرہ کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھدیا دوسرا حذف کردیا تیسرا پھر لکھدیا چوتھا پھر ساقط۔ غرضکہ اسیطرح بہت سے حذف و اسقاط کرکے نقل اور اصل جاکر انکے حوالے کی۔ وہ دیکھکر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا؟ مرزا نے کہا حضرت! آپ اس کا کچھ خیال نفرمائیے؛ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے؛ سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دیجائے تو چنداں حرج واقع نہیں ہوتا؛ آدمی ذرا اُچک اُچک کر اوپر چڑھ سکتا ہے۔ وہ سُنکر بہت جز بز ہوئے، اور وہ نقل پھاڑ ڈالی اور کسی اور شخص سے اسکی نقل کرائی؛ اور مرزا ہمیشہ کے لئے اس تکلیف سے چھوٹ گئے۔

مرزا یا تو اسوجہ سے کہ ان کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گذری تھی، اور یا اس لئے کہ ان پر ناملائم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا؛ آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اس سال ضرور مرجاؤں گا۔

۱۲۷۷ہجری میں انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ "غالب مُرد"، اس سے پہلے کئی مادے غلط ہوچکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے اُن سے مرزا صاحب نے اس مادّے کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا حضرت! انشاءاللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔ مرزا نے کہا

"دیکھو صاحب تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو؛ اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مرجاؤں گا"

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اُنکے جواب میں لکھتے ہیں "بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مارسکے تو تف برین وبا!" اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اور حکایتیں اُن سے منقول ہیں۔ جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے۔

مرنے سے کئی کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہوگیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھٹے چھٹے سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی تو پردہ ہوجاتا تھا؛ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے کپڑے اُتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا؛ چوکی پر چڑھنا، چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا، اور پھر چوکی سے اُتر کر پلنگ تک آنا؛ ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا۔ مگر خطوں کے جواب اس حالت میں بھی برابر۔ یا خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے، یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا جاتا تھا۔

مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہوگئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہوجاتا تھا؛ پھر بیہوش ہوجاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوگا اُس سے شاید ایک دن پہلے میں اُنکی عیادت کو گیا تھا؛ اُس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاؤالدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ اُنھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا؛ اُنکے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر۔ جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا"، اور شعر کا

پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا دوسرا مصرع یہ تھا "نکرد ہجر مدارا بمن سر تو سلامت"، مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زباں رہتا تھا "دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے ٭ عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے"

وفات

آخر- ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی، اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ میں اپنے خسر کے پائینِ مزار دفن کئے گئے۔ اُنکی وفات کی تاریخیں جو مدت تک ہندوستان کے اُردو اخباروں میں چھپتی رہیں وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں، صرف ایک تاریخ جسمیں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا- یاد رکھنے کے قابل ہے (یعنی آہ غالب بمرد) جسکو مختلف لوگوں نے مختلف طور پر قطعات میں منتظم کیا تھا- تاریخوں کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک، میر مہدی حسین مجروح، اور مؤلف کتاب ہٰذا نے اُردو میں اور منشی ہرگوپال تفتہ نے فارسی میں، مرزا کے مرثیے بھی لکھے تھے- جو اُسی زمانہ میں چھپکر شائع ہوگئے تھے۔

نمازِ جنازہ

مرزا کے جنازے پر جب کہ دلّی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی- راقم بھی موجود تھا، اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفٰے خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم، اور بہت سے اہلِ سنت اور امامیہ دونو فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرہ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ- مرزا صاحب شیعہ تھے؛ ہمکو اجازت ہو کر ہم اپنے طریقے کے موافق اُنکی تجہیز و تکفین کریں- مگر نواب صاحب نے نہیں مانا، اور تمام مراسم اہلِ سنت کے موافق ادا کئے گئے؛ اسمیں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ اُنکے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا؛ مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سنی دونو ملکر یا علیحدہ علیحدہ اُنکے جنازے کی نماز پڑھتے اور جسطرح زندگی میں اُنکا برتاؤ سنی اور شیعہ دونو کے ساتھ یکساں رہا تھا اسیطرح مرنے کے بعد بھی دونو فرقے اُنکی حق گزاری میں شریک ہوتے۔

مرزا صاحب کے شاگرد اطرافِ ہندوستان میں بیشمار تھے- اُنکی وسعتِ اخلاق اور عام رضا جوئی نے

یہ دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا- جو شخص اصلاح کے لئے اُنکے پاس غزل بھیجتا تھا ممکن نہ تھا کہ وہ اُسکے خط کا جواب اور اُسکی غزل میں اصلاح دیکر نہ بھیجیں- اگرچہ مرزا کی فطرت شاعری میں اپنے طبقے کے لوگوں سے اس قدر بلند واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی شاگرد یا مستفید کو اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے چل سکتے تھے- جیسا کہ اُنھوں نے خود ایک فارسی شعر میں اس مضمون کیطرف اشارہ کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوے ٭ سایہ ہمچون دود بالا میرود از بالِ ما

با اینہمہ اہلِ دہلی و نواحِ دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیضِ صحبت اور مشورۂ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے اُنکے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے؛ جیسے نیر رخشان، عارف، سالک، مجروح، علائی، تفتہ وغیرہم- اِنکے سوا خاص اہلِ دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عرفاً مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے لیکن درحقیقت اُنکے شاگردِ معنوی تھے؛ جیسے نواب مصطفٰے خاں مرحوم جنھوں نے مومن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اُردو مرزا ہی کو دکھایا- یا جیسے سید غلام علیخاں[1] مرحوم متخلص بہ وحشت جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور اُنکی صحبت سے مستفیض رہے تھے- مرزا نے انھیں دونو صاحبوں کی طرف اپنی ایک اُردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے

[1] یہ صاحب دلّی کے ممتاز لوگوں میں تھے اُنکے والد کا نام سید فرحت اللہ خاں تھا اور مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے قطع نظر علم و فضل کے اُردو اور فارسی دونو زبانوں میں نہایت خوش بیان اور شعر کا مذاق اعلےٰ درجے کا رکھتے تھے اول سرکارِ انگریزی میں ملازم رہے پھر الور میں فوجدار ہوگئے پھر لکھنؤ میں نواب سعید الدولہ مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کہ اُن سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے ایک معزز خدمت پر ممتاز ہوگئے وہاں سے پھر الور چلے آئے تھے اور غدر تک وہیں رہے غدر کے بعد اخیر عمر تک سررشتہ تعلیم میں منسلک رہے اور نواب مصطفٰے خاں مرحوم اُنکی ہر حال میں مدد کرتے رہے ۱۲

"وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید　　　مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں"

لطیفہ

یہ دونو صاحب باہم گر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے ؛ یہاں تک کہ اُنکی دوستی عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی. ایک دفعہ جبکہ راقم بھی جہانگیر آباد میں موجود تھا سید غلام علی خاں مرحوم نواب صاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی اُن کا یہاں آنا سن لیا تھا۔ انھیں دنوں میں مرزا کا خط نواب صاحب کے نام آیا، اُسمیں خاں صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں خواجہ حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اس طرح بدل کر لکھا تھا

"چو با حبیب نشینی و چائے پیمائی　　　بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را"

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سُنکر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اس قدر لطف نہ تھا جیسا کہ اِس موقع پر مرزا صاحب کے اِس تصرف سے اُسمیں لطف† پیدا ہو گیا۔

مرزا صاحب کے اُن شاگردوں کا حال جنکے نام کے بہت سے خطوط اُردوئے معلّیٰ اور عودِ ہندی میں مرزا کے لکھے ہوئے موجود ہیں یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں ؛ اس لئے ہم صرف دو صاحبوں کا مختصر ذکر اس مقام پر لکھتے ہیں ایک نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور دوسرے نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کہ غالباً اِن دونو بزرگوں میں سے کسی کے نام کا کوئی خط مرزا کے اُردو مکاتبات میں نہیں ہے جس سے اُن کی خصوصیت مرزا صاحب کے ساتھ خاص و عام کو معلوم ہو۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں

نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ جو فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ قطع نظر کمال شاعری و انشا پردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علم انساب، علم اسماے رجال تحقیق لغات

† یعنی نواب صاحب تو شراب سے مجتنب تھے اور مرزا پیتے تھے اس لئے انکی نسبت چائے پیمائی اور اپنی نسبت بادہ پیما کا لفظ کہا۔

اور جنرل انفورمیشن (عام واقفیت) میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے. اگرچہ اُنھوں نے فنون مذکورہ میں کوئی مستقل تصنیف اپنے نام سے نہیں چھوڑی ؛ لیکن اکثر مصنفین اُن سے مدد لیتے تھے اور جو مشکل پیش آتی تھی اُسمیں اُن سے مشورہ کرتے تھے ؛ خصوصاً الیٹ صاحب نے جو ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی ہے اُسکی تصنیف و ترتیب میں نواب ممدوح نے بے انتہا مدد پہنچائی تھی جسکا مصنف نے اپنی کتاب کے دیباچے میں خود اعتراف کیا ہے۔

چونکہ نواب ممدوح اہلِ کمال کے عاشق تھے اور خاصکر مرزا صاحب سے اُنکی حقیقی چچازاد بہن منسوب تھیں اس لئے مرزا کے ساتھ اُنکو خاص تعلق تھا. وہ فارسی اور اُردو دونو زبانوں میں فکر شعر کرتے تھے ؛ مگر زیادہ تر فارسی نظم و نثر لکھتے تھے اور مرزا کے قدم بقدم چلتے تھے.

مرزا نے جو ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب ممدوح کی شان میں لکھا ہے اور جسمیں اُنکا اُستاد ہونے پر فخر کیا ہے اُسکے کچھ اشعار مختلف مقامات سے التقاط کرکے یہاں لکھے جاتے ہیں

صد آفتاب تواں ساختن بہ بازیچہ　　　ز ذرہ کہ بود در ضیائے نیّرِ من
نہ ایں سپہر و نہ ایں مہر عالمے دگر ست　　　من آسمانم و او مہرِ نور گسترِ من
من آں سپہر کہ دانم۔ چنانکہ مہر بماہ　　　بہ مہر نور دہد نیّرِ منوّرِ من
من آں سپہر کہ ہر دم رسد عطیۂ فیض　　　بہ سعدِ اکبرِ گردوں ز سعدِ اصغرِ من
منم خزینۂ راز و درِ خزینہ براز　　　ضیائے دینِ محمدؐ کہ ہیں برادرِ من
بدین و دانش و دولت یگانۂ آفاق　　　بعمر کہتر و از روے رتبہ مہترِ من
بہ مہر دل بہ برادر دہم۔ نہ یعقوبم　　　کہ بود خویش بود دلستان و دلبرِ من

نواب محمد مصطفیٰ خاں

سخن سرائے نوآئیں نوائے را نازم — بنالہ ہمنفسِ من بہ شور ہمسرِ من

بہ نکتہ شیوۂ شاگردِ من بہ من ماناست — صنم بصورتِ خود مے تراشد آزرِ من

اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم — بود بپایہ ارسطوے من سکندرِ من

زمینِ کوے مرا آسماں کند ہر صبح — طلوعِ نیّرِ رویش ز طرفِ منظرِ من

اگر شوم بہ مثل آتشے شرارہ فشاں — شود بقاعدۂ ہمدمی سمندرِ من

بہ بحر گر فتدم رہ۔ بود سفینۂ من — بہ تخت گر بودم رای۔ گردد افسرِ من

بہ مہرِ دوست وہم دل۔ نشاطِ خاطرِ من — بہ کینِ خصم نہم رُخ۔ لوائے لشکرِ من

گرم ز غصہ تبہ گشتہ کار۔ مونسِ من — ورم ز کار فرو ماندہ دست۔ یاورِ من

زہے ز روے تو پیدا فروغِ دانش و دا — بدیں فروغ۔ جہانتاب گشتہ اخترِ من

ز تو کہ آئنۂ فیضِ صحبتِ آوئی — ہواے دیدنِ غالب فتادہ در سرِ من

مرا ستودی[1] و گفتی کہ من از آنِ توام — فداے آنِ تو بادا اقل و اکثرِ من

سعادت و شرف چون منے بعرضِ کمال — نہ بس بود کہ بود چوں توئے ثناگرِ من؟

نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے اُنھیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے لیکن خانِ موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونو زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہو تو مرزا کے بعد اُنکے معاصرین میں سے

[1] معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے مرزا کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا تھا جسکی طرف اِن دونو بیتوں میں اشارہ ہے ۱۲

کسی کی فارسی غزل اُنکی غزل سے لگّا نہیں کھاتی تھی اور شعر کا جیسا صحیح مذاق اُنکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے لوگ اُنکے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ اُنکے سکوت سے شاعر کا شعر خود اُسکی نظر سے گرجاتا تھا اور اُن کی تحسین سے اُسکی قدر بڑھجاتی تھی۔ یہی وہ شخص تھے جنکی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او — ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد (یعنی پسند نکرد)

نواب ممدوح کی شان میں بھی مرزا کا ایک فارسی قصیدہ اُنکے دیوان میں موجود ہے جس میں اوّل فخریّہ تشبیب لکھی ہے فخریہ اشعار لکھتے لکھتے کہتے ہیں

دست رد بہ تاجِ قیصر مے نہم — پشت پا بر تختِ خاقاں مے زنم

خُردہ مے گیرند بر من قدسیاں — گر نفس در مدحِ سلطاں مے زنم

آں ہماے تیز پروازم کہ بال — در ہواے مصطفیٰ خاں مے زنم

عرفی و فا تحانیش قرباں پذیر — سکہ در شیراز و تہراں مے زنم

او خرامد مست و من چاؤش وار — بانگ بر اجرام و ارکاں مے زنم

گلشنِ کویش گذرگاہِ من ست — دوش در رفتن بہ رضواں مے زنم

خوبیِ خویش بد آموزِ من ست — دم ز یاری مے زنم ہاں مے زنم

مہرورزی بیں کہ با شمع ہمنشیں — من کہ زانو پیشِ دریاں مے زنم

بشنو دیے آنکہ باد آں را برد — نالہ گر در کنجِ زنداں مے زنم

بنگر دیے آنکہ کلک آں را کشد — نقش گر بر صفحۂ جاں مے زنم

دوسرا حصّہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اُسکا انتخاب

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مُردہ زبان کے ہوگئی ہے اور ذوقِ شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے۔ ایک نہایت مشکل کام ہے مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ اُنکی فارسی نظم و نثر ہے. لیکن اوّل تو فارسی زبان سے مُلک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے؛ دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل ناآشنا ہیں. پس جو شخص اِس زمانے میں اُن کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکے ذریعے سے مصنّف کی حقیقت اور اُسکا رتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جسمیں کامیابی کی بہت ہی کم امید ہوسکتی ہے. لیکن اگر کچھ امید ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جاے؛ نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کرکے اُس سے ہاتھ اُٹھا لیا جاے.

دفعِ غم نیست جز بغم خوردن — چارۂ کار نیست جز کردن

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ اُنکی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا. اُنھوں نے۔ جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا. اُسی زمانے میں اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کئے تھے؛ جنکی ردیف میں کہ چہ بجاے یعنی چہ کے استعمال کیا تھا. جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے اُستاد شیخ معظّم کو سُنائے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؛ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں. مرزا یہ سُنکر خاموش ہو رہے۔ ایک روز مُلّا ظہوری کے کلام میں ایک شعر اُنکی نظر پڑ گیا جسکے آخر میں لفظِ کہ چہ یعنی چہ کے معنی میں آیا تھا. وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے اُستاد پاس گئے اور وہ شعر دکھایا شیخ معظّم اُسکو دیکھکر حیران ہوگئے؛ اور مرزا سے کہا تمکو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے؛ تم ضرور فکرِ شعر کیا کرو؛ اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو.

مرزا کو جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو برس کی عمر میں چھوڑا تھا. چچا کے بعد کوئی مربّی و سرپرست اِنکے سر پر نہ تھا. مرزا کی ننھیال جہاں اُنھوں نے

۱؎ منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہمعصر تھے ایکبار دلّی میں آئے اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثنائے کلام میں اُنکو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپکو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لاکر دی اور وہ اُسکو دیکھکر بہت خوش ہوئے اُسکے آخر میں یہ فارسی شعر کسی اُستاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔ "رشتۂ در گردنم افگندہ دوست — مے کشد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"۔ لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی۔"

پرورش پائی تھی بہت آسودہ حال تھی اور ننھیال کی ثروت سے ظاہرا مرزا اور اُنکے بھائی سے بڑھکر کوئی فائدہ اُٹھانے والا نہ تھا۔ آغازِ شباب میں جبکہ سر پر کوئی مربی نہو۔ دولت و آسودگی سے زیادہ کوئی چیز خانہ برانداز نہیں ہوسکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اُس آسودگی نے وہ کام کیا جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گذری ہے اُسکی کیفیت کا خود اُنھیں کے الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اِس طرح ظاہر کرتے ہیں "باخرد و فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگان ہمنشیں، و با اوباش ہمرنگ، پاے بیراہہ پوے، و زباں بے صرفہ گوے، در شکستِ خویش گردوں را دستیار، و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار،" اِسکے بعد لکھتے ہیں "تیزیِ رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد،" الغرض مرزا کا لڑکپن اور اُنکی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں جسکا نہ کوئی قدرداں نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلےٰ درجے کا کمال ہم پہونچانا تو درکنار؛ اُس کا خیال بھی دل میں گذرنا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ صرف اُنکی طبیعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اُس غفلت و بدمستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری کی تکمیل کا خیال ایسی بےخبری کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

دیوانِ اردو

مرزا نے گُلِ رعنا[1] کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا اِس لئے ہم بھی پہلے اُنکے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر

[1] مرزا نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمایش سے اپنے تمام اُردو اور فارسی دیوان کا انتخاب کیا تھا جس کا دیباچہ اُنکے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے اُسکا نام گلِ رعنا رکھا تھا۔

کہنا شروع کیا تھا قطع نظر اِسکے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس روش کا اندازہ اِس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی[†] نے جو مرزا کے ہم وطن تھے اُنکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ "اگر اِس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُسنے اِسکو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بنجائیگا؛ ورنہ مہمل بکنے لگے گا"

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر مُلا عبد الصمد کی تعلیم کے سبب۔ فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُنکی قوتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

"طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے"

یہاں بطور نمونہ کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

(۱) کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابیہاے دل گردوں*   نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرون قالبہا

[†] مرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی اِس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ مرزا کے اشعار اُنکے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والد ناظر حسین مرزا صاحب نے میر تقی کو دکھائے تھے۔

* یہ شعر مرزا نے اپنے دیوانِ ریختہ میں سے تو نکال ڈالا مگر دیوانِ فارسی میں بتغییرِ الفاظ داخل کر دیا یعنی اِس طرح "کند گر فکرِ تعمیرِ خرابیہاے ما گردوں ÷ نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالب ہا"

(۲) اسد ہر اشک ہے اک حلقہ بر زنجیر افزودن — بہ بندِ گریہ ہے نقش بر آب امید رستن ہا

(۳) بحسرتگاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں — خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

(۴) رکھا غفلت نے دُور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ — اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا

(۵) پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش — خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا

(۶) موسمِ گل میں مےِ گلگوں حلالِ میکشاں — عقدِ وصلِ دخترِ رز انگور کا ہر دانہ تھا

(۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا — گو نیا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

چونکہ مذکورہ بالا شعروں میں۔ قطع نظر اسکے کہ طرزِ بیان اُردو بول چال کے خلاف ہے۔ خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی ؛ اِس لئے ان کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے یہاں بطور نمونے کے شرح کیجاتی ہے ؛ تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشقِ سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ نئی نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذّت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اُس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لئے ہر ایک ناخن۔ جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابرو کا کام دیتا تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ وایما کرنا ؛ اور ناخنِ بُریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے وہ بھی فنا کی لذّت کی طرف اشارہ کرتا تھا ؛ کیونکہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے لذّت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اوپر کی سات بیتیں ہمنے مرزا کے اُن نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو اُنھوں نے اپنے دیوانِ ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اُسمیں سے نکال ڈالی تھیں۔ مگر اب بھی

اُن کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جیسے ذیل کے اشعار جو اب دیوان میں موجود ہیں۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

شب خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورتخانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھُلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

اِن اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اسمیں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کئے ہونگے۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دُکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دُکھا ہوگا ؟ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار۔ جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے۔ اُنکے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار اُنکی نظر میں کھٹکے ہوں ؛ مگر چونکہ دیوان چھپکر شائع ہو چکا تھا اِس لئے اُنھوں نے اِن اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اُسکی دونوں شقیں اُنکے حق میں پوری ہوئیں ظاہر ہے کہ مرزا اوّل اوّل ایسے رستے پر پڑ لئے تھے کہ اگر استقامتِ طبع، اور سلامتِ ذہن، اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک، اور نکتہ چین ہمعصروں کی خردہ گیری اور طعن و تعریض سدِّ راہ نہوتی تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دُور جا پڑتے۔ سُنا گیا ہے کہ اہلِ دہلی مشاعروں

میں۔ جہاں مرزا بھی ہوتے تھے۔ تعریضاً ایسی غزلیں لکھکر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پُرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں ؛ مگر معنی ندارد ؛ گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

ایک دفعہ مولوی عبد القادر رام پوری نے۔ جو نہایت ظریف الطبع تھے۔ اور جنکو چند روز قلعۂ دہلی سے تعلق رہا تھا۔ مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آتا ؛ اور اُسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے

"پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال — پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال"

مرزا سُنکر سخت حیران ہوئے ؛ اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبد القادر نے ازراہِ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے ؛ اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھپر اِس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں ؛ اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اِس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اِس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو اور فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں

"نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے

"گر خامشی سے فائدہ اخفای حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے"

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حالِ دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی

خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے ؛ کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرۃً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اِس لئے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے اُنکو بہت تنبّہ ہوتا تھا ؛ اور آہستہ آہستہ اُن کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اِسکے سوا جب مولوی **فضل حق** سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا اُنکو اپنا خالص مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو اُنھوں نے اِس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی ؛ یہاں تک کہ اُنھیں کی تحریک سے اُنھوں نے اپنے اُردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا ؛ اور اُسکے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبولِ خاص و عام نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادہ اور صاف کلام سُننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے اُنھیں کو جب اہلِ زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو اُنکو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ اِدھر قائل کے مُنہ سے نکلا اور اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا ؛ مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروفِ ربط اور توابع فعل۔ جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اُنکو مرزا اُردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے

جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں ۔ مثلاً اُنکے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے

"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ   اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے"

میں نے خود اِس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا کہ اے کی جگہ جُز پڑھو ؛ معنی خود سمجھ میں آجائیں گے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری - جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ - اور بلبل - جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں - اُنکے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُنکے چہکنے اور کوکنے سے ہوتا ہے ۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہرا یہ اُنھیں کا اختراع ہے ایک شخص نے یہ معنی سُنکر کہا کہ "اگر وہ اے کی جگہ جُز کا لفظ رکھدیتے یا دوسرا مصرعہ اِسطرح کہتے "اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے" تو مطلب صاف ہوجاتا" اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تابمقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اِس لئے وہ بہ نسبت اِسکے کہ شعر عام فہم ہوجائے اِس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے ۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اِسمیں شک نہیں کہ اِس سے اُنکی اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سُراغ ملتا ہے اور یہی اُنکی ٹیڑھی ترچھی چالیں اُنکی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں ۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگ ڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھیں بند کرکے گلّے کے پیچھے پیچھے ہولیں ؛ اور لیک کے اِدھر اُدھر آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُسمیں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِمو تجاوز

نہ کریں ، اور اُنکے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں ۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُنکی قدرت سے باہر ہوتا ہے ۔

برخلاف اِسکے جنکی طبیعت میں اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادّہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر اُنکو مجبور نہیں ہونے دیتی ۔ اُنکو قوم کی شاہ راہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھُلی نظر آتی ہیں ۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اُسپر چلنے سے اُنکی طبیعت اِبا کرتی ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزلِ مقصود تک پہنچانے والا نہو ، مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ داہنے بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہو جائیں عام رہگیروں کی طرح آنکھیں بند کرکے شارعِ عام پر پڑ جائیں ۔

مرزا کی طبیعت اِسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے ۔ وہ خستت شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے ۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے ۔

لطیفہ

ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلّی میں آئے تھے مرزا کے ایک شعر کی اُنکے سامنے نہایت تعریف کی ۔ مرزا نے کہا ارشاد تو ہو وہ کونسا شعر ہے ؛ اُنھوں نے میر امانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا

"اسد اِس جفا پر بتوں سے وفا کی   مِرے شیر شاباش رحمت خدا کی"

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا اُنھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالبؔ کا شعر ہے ۔ مرزا یہ سُنکر بہت چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اُسکو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی ۔

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اسلیئے ناگوار گذرا ہوگا کہ مرے شیر اور رحمت خدا کی یہ دونو محاورے زیادہ تر عامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں؛ اور اسد کی رعایت سے مرے شیر کہنا یہ بھی اُنکی طبیعت کے خلاف تھا؛ کیونکہ وہ ایسی مبتذل رعایتوں کو جو ہر شخص کو بآسانی سوجھ جائیں۔ مبتذل جانتے تھے.

اس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری میں بلکہ وضع میں، لباس میں، طعام میں، طریق ماند و بود میں، یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نکرتے تھے. یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے.

مرنے سے آٹھ سات برس پہلے اُنھوں نے ایک مادۂ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا۔ جس میں ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے. اتفاق سے اُسی سال شہر میں وبا آئی؛ مگر مرزا بچ گئے. اس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی (یعنی اسی سنہ میں مجھے مرنا چاہئے تھا) مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا؛ واقعی اسمیں میری کسرِ شان تھی. بعد رفع فساد ہوا کے سمجھ لیا جاویگا" اگرچہ محض ایک ہنسی کی بات لکھی ہے؛ مگر اُنکی طبیعت کا اقتضا اس سے صاف جھلکتا ہے. اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جسکو یہ خط لکھا ہے وہ اُنکی اس خصلت سے خوب واقف ہے.

بہرحال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہ روی سے خبردار ہوئے. اور استقامتِ طبع اور سلامتیٔ ذہن نے اُنکو راہِ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا. گو اُن کا ابتدائی کلام جسکو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے مقبول نہوا؛ مگر۔ چونکہ قوتِ متخیلہ سے

بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اس لئے اُسمیں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی۔ جب قوتِ ممیزہ نے اُسکی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُسنے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے.

یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا؛ بلکہ محض تفننِ طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُپج سے، کبھی دوستوں کی فرمایش سے، اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لئے، ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدرِ معتدبہ نہیں پائی جاتی. وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو؛ اور میں شرماتا ہوں. یہ غزلیں کاہیکو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں. میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا. اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرتِ ظلِ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔ یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہکر لیجاتا ہوں"

قطع نظر اِسکے وہ اُس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اُس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے. چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جسکی نسبت مشہور ہے کہ اُسمیں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں

"فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ	بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است"
"راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید	ہرچہ در گفتار فخرِ تست آن ننگِ من است"

مگرچونکہ مرزاکے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اِس لئے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونو زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اُسکے کلام کے رتبہ کا اندازہ اُسکے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا؛ بلکہ اِس بات سے ہوتا ہے کہ اُسکے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اِس لئے نہیں کرتے کہ اُسنے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں؛ بلکہ صرف اُسکے منتخب اشعار نے۔ جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں۔ اُسکو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔

لطف علیخاں آذر آتشکدہ میں نوری صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ اُسکے دیوان کا مختصر ہونا یہی اُسکے کلام کی خوبی اور حُسنِ طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا؛ ورنہ فردوسی و نظامی دونو مثنوی میں، اور انوری و خاقانی دونو قصیدے میں، مسلّم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے۔ کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے؛ حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رُکنِ رکین مانے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزاکے اُردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات۔ گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں۔ لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔ اور

جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزاکے ریختہ میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہمکو مرزاکے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لئے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑیگا۔ جسکو امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کرینگے۔

میر و سودا اور اُنکے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اِس بات پر رکھی ہے۔ کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اوّلاً فارسی اور اُسکے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیلِ الفاظ اور بتغیرِ اسالیب بیان عامۂ اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کئے جائیں۔ چنانچہ میر سے لیکر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزاکے سوا اہل زبان میں گذرے ہیں اُنکی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اِس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ اُنکی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جاے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لیجائے۔

برخلاف اِسکے مرزانے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ اُنکی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جنکو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا؛ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے؛ اور اُن میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرِمو انحراف نہیں کیا؛ اور جس چال سے کہ اگلوں نے راہ طے کی تھی اُسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہراہ کا رُخ چھوڑ کر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا؛ اور جب راہ کی مشکلات سے

مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اُسی رُخ چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جارہا تھا اُسکے سوا ایک اور لیک اُسی کے متوازی اپنے لئے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اُس چال کو چھوڑکر دوسری چال اختیار کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور اُن کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اُسکے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اُسمیں ہمکو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے؛ اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جاکر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے؛ اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے اُنکے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے

اخلاق

"بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے؛ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے دعوے یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے اُسکا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے؛ بلکہ شاعرانہ استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کرسکتا۔

فطرت انسانی

"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا   نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے؛ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ

صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے

"نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا"

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے؛ اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا بُرائی ہوتی؛ مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا؛ مطلب یہ کہ خدا ہوتا؛ کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

اخلاق

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُسکو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُسکی فہم کا قصور ہے۔ دعوے یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اُسی کے موافق اُسکی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جسکو آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اُسکی ہمت۔ جبکہ وہ دریا میں تھا۔ موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اُسکو۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔

عاشقانہ

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ   جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو؛ مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب

یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی، اگر دشمنی بھی ہوتی تو۔ اس لئے کہ اسمیں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم اُسی کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پہ دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاو ایسے دو لفظ بہم پہونچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چار چند کر دیا ہے۔

فضیلتِ نوعِ انسانی

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اُسکے متحمل نہوئے، اور ڈر گئے، اور انسان نے اُسکو اُٹھا لیا"، شاعر کہتا ہے کہ برقِ تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہِ طور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھکر اُسکے موافق اُسکو شراب دی جاتی ہے، پس کوہِ طور۔ جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اسمیں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔

شوخی

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز　　دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لئے پہلا مصرع اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے۔ جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دیجا چکی ہو۔

شوخی

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھسے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اسمیں بھی نئی طرح کی شوخی ہے۔ جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھسے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، اور در پردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں؟ وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب اُنکو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں، اور جو شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، اُنکی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اُسکو خاطر خواہ نکر سکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہوا، اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں اُتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

شکایت

حبِ وطن

مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا۔ جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اُسپر خدا کا اس لئے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا، لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خبر دار و غمخوار ایک بھی نہو، وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی، پس خدا کا شکر ہے کہ اُسنے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اسمیں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے۔ جسکو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

تصوف

ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اِسکو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیّتِ ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے ورا الورا ہے۔ کہتا ہے کہ جسکو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے۔ اور اُسکو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں؛ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے؛ اور اِس سے بہتر اِس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی۔

نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اُسکے زخم کی گہرائی اِس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے؛ اور نِرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اِس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد حقیقی یعنی اُنکے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حُسنِ مبالغہ کی معراج ہے۔ جس کی نظیر آجتک نہیں دیکھی گئی۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اِس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لیجاؤ، اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونو صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہوتا۔ یعنی دشوار ہوتا۔ تو کچھ دقت نہ تھی؛ کیونکہ ہم مایوس ہو کر

بیٹھ رہتے، اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے؛ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں؛ اور اِس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفا داری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے　　مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانے میں کاٹ دے، اور وہیں مر رہے، تو وہ اِس بات کا مستحق ہے کہ اُسکو کعبے میں دفن کیا جاے؛ کیونکہ اُسنے وفا داری کا حق پورا پورا ادا کر دیا؛ اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اِس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی؛ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُسنے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حُسنِ بیان کی اِس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے مُنہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اِس طرح اُتر جاے کہ اُسکو یہ شبہہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

جامِ جم پر جامِ سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اُسکی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گذرا۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہونے سے — بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گذرا ہو مگر تمثیل نے اسکو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہلِ ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھکر اُسکی طرف التفات نکرتے تو دنیا ویران ہو جاتی پس یہ جاننا چاہیئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں یعنی جسطرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اسمیں اہلِ ہمت معدوم ہیں۔

ناامیدی

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید — ناامیدی اُسکی دیکھا چاہیئے

ناامیدی کی غایت اس سے بڑھکر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہمنے کئے ہیں اگر انکی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور انکی حسرت دل میں رہ گئی انکی داد بھی ملنی چاہیئے۔

علاوہ جدتِ مضامین اور طرفگی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اولاً عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے اُن تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے، بلکہ خیالات کی جدت اُن کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اُن کے ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے،

بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدِ وبال سے، استخوان کو خشت اور بدن کو قالبِ خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں انکے ابتدائی ریختہ میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اُسی قدر تشبیہوں میں۔ باوجود ندرت اور طرفگی کے۔ سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

تشبیہ

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیہاں

یہاں سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں۔ چراغ رہگذرِ باد سے تشبیہ دی ہے، جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

تشبیہ

دوسری جگہ سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ حسنِ معشوق کے مقابلے میں اُسکو ناقص الخلقۃ قرار دیا ہے۔ ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اُسکے برابر نہوا تھا

تشبیہ

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اُسکو غم سے نجات نہیں ہوتی۔ شمع سے تشبیہ دی ہے، کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

اس قسم کی بدیع و نادر تشبیہات سے مرزا کے دونو دیوان اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے ابتذال سے

بہت بچتے تھے۔ مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں، مبتذل محاورے، مبتذل ترکیبیں جس قدر اُنکے کلام میں کم ملینگی ظاہراً کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مِل سکتیں مثلاً صلِّ علیٰ کا لفظ جو بجاے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے اُسکو وہ کبھی جائز نہیں رکھتے تھے یہاں تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اِس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے اِسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں۔ اور خواص اُنکو کبھی نہیں بولتے تا بمقدور وہ اُنکو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہوجاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہیے وہ فوت ہوجاتا ہے مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں اُن کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو۔ جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، اور جسکی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختہ میں بھی نسبتاً فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اُردو میں بلاشبہہ استعمال کیا ہے؛ لیکن استعارے کے قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کیجاتی ہیں۔

مثال

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا   بات کرتے کہیں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اِس مطلب کو۔ کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھادی تو اِس سے کیا تسلی ہوسکتی ہے۔ اِسطرح ادا کیا ہے "بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا"

---

* مرزا کہتے تھے کہ حرفِ جار بغیر مجرور کے بولنا ایک عامیانہ اور سوقیانہ بول چال ہے۔

مثال

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا"

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی اور جو اُسکے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اُسمیں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہوجاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے اِن دو مصرعوں میں اُسکی تصویر کھینچدی ہے جس سے بہتر کسی اسلوبِ بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہوسکتا۔

مثال

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ   دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اِس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اِس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مثال

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے   اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اِس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمکو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

مثال

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں   جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اُسوقت اُنکے رفع کرنے کی طاقت تھی۔

اِن اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں؛ مگر استعارے اور تمثیل نے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کردی ہے۔

تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں، اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں، اور کیا نثر میں۔ باوجود سنجیدگی و متانت کے۔ شوخی و ظرافت ہے؛ جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گذرے ہیں؛ ایک سودا، دوسرے انشا؛ مگر دونو کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی؛ بخلاف مرزا غالب کے کہ اُنھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

چوتھی خصوصیت

چوتھی خصوصیت مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے؛ اور جسکو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے؛ اُنکے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلودار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں؛ مگر غور کرنے کے بعد اسمیں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں؛ جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

مثال ۱

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر یاد آتا ہے؛ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہوگی؛ مگر دشت بھی اسقدر ویراں ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

مثال ۲

کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق　　　　ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں مےِ مرد افگنِ عشق کا ساقی۔ یعنی معشوق۔ بار بار صلا دیتا ہے؛ یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا؛ اس لئے اُسکو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے؛ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد۔ جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے۔ اسمیں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں؛ اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بُلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق"، یعنی کوئی ہے جو مےِ مرد افگنِ عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق" یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اسمیں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بُلانے کا لہجہ اور ہے؛ اور مایوسی سے چُپکے چُپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعِ مذکور کی تکرار کروگے فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائینگے۔

مثال ۳

کیونکہ اُس بُت سے رکھوں جان عزیز　　　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اسکے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا؛ اسلیے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بُت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے؛ پھر اُس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

مثال ۴

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　　　گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری

نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اُسکو گوارا نہوتی ؛ اور یا اب ہمکو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے - اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصّے کی طرف اشارہ ہے جو قرآنِ مجید میں مذکور ہے ؛ کہ جب خدا تعالےٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا "کیا تو دنیا میں اُس شخص یعنی اُس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اُسمیں فساد اور خونریزی کرے ؟ وہاں سے ارشاد ہوا کہ "تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں" اور پھر آدم سے اُنکو زک دلوائی ؛ اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں ۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی ۔

مثال

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اسکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے ۔ اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے ؛ اسلیے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے ۔

مثال

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو

اس شعر میں "ترے سر کی قسم ہے ہمکو" اس جملے کے دو معنی ہیں ؛ ایک یہ کہ ترے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اُڑائینگے ۔ اور دوسرے یہ کہ ہمکو تیرے سر کی قسم ہے یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائینگے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے ۔

مثال

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اسکا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو ؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تمکو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر

فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو ۔

مثال

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ رہو ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے

"ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے" اسمیں دو معنی رکھتے ہیں ؛ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تمکو قائل کر دینگے ؛ اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھکر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں ۔

مثال

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

"کون اُٹھاتا ہے مجھے" اسکے دو معنی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اُٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اُٹھاتا ہے ؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے ۔

مثال

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے ۔ اسمیں بادپیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیے ہیں ؛ بادپیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں ؛ پس ایک معنی تو اسکے یہ ہیں کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اُسمیں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے ۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض بادپیمائی یعنی فضول کام ہے ۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا ؛ اور بادپیمائی خبر ۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بادپیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے ؛ اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح بادپیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں ۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے ۔

مذکورۂ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابلِ ذکر ہے جو مرزا اور اُنکے بعض معاصرین ومتبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے۔ جو جذبات اور خیالات اہلِ ایران نے غزل کے پیرائے میں ظاہر کئے ہیں ریختہ گویوں نے زیادہ تر بلکہ بالکل اُنھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا۔ ضرور تھا کہ وہی انقلاب اُردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہو۔

قدمائے اہلِ ایران جن کا دورہ مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے اُنکی غزل میں جو جذبات وخیالات بیان ہوئے ہیں وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے؛ اور گو اسالیبِ بیان میں تلاحقِ افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہوگئی لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے بعد جتنے سیدھے سادے عمدہ اور لطیف اسلوب تھے وہ سب نبڑ گئے اور متاخرین کے لئے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناسکتے تو اُنکے لئے میدانِ غیر متناہی موجود تھا مگر اُنھوں نے اُس محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا؛ اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اُنھوں نے تو اُسی چچوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی؛ مگر جنکی فطرت میں اُپجنیلٹی اور اُپچ کا مادہ تھا وہ اُنھیں قدیم خیالات وجذبات میں اپنے اپنے مبلغِ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ نظیری، ظہوری، عرفی، طالب، اسیر اور اُنکے اقران وامثال کی

غزل میں بمقابلہ سعدی، حافظ، خسرو وغیرہم کی غزل کے ہم اِسی قسم کا تفاوت پاتے ہیں: مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

گناہ اگرچہ نبود اختیارِ ما حافظ تو در طریقِ ادب باش و گو گناہِ من است

نظیری نے اِسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لاکر اُسمیں ایک نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے: وہ کہتا ہے۔

تا منفعل ز رنجشِ بیجا نہ بینمش مے آرم اعتراف گناہِ نبودہ را

یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

از عدالت نبود دُور گرش پرسد حال پادشاہے کہ بہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں۔ جو کہ اُسکا ممدوح بھی ہے اور محبوب بھی۔ ایک نئے انداز سے بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

مروت کردہ شبہا بر تو سیرِ بام و دلازم نمے باشد چراغی۔ خانۂ بے دستگاہاں را

یعنی چونکہ بے مقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا اس لئے مروت اور کرم نے تجھپر لازم کردیا ہے کہ راتوں کو کوٹھے پر چڑھکر ٹہلا کرے تاکہ تیرے چہرے کی روشنی سے اُنکے گھر میں چاندنا ہوجائے۔ مطلب یہ کہ اُنکے حال سے واقف ہوکر اُنکی مدد کرے۔

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم وبیش چارسو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیونکہ نئی طرز اُسوقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہلِ فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں۔ لیکن ریختہ میں یہ انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہوگیا؛ کیونکہ متاخرینِ اہلِ ایران کا نمونہ موجود تھا

اس لئے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اُسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی؛ کیونکہ جس طرح کیمسٹری کے مدوّن ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اسکے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اِس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلک سی نظر آجاتی ہے مگر اسمیں شک نہیں کہ اوّل مرزا نے اور اُنھیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکین، سالک، عارف، داغ وغیرہم نے اِس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا۔ خصوصاً مومن خاں مرحوم اِس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اِس خاص گروہ نے **قدما کے** سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور **لفظی و معنوی** تصرفات کرکے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے۔ **مثلاً میر تقی کا شعر ہے۔**

میری تغییرِ رنگ **پہ مت جا** — اتفاقات ہیں زمانے کے

اِسی تغییرِ رنگ کے مضمون کو مومن خاں نے اِس طرح باندھا ہے۔

میری تغییرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھکو اپنی نظر نہ ہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رخِ روشن کو شمع پر اِس طرح ترجیح دی ہے

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور — شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

نواب مرزا خاں داغ نے اِسی مضمون میں نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں

رخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

الغرض اِس قسم کی معنیٰ آفرینیاں، غالب، مومن اور اُنکے متبعین کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اِس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے اِسلئے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اِسی قبیل کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں

۱ ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

۲ غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کسکا ہے — نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

۳ کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے

۴ ضد کی ہے اور بات۔ مگر خو بُری نہیں — بھولے سے اُسنے سیکڑوں وعدے وفا کئے

۵ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہے

۶ اُسکی بزم آرائیاں سُنکر دلِ رنجور یہاں — مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

۷ نقش کو اُسکے۔ مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں — کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

۸ ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے — یہاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

۹ نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم — لے لیا مجھسے مری ہمّتِ عالی نے مجھے

۱۰ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اُڑ جانا، دوسرے میں عاشق کے جذبہ اور معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا، تیسرے میں نکہتِ گل سے حیا آنی، چوتھے میں بھولے سے سیکڑوں

وعدے وفا کرنے۔ پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا، چھٹے میں دلِ رنجور کا نقش مدعائے غیر کی طرح بیٹھا جانا، ساتویں میں کھینچنے سے نقش کا مصور سے کھنچنا، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا، نویں میں آپ اپنی ہمت عالی کے ہاتھ بک جانا، دسویں میں باوجود موت آنے کے موت نہ آنی، یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لیکر میر، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں؛ اور اگر تھیں تو صرف اُس قدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانۂ حال کے شعرا ظہوری وعرفی وطالب واسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات ونزاکتیں نظروں سے گرجائیں۔ لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گرانمایگی میں کچھ فرق نہیں آتا جنکو نئی طرز کے موجد ہونیکا فخر حاصل تھا۔

بہرحال جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی، خسرو، حافظ، اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر، سودا ودرد کے ریختہ سے سمجھنی چاہئے۔ قدما اُردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے؛ برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف وپاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصود شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو

خط میں لکھتے ہیں کہ "بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے"

اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پر بحث کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجایش ہے لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس لئے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوانِ ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دئے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جاچکے ہیں اُن کو اب مکرر نہ لکھیں گے اور جہاں ضرورت ہوگی شعر کے معنی بھی بتائینگے اور کہیں کہیں محاسنِ شعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائیگا

ستائشگر ہے زاہد اسقدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

طاقِ نسیاں وہ طاق جس میں کچھ رکھکر بھُول جائیں۔ طاقِ نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ جس کو طاق میں رکھکر بھول جائیں۔ بیخودوں کے بہشت کو گلدستۂ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا — یہاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے؛ ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے ہیں، اور اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی؛ اور اسلئے اُسکے ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑیگا جس طرح امانت کا

حساب دینا پڑتا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سُنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سُنائی تو بادشاہ نے مقطع سُنکر کہا "بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے" مرزا نے کہا "حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں"

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر — رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھکر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خونِ بیگناہ اپنی گردن پر نہ لے مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بیگنہ کے حق آشنائی کا رہیگا۔

سب کے دلمیں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا — مجھپہ گویا اِک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

بندگی میں مرا بھلا نہوا — کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟

کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھکو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غمِ فراق میں تکلیف سیرِ گل مت دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

خندۂ گل کو خندۂ بے جا اس لئے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھکر یا ازراہِ تعجب نہیں ہنستا، پس گویا اُسکا خندہ بے محل ہے۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسد — جفا میں اُسکی ہے انداز کارفرما کا

یعنی فلک کو دیکھ کے خدا یاد آتا ہے، کیونکہ فلک سے جو جفا سرزد ہوتی ہے اُسکے حکم سے ہوتی ہے۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یعنی اُسنے زبردستی کیوں نہ پلا دی؟

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر اگر بحر نہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگئ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یعنی ہمارے جُرم کے ثبوت کے لئے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے، صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — مَیں معتقدِ فتنۂ محشر نہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہوگیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلّہ تک نہیں بھیگا۔ تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی۔ یہ بعینہٖ ویسی ہی بات ہے جیسے مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سُنکر اُسکی تعریف کرتے وقت کہا تھا کہ "اسمیں مرزا کا

کیا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے،، غرضکہ ایک ہمعصر دوسرے ہمعصر کی تعریف بھی کرتا ہے
تو اُس میں ایک نہ ایک بات ضرور ایسی شامل کردیتا ہے جس سے یا اُسکی تنقیص لازم آئے یا اپنی تعریف
اُس سے بھی زیادہ نکلے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنھ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا
رشک کہتا ہے کہ اُسکا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟
ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز و ہمنشین تھا وہی سُنکر
میرا رقیب بن گیا؛ کیونکہ اوّل تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان
کی زبان سے۔ پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی ،، اور پھر بیاں اپنا،، یہ مرزا کی خصوصیات
میں سے ہے۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے — بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جان پہچان نکلا؛ اب ہمارے لئے اس بات کا
موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہمکو ذلت دے ہم اُسکو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے؛ اور یہ
ظاہر کرینگے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے؛ ہمارا اُسکا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے — بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی اور ہنرمندی کس خوبصورتی سے

ثابت کی ہے۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یعنی اگر نالہ کی اجازت نہو گی تو ہم اُسکو ضبط کرینگے اور اُسکا اثر تجھ تک پہونچیگا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے کہتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے فروتر
بہتر ہوگی اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں جسکا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل — جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح
جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعوے چل نہیں سکتا یہ شعر حقیقت و مجاز دونو پر محمول ہو سکتا ہے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گذر جائیگا تو مر جائینگے یعنی فنا ہو جائینگے گویا قطرہ دریا میں کھپ جائیگا اور یہی
اُسکا مقصود ہے پس درد کا حد سے گذر جانا ہی اُسکا دوا ہو جانا ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد — تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا　　　روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب　　　یار لائے مِرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن　　　جانوں کسیکے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات　　　سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ　　　ہمکو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ　　　لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

اِن آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں　　　جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا　　　یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھینگے مری بات　　　دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اسمیں درپردہ اُن لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں　　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اُسوقت تک راہ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگ گراں سدِ راہ ہے پس اگر ہمنے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اَور　　　پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

نالے یعنی ندی نالے نہ آہ و نالے۔ مثال کس قدر ممثل لہ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رُکتی ہے اُسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے خصوصاً جو مضمون وہ اُسوقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت مؤثر اور دردانگیز ہوتا ہے۔

فلک سے ہمکو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　　　متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاع بُردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کریگا۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے　　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے، خواہ زن و فرزند کی محبت ہو، خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت کی، خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اسکی مثال اُس انجمن کی ہے جسمیں شمع کی روشنی نہیں۔

زخم سلوانے سے مجھپر چارہ جوئی کا ہے طعن　　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر　　　بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے تئیں خس یعنی پھوس وغیرہ سے، اور وطن کو گلخن سے، تشبیہ دی ہے؛ یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے، اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اُسکی کچھ قدر نہیں ہوتی، یہی حال میرا ہے، کہ وطن میں تھا

تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر۔ ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اُسکو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اِسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اُسکو اُس کام کے کرنے سے انکار ہے پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اُسکو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اِسلئے نہیں کھا سکتا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لاویگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

کس مُنہ سے شکر کیجیے اِس لطفِ خاص کا — پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

یہاں ہمزباں کے لفظ میں ایہام ہے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہوسکتی اور در پردہ اسمیں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اسی مطلب کو جو پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے دوسرے مصرع میں نئے رنگ سے کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے دشت نوردی کی مانع کوئی تدبیر نہ ہوئی اُسکو اِس طرح ادا کرنا کہ پاؤں میں چکر ہے مگر زنجیر نہیں کمال بلاغت ہے۔

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے — جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جادہ یعنی بٹیا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور تکلیف میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اُس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں ، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اِس لئے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

الفتِ گل سے غلط ہے دعویِ وارستگی — سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلہ پر قبلہ نما کا اطلاق ظاہرا مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جاے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں ، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو ، اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہوجاتے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ — ہمکو جینے کی بھی اُمید نہیں

یہ شعر سہل و ممتنع ہے اِس زمین میں اِس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

یعنی آج اِس خوف سے شراب دینی کہ کل نہ ملیگی ساقیِ کوثر کی فیاضی پر سوءِ ظن کرنا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے؛ یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے۔ اسلئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔

مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام　　　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اِس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہونچی ہے" اِس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے ایسا حذف۔ جسپر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کئے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں محسناتِ شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا　　　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے؛ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اُسکا التفات اور میلانِ طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف؛ اور ایک نگاہ کا چُرانا ایک طرف۔ اور اُسکے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف؛ اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل و ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرع بہم پہونچ گئے۔ جن میں حسنِ ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے؛ مگر اُسکا آنکھ چُرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دلاویز ہوتا ہے۔ اسیطرح

بناؤ سنگار سے معشوق کا حُسن بے شک دوبالا ہو جاتا ہے؛ مگر اُسکا غصہ میں بگڑنا اُسکے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اِس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں؛ اِسکی اصل خوبی وجدانی ہے جسکو صاحبِ ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے، اِس لئے مرزا کا کلام سُنکر اکثر ایچتے تھے اور اُنکی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اُس روز اِس شعر کو سُنکر وجد کرنے لگے اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کسکا شعر ہے؟ کہا گیا کہ مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے، اور اُس روز لاعلمی میں بے ساختہ اُنکے مُنہ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سُنکر بطور مزاح کے جیسی کہ اُنکی عادت تھی فرمایا "اِسمیں مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے"، مگر فی الحقیقۃ یہ شعر بھی معنیً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہمکو معلوم ہے اِسلوبِ بیان آجتک اِس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے　　　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُسکے قابو سے باہر ہونا چابک سواروں کی زبان میں اِس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے

اُتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　　　　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسوی اللہ مراد ہے۔ جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے۔ کیونکہ وہ وجودِ واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجودِ ماسوی کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں

رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجودِ واجب سے بُعد ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر — یہاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدتِ وجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اِس طرح ادا کرنا کہ "یہاں کیا دھرا ہے" نہایت بلاغت ہے۔

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالبِ راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اُسکو اِس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اُسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے؛ اور اُسکے ساتھ ساتھ پھرتا ہے، پھر جب کوئی اُس سے بڑھکر نظر آتا ہے تو اُسکا تعاقب کرتا ہے؛ وھلم جرّاً۔ اور وجہ اِس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہمکو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب — تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

دو نو جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یہاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنی فراخ حوصلگی اور اُسکے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے؛ یعنی میں جو دو نو جہان لیکر خاموش ہو رہا اُسکا سبب یہ نہیں تھا کہ میں اُن پر قانع ہو گیا؛ بلکہ مجھکو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اِس لیے خاموشی اختیار کی۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی — سُنکے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف وہ ظریف جسکی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھکر کہا تھا کہ آپکی محفل غیر سے خالی ہونی چاہیے؛ اُسنے یہ سُن کر مجھے بزم سے اُٹھوا دیا؛ یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر — عشق کا اُسکو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سُن لیلےٰ کا دشتِ قیس میں آنا — تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرع میں اُسکی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے، اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے، کہ اِس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا!

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں — کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام — دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر — لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

یعقوب کی آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزنِ زنداں ہر وقت یوسف پر

کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں شب و روز یوسفؑ کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں　　جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار　　جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اُٹھتیں، بلکہ پلکوں کیطرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

واں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب　　یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اِس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اُسکو ہر شخص ضروری جانتا ہے، کیونکہ سب سے حیراں ہوکر پوچھتا ہے کہ بتاؤ اُنکی گالیوں کا کیا جواب دونگا جبکہ دعائیں سب نبڑ چکیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے۔ جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے، اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بنجاتی ہیں۔

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا　　دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیمروز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونو پر محمول ہوسکتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونو ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو　　کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے، بلکہ حقیقتِ واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا، لیکن جس قدر اُسکا دائرۂ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر اُسپر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے۔ جسپر حسد و رشک کیا جائے۔ بلکہ اُنکی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے، اور اس لئے انصاف اور فیاضی اُسکے دل میں پیدا ہوتی ہے، اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے پر متوجہ ہوجاتا ہے۔ اِس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ "چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو"، جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں　　بھولا ہوں حقِّ صحبتِ اہلِ کنشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ صواب سے　　ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

آئی اگر بلا تو جگہ سے ٹلے نہیں　　ایرا ہی دیکے ہمنے بچایا ہے کشت کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں　　کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید ✦ مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں ازراہِ تہذیب اُس کام کا ذکر نہیں کیا جسکے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ ۔ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا ۔ جب وہی چھٹ گیا اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے ۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کے کی گئی ہے ۔ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے ۔ اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے ۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست ✦ لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اس شعر کو حقیقت و مجاز دونو پر محمول کر سکتے ہیں ۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ✦ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اُس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جسکے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے ۔

یہ کہہ سکتے ہو ؟ ہم دل میں نہیں ہیں ۔ پر یہ بتلاؤ ✦ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اس شعر میں مخاطب معشوقِ حقیقی ہے ۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ✦ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ✦ تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

ہر اک دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوہ ہجراں ✦ خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی ✦ فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یعنی جب غمِ دنیا سے سر اُٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اُٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے ۔ اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اُسکے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے ۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے ۔ غرضکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں ۔

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا ✦ ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اُس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اُڑ سکے ، اور کاغذ پر اُسکا نشان باقی نہ رہے ۔ مگر یہاں ازراہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جس پر سے حرف غلط خود بخود اُڑ جائے ۔ کہتا ہے کہ تونے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا ، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خط کا کاغذ غلط بردار ہے ۔ کہ جو بات سچے دل سے اُسپر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے ۔

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ ✦ جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق ۔ عذر خواہ معافی چاہنے والا ، یا معذور رکھنے والا ۔ اِس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعوے متضمن دلیل واقع ہوا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدومِ محض ہیں ۔ اُن کی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جسکے پرتوِ وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں ۔

جھینپیں ہیں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے ✦ کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ✦ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ✦ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے اور وہ یہ ہے

"گفتنی نیست کہ برغالبِ ناکام چہ رفت — می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت"

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے — گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملہ کا ہے۔ جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گذرتا ہے! اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے! پھر اسکے کیا معنی! کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے! اور شرما جانے کا متعلق اور۔ گر حیا بھی اُسکو آتی ہے،، یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے۔ او شرما جاے ہے،، یعنی غیر سے یا اُسکے ساتھ تکرار کرنے سے۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا — رنگ کھلتا جاے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ — ذکر میرا مجھسے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں ملجائیگی — یہ جو اک لذت ہماری سعی بیحاصل میں ہے

فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا — تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق

تمیز نہیں رہی! اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونو مبدل بزمانۂ حال ہوجائینگے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی۔ قیامت گذر جانے کے دونو معنی ہیں؛ نہایت سختی کا زمانہ گذرنا، اور خود قیامت کا آجانا۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے، اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اُنسے ناواقف ہے! اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی محض ازراہ شوخی کے کہتا ہے کہ منکرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں، تاکہ نکیرین اُسکی بو کی کراہت سے بغیر سوال جواب کئے چلے جائیں۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے — ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہوگئے اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
چھوڑی اسد نہ ہمنے گدائی میں دل لگی — سائل ہوئے تو عاشقِ اہل کرم ہوئے
سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے
حسنِ مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے — اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے معشوق کو مہِ خورشید جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اُسکو ماہِ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اسمیں سوا ملتا ہے — وہ گدا جسکو نہو خوے سوال اچھا ہے
اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اسی کے قریب قریب سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں "گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم

چہ بگویم کہ غم از دل بِرَوَد چون تو بیائی" دونو کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھکر سمجھ جائے کہ اسکا دل مغموم ہے کیونکہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا بااینہمہ سعدی کے شعر کو بہرحال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہئے کیونکہ الفضل للمتقدم۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض — اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و ما فیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اُسکے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وبا نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ وغیرہ۔

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھیریں ہدفِ ناوک بیداد کہ ہم — آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف — آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لئے ہمکو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہو
ہم تو ہیں عاشق تمھارے نام کے

عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اِس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اِسکو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی کہتا ہے کہ میری قدر اُس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہوا ور ہر شخص آتے جاتے اُسپر پاؤں رکھکر گذرے یعنی ہوں تو گراں قدر، مگر اُس پتھر کی طرح بے قدر ہوں پس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے۔

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھدیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے اِک بوند لہو کی

لفظ تو نے جو دوسرے مصرع میں ہے یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا۔ اِس لئے دوست کے سرِ انگشتِ حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اِسکی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بیحوصلگی سے
یہاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

بیحوصلگی یعنی کم ظرفی یہاں سے مراد دنیا معشوق سے کہتا ہے کہ تو اِس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آکر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو یہاں کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

پھول کے کھلنے کو چاکِ گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے کہتا ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہئے، پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر اِسمیں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوشِ جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

پلادے اوک سے ساقی جو ہمسے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے - نہیں ہے

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد
مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے

مگس کی قَے یعنی شہد زاہد جو شہد کے پینے کو موجبِ ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اُسکو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

انتظار

ہائے وہاں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا — لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے — تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

عاشقانہ شوخی

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے — عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے — جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اسکی کیا تلافی ہو سکتی ہے نیکی نہیں کر سکتا۔

عاشقانہ

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اسمیں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قوت جس سے عشق کے ترک کرنے یا اسکے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتدائے عشق میں اُنھیں کو صدمہ پہنچا ہے پس اب عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اسپر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

تصوف

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

عاشقانہ

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے — نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

اخلاق

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

روئے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا- بے شرم و بیباک ہونا- پاک- آزاد یا شہدا- مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھُل کھیلے اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ "روئے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے" بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے

تصوف

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہدِ حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اسکو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے

رباعی

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ — دورِ تو و نزدیک ترا حال تباہ

کس نیست کہ جاں از تو سلامت ببرد — آں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسکے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اسکی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اُسنے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہمکو فنا کر دیا۔

تصوف

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد اور معبود کے درمیان گفتگو ہونا) دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں کہتا ہے کہ شاہدِ حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت

نہیں ہوسکتی بلکہ اُسکے لئے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہئے یعنی جب تک دل تیغِ عشق سے مجروح نہو یہ رتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گذر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کیجاتی۔

بات پر وہاں زبان کٹتی ہے وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک دو گر غلط چلے کوئی ڈھانک لو گر خطا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پر دم نکلنا اُسکے پورے ہونیکے لئے جلدی کرنا چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو یعنی کیوں جلدی کرتے ہو پہلے مصرع میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ ،، دل ہی باقی ہے،، مقدر ماننے چاہئیں باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

نکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدمؑ کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

بھرم کھلجائے ظالم تیری قامت کی درازی کا اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا اُسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

تیغ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے پہ یہاں انتظار ہے

اے پرتوِ خورشید جہانتاب اِدھر بھی سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

یہ خطاب ہے آفتابِ حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متّہم بوجود ہے اور فی الواقع اُسکی کچھ ہستی نہیں ہے اُسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں اگر آفتابِ حقیقت کی کوئی تجلّی ہم پر لمعہ فگن ہوجائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنا فی الشمس ہوجاویں، کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونو پہلو رکھتا ہے، مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسیکو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر کی جس سے بات اُسنے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں حج کا ثواب نذر کرونگا حضور کی

اس شعر سے مرزا کی کمال شوخیِ طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اُس زمانے میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اِس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ اُسکے لئے منّت مانتے ہیں، مگر منّت یہ مانتے ہیں کہ حج کا

ثواب حضور کی نذر کرونگا۔ اُدھر سفرِ حج کا وہ اشتیاق اور اِدھر حج کے ثواب کی یہ بیقدری۔

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مےِ گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھکو
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لیئے کافی ہے مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع ہیچ نہ سمجھے اُسپر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اُسکا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلیئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیئے

اِس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہوسکتی۔

گدا سمجھکے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھکے قدم مینے پاسباں کیلیئے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے اندازِ بیان پر پروانہ تھے۔ ہمنے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے یہاں اُسکی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اُسمیں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک

کیا دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونو باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اِسکے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اُس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اِس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بُلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا اُن مدحیہ اشعار میں سے صرف دو شعر اس مقام پر لکھے جاتے ہیں۔

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیئے

زمانہ عہد میں ہے اُسکے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیئے

قطعات

قطعہ ۱

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اِس درخواست سے گذرانا تھا کہ اُنکی تنخواہ جو ششماہی گذرنے پر اکھٹی چھہ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اِس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھکو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ ازروئے ننگ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلامِ کارگذار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہوگیا صد شکر — نسبتیں ہوگئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھکو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے ابکے سال — کچھ بنایا نہیں ہے ابکی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

✣ بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی مرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گذرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے ۱۲

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھکو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا — ہوگیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغزگوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سُنیے — ہے زباں میری تیغ جوہردار

بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میری ابرِ گوہربار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — ✣شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ ۲

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

✣ شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے چونکہ یہ قطعہ مرزا نے اپنے خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جسمیں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے ۱۲

کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ داب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اُردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں اس لئے مرزا نے اُسکو اس پیرائے میں بیان کیا ہے۔

قطعہ ۳

شکریہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت ۔ حضور والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں ۔ نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لئے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے اُسکے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گذرانتے تھے یہ قطعہ بھی اُسی قبیل کا ہے۔

لطیفہ

جسوقت چوبدار بادشاہی یہ اولوش لیکر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اُسنے مرزا سے متعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا "ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اسنے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھپر بڑے ظلم ہوتے ہیں؛ مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں، اور مجھسے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھپر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے؛ ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھکو کھا جائیں"

قطعہ ۴

شوخی

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھولکے کھانے کو کچھ نہو روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کی حضور میں پڑھا گیا تھا جسکو سُنکر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے۔

قطعہ ۵

شکایت

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی مجھپہ کیا گذریگی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

ایک شعر میں مسہل کے اِن تمام دنوں کی تفصیل جنمیں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔

قطعہ ۶

شوخی

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے*

رباعیات

رباعی ۱

شوخی

تھے مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سُن سُنکے اُسے سخنورانِ کامل

* شریک غالب اُس شریک کو کہتے ہیں جسکا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ شریک غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے۔

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنگویم مشکل

اِس اخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہوگئے ہیں ایک یہ کہ اگر اُنکی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اِس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنورانِ کامل کی نافہمی اور کُند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھیرتا ہوں پس دونوں طرح مشکل ہے۔

رباعی ۲

بھیجی ہے مجھے جو شاہ جم جاہ نے دال　　ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال　　ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی یہ رباعی اُسکے شکریہ میں لکھی گئی ہے۔

مبارکباد سالگرہ

رباعی ۳

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے　　تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ　　ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

شوخی

رباعی ۴

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے　　کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

کہتے ہیں کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ!!!　　وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اِس رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے کہتا ہے کہ ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو جُھک جُھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کامروائی میں درنگ

اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ صبح شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کامروائی خلق میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گذر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

رباعی ۵

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں　　آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن　　خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اُسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی۔

رباعی ۶

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں　　عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں

جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا　　کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے ظلم سے ہاتھ اُٹھانا اُس سے دست بردار ہونا اور اُسکو ترک کرنا باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔

رباعی ۷

اِن سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے　　بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے

گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار　　فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے ؛ اُنکے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔

نثرِ اردو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے ؛ مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے ، اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے ؛ اُسوقت بضرورت اُنکو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوتِ تخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُنکی ہمت مہر نیمروز کی ترتیبِ انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُسوقت اُنکو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی۔ اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں۔ شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے

مضمحل ہو گئے قوےٰ غالب — اب عناصر میں اعتدال کہاں"

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت کا باعث ہوجاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُنکی

اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظمِ اُردو اور نظمِ فارسی اور نثرِ فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے ؛ اور اُنکے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے ؛ مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جنپر مجھکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا مگر بطریقِ اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے۔ دادِ سخن کہاں اور ادراکِ پایۂ معنی کہاں ؟ تاریخِ تمریہ (یعنی مہر نیمروز) کے پانسات جزو جو آپکے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے ؛ انصاف سے کہئے کہ یہ نثر کیس اور ہے ؟ اور پھر اُس نثر کا کوئی مشتاق نہو"

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض افضل تحریروں میں دیکھا گیا کہ اُردوئے معلیٰ اور بوستانِ خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے ؛ لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے قدر دان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں ؛ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں ؛ اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں ؛ لطائفِ غیبی ، تیغِ تیز اور نامۂ غالب۔ اسکے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں۔ جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اِن میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز اُنکے خطوط ہیں جنمیں سے زیادہ تر اُردوئے معلیٰ میں اور اُس سے کم عودِ ہندی میں جمع کرکے چھپوائے گئے ہیں۔ اور بہت سے خطوط اِن دونو کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔ جو اب تک شائع نہیں ہوئے۔ مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ اُنکے چھپوانے کا ہے۔

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا؛ اور نہ اُنکے بعد کسی سے اُسکی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور اور بہت سی باتیں جنکو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں؛ اُسکے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

اوائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُنکو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا۔ مینے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اُسنے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائینگی؟ اُسنے کہا آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے" اس مطلب کو اُنھوں نے اِسطرح ادا کیا ہے "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ۔ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائینگی؟ آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے۔

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے؛ اُسمیں لکھنا یہ ہے کہ میر نصیر صاحب آئے اور اُنسے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اِس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُسکو اِسطرح شروع کرتے ہیں "اے میر نصیر صاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھدیتا ہوں؛ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میر نصیر صاحب! اُسکے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا؛ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپکے

فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہونگے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اُٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں؛ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو؛ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ! میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ"

اِسکے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُسکو غائب فرض کر لیتے ہیں؛ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے اندازِ بیان سے واقف نہیں وہ اُسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں "میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھکو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی؛ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لیگیا مگر میں نے اُسکو بحل کیا؛ اللہ برکت دے"

ظاہر ہے کہ اِس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں؛ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اُسکے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اِس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے۔

اِن الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر اُن کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا؛ اُسی قدر اُنکو اِس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں ازراہ کسرِ نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں اُنیں اکثر اِس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُنکے ناموں کی کوئی علامت لکھدی جاتی ہے؛ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے؛ اور نہ اُنکے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال یا جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟ اور جواب کیا؟ شاید قصے یا نوول میں یہ بات نہ چل سکے؛ مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اُسکی پیروی نکر سکیں؛ مگر وہ چیز جسنے اُن کے مکاتبات کو نوول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے؛ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے؛ مگر اُنکی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں؛ اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اُسکو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثرِ اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، تاریخی،

سوشل، اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں؛ بائیوگرفی اور نوول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں؛ باوجود اسکے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطفِ بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اِس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اُسکو پڑھکر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُسکی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے؛ اُسمیں اُن کی لڑکی کو۔ جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تمکو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے مُلک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟" یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب رئیس لوہارو ہیں۔ اُنکے بچپن کے زمانے میں اُنکے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اِس طرح لکھتے ہیں "اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب۔ ایسے القاب کے معنی سمجھ لو؛ یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی پتلی۔ چشمِ جہاں بیں تمھارا باپ مرزا علاؤ الدین احمد خاں بہادر۔ اور پتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں؛ میں تو صرف تمھارا دل دادہ ہوں۔

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے اُنھوں نے اُسکا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اُسکے جواب میں اُنکو اِس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہمکو پسند نہیں؛ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو؛ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے"

شوخی

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے؛ اس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں؛ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں؛ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے؛ اور روزہ بہلانا اور بات ہے"

جس زمانے میں برہانِ قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلف برہان کی حمایت کی ہے ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُسکی اور اُسکے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں "اِن فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا؛ نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُسکو مانیں؛ ہندیوں کو کیونکر مسلّم الثبوت جانیں۔

لطیفہ

ایک گائے کا بچہ [†] بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا؛ بنی اسرائیل اُسکو خدا سمجھے"

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاؤالدین خاں کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں "اُستاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھپھی اُنکی چچی تھیں اور یہ مجھسے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشیِ سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں۔ بندگی۔ اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں۔ درود۔ اور موافق مضمون اس مصرع کے "سوے اللہ واللہ مافی الوجود" سجود"

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں "دیوانخانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا؛ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے؛ ابر دو گھنٹے

† یہ اشارہ صاحب برہانِ قاطع کی طرف ہے ۱۲

برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے"

نواب علاؤالدین خاں اور اُنکے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاؤالدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں "سُنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزولِ اجلال کیا۔ پہر دن رہے ازراہِ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے ۔۔۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اُسکو چاہتے ہو۔ ہنسنے لگے۔ غرضکہ میں نے بظاہر اُنکو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے"

ایک دفعہ کثرتِ اخراجات سے تنگ آکر بعضی ضروری خرچ بند کر دئے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے نواب علاؤالدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اِسکا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطورِ نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو الخ" اُسکا جواب اس طرح لکھتے ہیں "بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اِدھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو جا مارا، اِدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی؛ ہر ایک پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھکر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل میاں کے سر، باایںہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے؛ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے، مول میں قسط اُسکو دینی پڑے؛ انکم ٹکس جدا، چوکیدارہ جدا، سود جدا، مول جدا،

بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمدہی ایک سو باسٹھ[۱۶۲]، تنگ آگیا، گذارا مشکل ہوگیا؛ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہوگیا۔ متفرق رہا؛ خیر، ہو صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی انکو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا،،

اے بے خبر ز لذتِ شرب مدامِ ما،، دیکھا ہمکو یوں پلاتے ہیں۔ در بیے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائلِ ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے؛ اور عرفا کے کلام سے حقیقتِ حقّہ وحدتِ وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ اُن لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومنِ کامل ہوں زبان سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہتا ہوں؛ اور دل میں لا موجود اِلَّا اللّٰہ، لامؤثر فی الوجود الا اللّٰہ سمجھا ہوا ہوں انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللّٰہ ہے۔ اور امام من اللّٰہ علی علیہ السّلام ہے ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السّلام،، بریں

زیستم ہم بریں بگذرم،، ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہونگا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کردونگا؛ تاکہ مشرکینِ نبوتِ مصطفوی و امامتِ مرتضوی اُسمیں جلیں ++++

سنو! مولوی صاحب کتنے کئی فاتوں میں۔ ایک شعر حافظ کا حفظ کیا "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں آئی" اور پھر پڑھتے ہو اُسکے سامنے کہ اُسکی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دوچند سہ چند ہے؛ مجموعۂ نثر جداگانہ؛ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اسکے مخالف ہیں،،

ایک خط میں تعلقاتِ خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں "سنو! عالم دو ہیں؛ ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم اِن دونو عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم،، اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے "للّٰہ الواحد القہّار،، ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں؛ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں تقرر کیا؛ اور مجھے اُس زنداں میں ڈالدیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھیرایا۔ برسوں کے بعد میں جیلخانے سے بھاگا تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے؛ اور پھر اُسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتکڑیاں[+] اور

[+] بیڑی سے مراد اہلیہ اور دو ہتکڑیوں سے مراد حسین علی خاں اور باقر علی خاں جنکو مرزا نے اُنکے والد زین العابدین خاں کی وفات کے بعد خود فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا،،

پڑجاویں۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یکقلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونو ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مرادآباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگونگا بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اِس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا۔ فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں روم + سوی شہر خود ازیں وادی ویراں بروم +

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو اُنکی محبوبہ چنا جان کی تعزیت میں لکھا ہے اسمیں لکھتے ہیں "آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپکا معاملہ بیان کیا یعنی اُسکی اطاعت اور تمھاری اُس سے محبت سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصریؒ اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصریؒ سے ٹکر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرح نصیب ہو۔ لیلی اُسکے سامنے مری تھی تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اُس سے بڑھکر ہوئے کہ لیلی اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جسپر مرتے ہیں اُسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک +++ کو میں نے بھی مار رکھا ہے خدا اُن دونو کو بخشے اور ہم تم دونو کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانۂ محض ہوگیا ہوں، لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُسکا مرنا زندگی بھر نہ بھولونگا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہوگی

صبر کرو اور ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔ سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی + عشق محمدؐ بس ست و آل محمدؐ +
اللہ بس ماسوا ہوس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چنا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے۔ مرزا صاحب! ہمکو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدای شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی۔ کہ ہمکو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے، اور اُسی ایک نیکبخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے، اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہئے ہئے وہ حور اجیرن ہو جائیگی، طبیعت کیوں نہ گھبرائیگی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کن اے دوست ہر نو بہار — کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اُسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں "حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا +++ تمھارا حلیہ دیکھکر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھکو رشک نہ آیا کسواسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کسواسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُسکی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر

سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھکو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری؟ بقول شیخ علی حزیں

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں † شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

"جب ڈاڑھی موچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے؛ اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے؛ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام؛ مُلّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جُلاہہ، کُنجڑہ، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر مُنڈایا"

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جنمیں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں "بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہوگیا؛ یعنی منگل کے دن ۱۸۔ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھپھی۔ کہ میں نے بچپن سے آج تک اُسکو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھکو بیٹا سمجھتی تھی۔ مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نُو آدمی مرے؛ تین پھپھیاں، اور تین چچا، اور ایک باپ، اور ایک دادی، اور ایک دادا؛ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے مَیں جانتا تھا کہ یہ نُو آدمی زندہ ہیں اور اُسکے مرنے سے مینے جانا کہ یہ نُو آدمی آج ایک بار مر گئے"

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں "آج تم دونو بھائی اِس خاندان میں

† یہاں اِس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جبتک مجھے موقع ملا برابر ڈاڑھی کا حق ادا کرتا رہا یعنی منڈاتا رہا پس اب میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں ۱۲

شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو؛ مَیں لم یلد ولم یولد ہوں۔

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں "یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی؛ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں؛ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا؛ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد اُنکے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سَقَر مَقَر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر!!! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ مَیں اُن سے پوچھ رہا ہوں "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں؛ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بیحیا، بے عزت؟ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام؛ قرض لئے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دونگا"

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے اُسکی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اسطرح لکھتے ہیں "صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش اُنکا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط؛ بعد چند مدت

پھر دوسرا جنم ہمکو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے ؛ یعنی ایک خط میں نے منشی
نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اسکا جواب مجھکو آیا۔ اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال تخلص
بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اسکا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے
لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر
میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ ؛ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں"

ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں "کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی
بڑا شہر ہے ؛ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جسمیں تم پیدا ہوئے
ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جسمیں تم شعبان بیگ کی حویلی
میں مجھسے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جسمیں میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں
ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ؛ ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ
باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں ۔۔۔
امرای اہل اسلام میں اموات گنو تو حسن علیخاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپیہ روز کا پنشن دار۔ سو روپے
مہینے کا روزینہ دار بنکر نامرادانہ مرگیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف
سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا
نہ دوا نہ غذا ؛ انجام کار مرگیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا
جسکا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اسکے پاس ایک پیسا نہیں ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو
مل گیا ہے مگر دیکھئے چھٹتا ہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے

بیکٹ بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاءالدولہ کی پانسو روپیہ کرائے کی املاک واگذاشت ہو کر
پھر قرق ہو گئی ؛ تباہ و خراب لاہور گیا ؛ وہاں پڑا ہوا ہے ؛ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور
جھجر اور بہادر گڑھ اور بلبھ گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں
خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع
ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اسکو بھی سچ جانو،،

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت
موثر طریقے میں کیا ہے جس سے انکے خیالات معلوم ہوتے ہیں مثلاً

ایک خط میں لکھتے ہیں "ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی
رکاب میں پانو ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی
ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر ؛ اور اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے
دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے　　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق
ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں زیست بسر کرنے
کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔
ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور
گمنام جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی ؛ باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی

وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھکر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے! اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گذر جاؤں۔ عالم بیرنگی میں گذر پاؤں۔ جس سناٹے میں مَیں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونو عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دئیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونو اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے اُنکو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہمکو تمکو ہوگا،،

مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاصکر اُردو تقریظوں میں مسجّع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات بارِدہ میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنّع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مُسجّع عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اُسپر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجّع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اُسمیں تصنّع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالایلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مسجّع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اسکی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اُردو رقعات میں اسکی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاصکر

اُن خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی یا ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں

"یوسف مرزا کیونکر تجھکو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھسے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہونگا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونو قیدوں سے چھوٹ گیا! نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ،،

اُنھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "اے میری جان! اے میری آنکھو!

"بہجرانِ طفلے کہ در خاک رفت — چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لیکر آیا تھا۔ یہاں رہکر کیا کرتا؟ ہرگز غم نکرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو خدا تمکو جیتا رکھے؛ اولاد بہت۔ نانا، نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم منجملۂ واقعات کربلائے معلّٰی ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفے عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اُردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے؛ خصوصاً سجع کی رعایت نے اُن میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اسمیں معذور سمجھنا چاہیئے؛ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات بارِدہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اُسکو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اسکا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

باایں ہمہ انھیں سے بعض نثریں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو اُنھوں نے مُفتی میرلال صاحب کی کتاب سراج المعرفۃ پر لکھا ہے اُس میں جس خوبی اور متانت سے تصوّف کے اعلےٰ خیالات ظاہر کیئے ہیں اُسکے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوّف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اُسکے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب سراج المعرفۃ۔ جسپر مرزا نے یہ دیباچہ لکھا ہے۔ اُسمیں مفتی میرلال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما سے تمام اشغال و اذکار۔ جو آنحضرتؐ کے زمانے سے اُسوقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کیئے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفتِ الٰہی میں کیا دخل ہے؛ اور کیونکر انکے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے۔ دیباچۂ مذکور کا اوّل و آخر کا حصّہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزا نے مذکورہ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ وہ حق یوں ہے کہ حقیقت اندرے مثال ایک نامہ در ہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جسکے

عنوان پر لکھا ہے ”لاموثر فی الوجود الا اللہ“ اور خط میں مندرج ہے ”لاموجود الا اللہ“ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور نام آور ہے کہ جسپر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں؛ آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیاے پیشیں صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلانِ مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجابِ تعیناتِ اعتباری اُٹھا دیں؛ اور حقیقت بیرنگیِ ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص اُمّت محمدی کا سینہ ہے؛ اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مفتاحِ بابِ گنجینہ ہے۔ نہ رہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے اُنکی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے اُسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدمگاہ پر آرہیں گے یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے مژدۂ روح افزاے ”من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ“

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدت حقیقی کا رازداں ہے۔ گفتگوی توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کوئی سو بار کہے اور سو بار سُنے۔ نبی کی حقیقت ذوجہتین ہے۔ ایک جہتِ خالق کہ جس سے اخذِ فیض کرتا ہے اور ایک جہتِ خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

نبی را دو وجہ ست دلجوے خلق	یکے سوی خالق یکے سوی خلق
بداں وجہ از حق بود مستفیض	بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ ”الولایۃ افضل من النبوۃ“، معنی اسکے صاف اور از روے انصاف یہ ہیں

کہ ولایت نبی کی وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے ۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوت خاص سے ۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اسی طرح ولی مستنیر ہے انوار نبوت سے ۔ مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں ۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھا نبوت کے ساتھ منقطع ہوگئی مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے ۔ اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہیگا ۔ اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت ہے ۔ ولایت و ہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو اررد کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مشہور دعیون اعیان امت اور منظور نظرا کا برملت ہوئی ہے ۔ مگر وہ بات اب کہاں کہ ایک بار لا الٰہ الا اللہ کہے اور دل نور معرفت سے منور ہو جاوے ۔ اور وہ ضامن زیست کہاں کہ قائل لا الٰہ الا اللہ کو اگرچہ اسکے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قدمگاہ توحید پر قائم کر دے ۔ یعنی رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم ۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے اور راحت بعد جراحت سچ بھی تو ہے ؛ آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اسکو کیونکر تسلی ہو ؛ یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے ۔

اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیچ | در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش مے دانی | ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے ۔ کہ وہ اطبا روحانی ہیں ۔ دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے اور بسبب

استیلاء وہم کے مشاہدۂ وحدت ذات سے محروم رہے جاتے ہیں ؛ ہرچند انکو سمجھائیں گے ، راہ پر نہ آئینگے ۔ ناچار اشتغال و اذکار وضع کئے تا قوت تخیلہ اسمیں الجھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جاوے ۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہوا اور ہم اسکو بجبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں ۔ دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست ٭

وہم صورتگری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہوگیا بے شبہہ اپنے کام سے یعنی صورتگری اور پیکر تراشی سے معزول ہوگیا ۔ بیخبری اور بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آگئی ۔ ایک دریا میں جان کر کودا ؛ ایک کو کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا ۔ انجام دونو کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں ، مگر ہاں کم ہیں ، اور مخفی ہیں ، اور کہیں کہیں ہیں ۔ اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بیخودی کے واسطے محتاج اشتغال و اذکار ہیں ؛ بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں ،،

نظم و نثر فارسی

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزانے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ اُنھوں نے حاصل کیا تھا۔ اُسکو اِس زمانے میں کما حقہ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ جبکہ اُس زمانے میں جب بہت سے سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے۔ مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدردانی کی شکایت کرتے تھے؛ تو اب کیا اُمید ہوسکتی ہے کہ لوگوں کو اُنکی قدر جتائی جاسکے۔ ہمسے اگر کچھ ہوسکتا ہے تو صرف اِس قدر ہوسکتا ہے کہ اُنکے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونے کے پبلک کے سامنے پیش کردیں؛ اور چونکہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہوگئی ہے اِسلئے جہاں جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں۔ اِس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوتِ متخیلہ میں جو غیر معمولی اُپج اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی سمجھدار آدمی اُسکا کسی قدر اندازہ کرسکیں؛ لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جسکے نقاد اور جوہری ملک میں کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔ اُسکی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھدینا کافی معلوم ہوتا ہے۔

بیا و رید گر اینجا بود زباندانے — غریبِ شہر سخن ہاے گفتنی دارد

البتہ ایک مختصر گر مرزا کے متعلق بیان بتا دینا ضرور ہے جو اُنکا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیئے۔

اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشّاق و ماہر و مسلّم الثبوت اُستاد کو ہونی چاہیئے؛

لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے۔ اِسی طرح مرزا بھی اِس کلیہ سے مستثنے نہ تھے۔ تصوف، حبِ اہلِ بیت، فخر، شوخی، ظرافت، رندی و بیباکی، بیانِ رنج و مصیبت و شکایت و زار نالی، اظہارِ محبت و ہمدردی، حسنِ طلب؛ یہ چند مَیدان ایسے تھے جنکا بیان مرزا کے تمام اصنافِ سخن میں اکثر نہایت لطیف و ملیح و پُر قبض واقع ہوا ہے۔ بیشک یہ بات اُنکے عشقیہ مضامین اور اخلاق و موعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی؛ کیونکہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملاتِ عاشق و معشوق کا بیان۔ جیسا کہ ظاہر ہے محض تبرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے۔ جسکو مرزا نے جابجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اِبا کرتا ہے۔ برخلاف اِسکے مرزا اصناف کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (اِلاماشاءاللہ) اِسی لئے اُنکے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ اخلاق و موعظت کا بیان بھی اِسی لئے موثر اور دلاویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہو دلوں میں گھر نہیں کرسکتا، مگر اِس سے مرزا کی اُستادی میں کچھ فرق نہیں آتا جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا "کہ ایں شیوہ ختم ست بر دیگراں" اور اُسکا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا۔ اور باایں ہمہ سعدی کی اُستادی کو سب نے تسلیم کیا۔ تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے مرزا کی اُستادی میں کیونکر فرق آسکتا ہے۔ یہ میزان جو ہمنے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے اُسکو اُنکے کلیاتِ نظم و نثر میں جانچنا چاہیئے؛ نہ انتخابی اشعار میں جو اِس کتاب میں درج کئے گئے ہیں؛

-مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پردازی کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اُسمیں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا جسکا زمانے میں کوئی قدردان نہ تھا۔ اُنکے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان واعیان تھے - جو فارسی زبان اور خاصکر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ اور سلاطین و امرا و رؤسا تھے - جنکو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت۔ وہ شخص - جسکا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے، جسکی غزل عرفی وطالب کی غزل سے سبقت لیجائے، جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے، اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثر پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں - اُسکو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا؛ اور وہ بھی چھہ سات برس سے زیادہ نہیں ملا - گورنمنٹ کے ارکان واعیان کی مدح کے جلدو میں مرزا کو اُس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا جو فوراً فروخت ہوکر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور اُنکے فارسی کلام پر ایمان بالغیب رکھنے والے بلاشبہہ مُلک میں بیشمار تھے؛ مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور اُنکی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔ پس جبکہ ممدوحوں کی قدردانی کا وہ حال ہو؛ اور مادحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ؛ تو پھر وہ کیا چیز تھی جسکو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہوسکتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے؛ بلکہ اُس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں - جو خواہی نخواہی اُسکو ترقی کرنے پر

مجبور کرتی ہیں؛ اوّلاً سبقِ استعداد اور فطری قابلیت جسکا اقتضا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدردان یا مخاطب صحیح نہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کئے بغیر نہیں رہتی۔ جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں اُسکو مستی اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گزیر نہیں اسی طرح وہ شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے بغیر اسکے کہ ملک میں کوئی اُسکی قدر کرے یا اُسکے کمال کی داد دے اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے اُس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اُس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اِس بات کا یقین ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقة سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبیعی اختتام کے قریب پہنچ چکی تھی؛ مگر حسنِ اتفاق سے اِس اخیر دور میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دارالخلافة دہلی میں ایسے پیدا ہوگئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ اِن چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدہلوی، مولانا مفتی محمد صدرالدین خاں متخلص بہ آزردہ، مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفیٰ خاں حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر، سید غلام علیخاں وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت اِن لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا اُنکی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں، ابوالفتح، فیضی، اور ابوالفضل کا اُنکے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ اِن بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہراً مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے؛

لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لئے جس طرح قدردانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے انکو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا ؛ اور انکے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لئے اظہار کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی ؛ اور اسطرح قدردان اور نکتہ چیں دونو انکی ترقی کے باعث تھے ۔

مولانا فضل حق باایں ہمہ علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے اُسکا اندازہ حکایت ذیل سے ہوسکتا ہے ۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے ۔ انھوں نے کچھ معنی بیان کئے ۔ اُسنے وہاں سے آکر مولانا سے کہا "آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں ، آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کئے ، اور پھر وہ شعر پڑھا ، اور جو کچھ مرزا نے اُسکے معنی کہے تھے بیان کئے ۔ مولانا نے فرمایا پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے ؟ اُسنے کہا برائی تو کچھ ہو یا نہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے ۔ مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لئے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اُسنے سخت غلطی کی ۔

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے ۔

توبدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب ۔۔۔ گر ترقی نکنم شیخ علی را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سُنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اسمیں بالکل مبالغہ نہیں ہے ۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے ۔

ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیوں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سُنکر کہا کہ "مومن خاں نے

لطیفہ

لطیفہ

یہ اسلئے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے "

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہمپایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے اُن کو بمراتب برتر اور بالاتر سمجھتے تھے ۔ نواب ضیاءالدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسروؒ) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اُسکا خاتمہ ہوگیا ۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیّہ کی طرف متوجہ ہوجاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبّی یا ابو تمام ہوتا ؛ اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا ۔

مولانا آزردہ بیشک مرزا کی طرز خاص کو جو اُنھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے ؛ اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہوگیا تھا وہ اخیر تک اُنکے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا ۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اُسمیں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا اُنکی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے ۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے ؛ اُسکے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں ۔

با چنیں اندہ کہ بگفتیم و دل خالی نشد ۔۔۔ خواجہ گر اندہ گسار من نبودے ۔ وائے من

آنکہ در یکتائی وے در فن فرزانگی ۔۔۔ متفق گردیدہ رائے بوعلی با رائے من

آنکہ چوں خواہد بنامش نامہ نامی ساختن ۔۔۔ برنگارد عقل فعالش "کرم فرمائے من"

دل بدیں وصفم نیاساید سخن کوتہ کنید　　　آنکہ ننگ اوست بودن ہم سخن ہمتاے من

یعنی بوعلی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق راے کرنا اور عقل فعّال کا اسکو دوکر ہمتاے من ،، لکھنا یہ سب باتیں اُسکی مدح کے لئے کافی نہیں ہیں ؛ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اُسکے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ اِسمیں قطع نظر اسکے کہ ممدوح کی اور اُس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جبکہ راقم بھی وہاں موجود تھا۔ آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے ؛ کھانے میں دیر تھی ؛ فارسی دیوانِ غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ اُن میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ اور جسکا مطلع یہ ہے۔

نشاطِ معنویاں از شرابخانہ تست　　　فسونِ بابلیاں فصلے از فسانہ تست

مرزا نے وہ اوراق اُٹھا لئے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا ،، دیکھئے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے ،، یہ کہکر غزل پڑھنی شروع کی۔ اوّل کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی ؛ مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ اُنکی عادت تھی کہنے لگے ،، کلام مربوط ہے مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے ،، سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی - مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کرکے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی　　　مباش منکرِ غالب کہ در زمانہ تست

اُسوقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے۔

صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اُس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا اِس لئے وہ مرزا کو اور مرزا اُنکو کم مانتے تھے ؛ لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مُٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی - مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی اُن کی اصلی ترقی کی بنیاد تھی۔

غزل معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اوّل مرزا بیدل کی طرز میں کہنی شروع کی تھی چنانچہ اِس قسم کی بہت سی غزلیں اُنکے دیوان میں ابتک موجود ہیں مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری، نظیری، اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں جسکا ترجمہ یہ ہے ،، اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر اُن لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب اُن لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے - دیکھا کہ میں باوجودیکہ اُنکے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں ؛ اُنکو میرے حال پر رحم آیا اور اُنھوں نے مجھپر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھکو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادّہ جو مجھ میں تھا اُسکو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادراہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھکو سکھایا۔ اب اِس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں ستارہ

جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر انکی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکی غزل میں نہ صرف نظیری۔ بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور انکے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے۔ کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ انکی غزل بلاشبہہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے لیکن طرزِ بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔

"ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں۔ جن میں عنصری سے لیکر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سر آوردہ ہوا ہے اسکا نام لیا ہے۔ انکے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل ابیات اور اسپر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لئے ہم اسکو یہاں نقل کرتے ہیں ناظم کہتا ہے۔

"شنیدم کہ در دورگاہِ کہن — شد عنصری شاہ صاحب سخن

چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہِ مہی

چو فردوسی آور دسر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن

چو خاقانی از دار فانی گذشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت

نظامی چو جام اجل در کشید — سرِ چترِ دانش بہ سعدی رسید

چو اورنگ سعدی فرو شد ز کار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید"

اسکے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اسکو مرزا نے یوں پورا کیا ہے

"ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید"

اگرچہ مرزا نے بیدل اور انکے متبعین کی زبان اور انکے اندازِ بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہلِ زبان کے طریقے سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے تھے۔ مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخرکار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس مقام پر انکی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کرینگے جنکے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور انکے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخابِ غزلیات فارسی

شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری — طرۂ پُر خم صفات موی میاں ماسوا

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے تو اسکا طرۂ پُر خم کیا ہوگا؟ صفات الٰہی۔ اور اسکا موی میاں کیا قرار پائیگا؟ ماسوی اللہ۔ شعرائے متصوفین صفاتِ الٰہی کو اکثر زلف و گیسو اور طرہ و کاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اور چونکہ ماسوے اللہ کو صوفیہ معدوم محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں۔ اس لئے شاہدِ حسنِ حقیقی کی کمر ماسوے کو قرار دیا ہے۔

آب نہ بخشی بزہر خونِ سکندر ہدر — جاں نہ پزیری ہیچ نقدِ خضر ناروا

ہدر یعنی حلال۔ مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیواں کی تلاش میں گیا تھا مگر ناکام رہا۔ کہتا ہے کہ تو زہر کو

جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے ، مگر اُنکی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنکی غزل میں نہ صرف نظیری۔ بلکہ عرفی ، ظہوری ، طالب آملی ، جلال اسیر اور اُنکے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے ۔ البتہ اس لحاظ سے۔ کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ اُنکی غزل بلاشبہہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے لیکن طرزِ بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔

"ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں۔ جن میں عنصری سے لیکر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سر آوردہ ہوا ہے اُسکا نام لیا ہے۔ اُنکے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل مثنوی اور اُس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لئے ہم اُسکو یہاں نقل کرتے ہیں ناظم کہتا ہے ۔

"شنیدم کہ در دورگاہِ کہن   شدہ عنصری شاہِ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی   بہ فردوسی آمد کلاہِ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن   بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گذشت   نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل درکشید   سرِ چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگِ سعدی فرو شد ز کار   سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید   ز جامی سخن را تمامی رسید"

اسکے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اُسکو مرزا نے یوں پورا کیا ہے

"ز جامی بہ عرفی و طالب رسید   ز عرفی و طالب بہ غالب رسید"

اگرچہ مرزا نے بیدل اور اُنکے متبعین کی زبان اور اُنکے اندازِ بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہلِ زبان کے طریقے سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتے تھے۔ مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخرکار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس مقام پر اُنکی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کرینگے جنکے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور اُنکے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخابِ غزلیاتِ فارسی

"شاہدِ حسنِ ترا در روشِ دلبری   طرۂ پُرخم صفات موی میاں ماسوا

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے تو اُسکا طرۂ پُرخم کیا ہوگا؟ صفاتِ الٰہی۔ اور اُسکا موی میاں کیا قرار پائیگا؟ ماسوی اللہ۔ شعرائے متصوفین صفاتِ الٰہی کو اکثر زلف و گیسو اور طرہ و کاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اور چونکہ ماسوے اللہ کو صوفیہ معدومِ محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں۔ اس لئے شاہدِ حسنِ حقیقی کی کمر ماسوے کو قرار دیا ہے۔

آب نہ بخشی بزور خونِ سکندر ہدر   جاں نہ پذیری بہیچ نقدِ خضر ناروا

ہدر یعنی حلال۔ مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیواں کی تلاش میں گیا تھا مگر ناکام رہا۔ کہتا ہے کہ تو زور حکومت

سے کسی کو پانی نہیں دیتا، پس اگر سکندر آبِ حیواں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہوجائے تو ہو۔ دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے، یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے مگر تو اُسکو قبول نہیں کرتا، اور اِس لئے اُسکو کسی طرح موت نہیں آتی۔

بزمِ ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب　　　سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرّب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ مبتلائے حوادث و مصائب والآم ہیں۔

سادہ ز علم و عمل مہرِ تو ورزیدہ ام　　　مستی ما پایدار بادۂ ما ناشتا

ناشتا نہار مُنہ رہنا اور کچھ نہ کھانا نہ پینا - دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گو میں نے شراب کا ایک قطرہ نہیں پیا مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں، یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا مگر تیری محبت میں سرشار ہوں

قطعہ

۱　اے خاکِ درت قبلۂ جان و دلِ غالب　　　کز فیضِ تو پیرایۂ ہستی ست جہاں را

۲　تا نامِ تو شیرینی جان داده بگفتن　　　در خویش فرو برده دل از مہر زبان را

یعنی آنحضرتؐ کا نام مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی کہ دل نے پیار سے اُسکو اپنے اندر اُتار لیا۔

ماہمائے گرمِ پروازیم فیض از ما مجوے　　　سایہ ہمچوں دود بالا مے رود از بال ما

یعنی ہماری پرواز میں اِس قدر گرمی ہے کہ جس طرح دُھواں آگ کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے اِسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دُھوئیں کی طرح پروں کے اوپر اوپر جاتا ہے۔

حالِ ما از غیر می پرسی و منت می بریم　　　آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حالِ ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے ہم اِسی بات کے شکر گذار ہیں، غنیمت ہے کہ تو اِس بات سے تو آگاہ ہے کہ تجھکو ہمارے حال کی خبر نہیں۔

دلِ مایوس ز تسکین مردن میتوان دادن　　　چہ امید ست آخر خضر و ادریس و مسیحا را

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن　　　ز خود رفتیم و ہم باخویشتن بردیم دنیا را

وقتِ تاراجِ غمِ تست چہ پیدا چہ نہاں　　　ہمچو رنگ از رخ ما رفت دل از سینۂ ما

جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دار د خلد　　　لبِ لعلِ تو ہم این است و ہم آنست مرا

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت　　　منتے بر قدمِ راہ رواں ست مرا

یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرمی رفتار سے جل گئے ہیں، پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ اُنکے لئے میں نے رستہ بالکل صاف کردیا ہے۔ یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو اُلجھاؤ تھے وہ سب مَیں نے اِس طریقے پر چلکر دور کردئے ہیں اور آیندہ آنے والوں کے لئے راہ صاف کردی ہے۔

رہروِ تفتہ بدر رفتہ بہ آبم غالب　　　توشہ بر لبِ جو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اُس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لُو سے جلا بُھنا، پانی کو دیکھکر بے اختیار اُسمیں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے پر اُسکا زادِ راہ پڑا رہجائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اِس شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھکو محض اٹکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں - جیسا کہ مَیں ہوں، سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

دنیا

سایہ و چشمہ بصحرا دمِ عیشے دارد اگر اندیشہ منزل نبود رہزنِ ما

یہ دنیا کی مثال ہے؛ یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے. مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے اس لئے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا.

زمانہ

مے پرد مور مگر جاں بسلامت ببرد تا چہ برق ست کہ شد نامزدِ خرمنِ ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہماری خرمن پر کون سی بجلی گرنیوالی ہے کہ چیونٹے جان بچا نیکے لئے پہلے ہی سے اڑے جاتے ہیں. تمثیل کے پیرائے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا.

فخریہ

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

یعنی ہمارے خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے؛ گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اٹھتا.

فخریہ

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب شعرِ خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے یعنی ہمنے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہمکو مجبور کیا کہ ہم اسکو اپنا فن قرار دیں.

شکایت

یا بندۂ خود ایں ہمہ سختی نمی کنند خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

یہ خطاب خداوند حقیقی کی طرف ہے؛ یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کیجاتی ہے؟

فخریہ

بر روے حاسداں در دوزخ کشودہ رشک از بہرِ خویش جنتِ در بستہ ایم ما

یعنی ہم اپنا کمال دیکھکر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لئے جنتِ دربستہ ہیں پس چونکہ ہماری

جنت کی کیفیت سے اور جو اسمیں لذت و راحت ہے اُس سے حاسد لوگ بیخبر ہیں۔ اسلئے رشک سے اُنکی یہ حالت ہے کہ گویا اُنپر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے.

تصوف

سوزِ ترا رواں ہمہ در خویشتن گرفت از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے؛ اور ذرہ برابر کسی کیلئے اُسمیں سے حصہ نہیں چھوڑا. پس ہم جو اپنے جگر کو داغ دار قرار دیتے ہیں درحقیقت اُسپر تہمت رکھتے ہیں.

با چون توئے معاملہ بر خویش منت است از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

روئے سیاہِ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم شمعِ خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما

کدوئے چوں زمے یابم بخیانِ خویشتن بالم کہ پندارم سر آمد روزگارِ بے نوائیہا

یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونبا مجھکو ملجاتا ہے تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ بس اب بے سروسامانی کا زمانہ ختم ہوا.

سخن کوتہ مرا ہم دل بتقوے مائل ست اما زننگِ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا

یعنی زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہے اسلئے میری کفار کی سی حالت ہے ورنہ تقوی کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا.

در مشربِ حریفاں منعت خود نمائی بنگر کہ چوں سکندر آئینہ منیست جم را

حریفاں کا لفظ فارسی میں ایسا ہے جیسا اُردو میں یار لوگوں کا لفظ؛ اور لفظی معنی اسکے ہم پیشہ ہیں جب شرابخوار کسی کو حریف یا حریفاں کہتا ہے تو اُس سے مراد شرابخوار ہوتی ہے/ کہتا ہے کہ ہم

شرابخواروں کے مشرب میں خود نمائی منع ہے۔ دیکھو جمشید جو بادہ نوشی میں ضرب المثل ہے اُسکے ہاں آلۂ خود نمائی یعنی آئینہ جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا۔ نہ تھا۔

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی　　بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار بیا

یعنی اگر تو نے ہمسے توڑکر غیروں کے ساتھ پیمان باندھا ہے تو اسکا خیال نکر اور بے تکلف ہمارے پاس چلا آ، کیونکہ عہدِ وفا توڑنے ہی کے لئے باندھا جاتا ہے؛ وہ کبھی استوار نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھکر ٹوٹ گیا۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد　　ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

یعنی وداع میں اَور لطف ہے اور وصل میں اَور لذت ہے بس ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار کے لفظ نے شعر کو زیادہ بلیغ کر دیا ہے، کیونکہ شاعر باوجودیکہ لذت میں وداع اور وصل دونو کو یکساں قرار دیتا ہے مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا؛ اور جانے کے لئے ہزار بار اور آنے کے لئے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے۔

رواجِ صومعہ ہستی ست زینہار مرو　　متاعِ میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

یعنی صومعہ میں ہستی و پندار و غرور کا رواج ہے وہاں ہرگز نہ جا؛ اور میکدے کی جو کچھ پونجی ہے وہ مستی ہے؛ یہاں ذرا ہوشیار ہوکر یعنی ظرفِ عالی لیکر آنا چاہئے۔ مستی حاصل کرنے کے لئے ہوشیار ہوکر آنا۔ اِسمیں جو لطف ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

چوں بقاصد بسپرم پیغام را　　رشک نگذارد کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکیِ روزم نہاں　　کو چراغے تا بجویم شام را

یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اُسکی تاریکی دونو مل گئیں؛ اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود　　خوش بود گر دانہ نبود دام را

یہ وہی مضمون ہے جو مرزا نے اُردو میں اس طرح باندھا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

دلستاں در خشم و غالب بوسہ جو　　شوق نشناسد ہمے ہنگام را
در ہجر طرب بیش کند تاب و تبم را　　مہتاب کفِ مارِ سیاہ ست شبم را

یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامانِ عیش و طرب مہیا ہوتا ہے اُس سے میری بیقراری اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش و طرب کی محرک ہے وہ میری رات کے حق میں مارِ سیاہ کے پھین کا حکم رکھتی ہے۔

تشنہ لب ساحلِ دریا زغیرت جاں دہم　　گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر مجھکو یہ شبہ بھی گذرے کہ دریا نے مجھے دیکھکر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحلِ دریا پر جان دیدونگا مگر حلق تر نکرونگا۔

بیابانِ محبت یاد می آرم زمانے را　　کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را

اِس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے؛ کہ اب انتہائے محبت میں جبکہ معشوق کی طرف سے ظلم و ستم و بیوفائی کی کچھ حد نہیں رہی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے دل اُسکو دیا تھا اُسوقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالانکہ دل کا دینا کوئی اختیاری بات

نہیں ہے! کہ جس طرح بیع و شرا اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں اُسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لیجاتی۔

آوازۂ شرع از سرِ منصور بلند ست   از شب روی ماست شکوہ عسسِ ما

شب روی۔ چوری کے لئے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دیجائے تو شریعت کی شان و شوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ بس ہم جو مرتکب جرائم ہوتے ہیں گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

وقتست کہ خونِ جگر از در دبجوشد   چندانکہ چکد از مژۂ دادرسِ ما

کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خونِ جگر در دے اسقدر اُبلے کہ حاکم دادرس کی پلکوں سے جا ٹپکے۔

در دہر فرو رفتۂ لذت نتواں بود   بر قند۔ نہ بر شہد نشیند مگسِ ما

یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں مگر اُن میں پھنستے نہیں جیسے وہ مکھی جو قند پر بیٹھتی ہے کہ جب چاہا اُڑ گئی نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر اُبھر نہیں سکتی۔

بادۂ شبگیری ما بید۔ و کنارِ کشتِ ما   کوثر و سلسبیلِ ما۔ طوبیٰ ما بہشتِ ما

حسرتِ وصل از چہ رو۔ چون بخیال سرخوشیم   ابر اگر بابستد۔ بر لبِ جوست کشتِ ما

یعنی جبکہ ہم خیال دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔ اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے، ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

بردہ صد ابلیس بسر بر سر صد ہزار خشم   گر بنہی در آفتاب بادہ چکد ز خشتِ ما

بادہ اگر بود حرام۔ بذلہ خلافِ شرع نیست   دل نہ نہی بہ خوب ما طعنہ مزن بزشتِ ما

زہاد کی طرف خطاب ہے جو شرابخواری اور رندانہ بذلہ سنجی دونو کو بُرا سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سنجی تو خلافِ شرع نہیں ہے! اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے پسند نہیں کرتا تو بذلہ سنجی جو ہماری ادنی درجے کی چیز ہے اُسپر تو طعن مت کر۔

گفت بحکمِ حسرتی غالبِ خستہ این غزل   شاد ہمی شود طبع و فا سرشتِ ما

یہ غزل غالباً اُس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جبکہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم متخلص بہ حسرتی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی، و صہبائی، و آزردہ، اور مومن اور نیر وغیرہم سب اُسمیں شریک ہوتے تھے اس مقطع میں مرزا نے مصرع طرح کو تضمین کیا ہے اب اسکے معنی یہ ہوگئے کہ ہمسے جو اِس طرح پر غزل لکھنے کی فرمائش کی گئی ہماری طبعِ وفا سرشت دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد شاد ہو جاتی ہے۔

مُردم ز فرطِ ذوق و تسلّی نمی شوم   یارب کجا برم لبِ خنجر ستاے را

کہتا ہے کہ دوست کے خنجر نے وہ مزا دیا ہے کہ اُسکی تعریف کرتا کرتا مر گیا؛ اور پھر بھی تسلّی نہوئی الٰہی اس لبِ خنجر ستا کو کہاں لیجاؤں کہ جہاں جا کر تسلّی ہو۔

شبہم تاریک و منزل دور و نقشِ جادہ ناپیدا   ہلاکم جلوۂ برقِ شراب گاہ گاہے را

پہلے مصرع میں اپنی مشکلات کو شبِ تاریک وغیرہ کی تمثیل میں بیان کیا ہے دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں ہلاک یعنی قربان ہوں برق شراب کی چمک پر جو کبھی کبھی چمک جاتی ہے اور اُس اندھیرے میں کچھ روشنی نظر آجاتی ہے مطلب یہ کہ شراب جو کبھی کبھی مل جاتی ہے صرف اُسکی بدولت میرا غم غلط ہوتا ہے۔

مے باندازہ حرام آمدہ - ساقی برخیز　　　شیشہ خود بشکن بر سرِ پیمانۂ ما

برخلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے تو اٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار اس شعر میں افراط شوق کی تصویر کھینچی ہے خواہ کسی چیز کا شوق ہو جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گذر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اُسکی خواہش کیجاے جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے تو پیاسا دریا کو دیکھکر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں بس گو کہ مضمونِ شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن اُسکا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پا سکتا ہے۔

مو بر آید ز کفِ دست اگر دہقاں را　　　نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دانۂ ما

ظاہر ہے کہ انسان کی ہتیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی - کہتا ہے کہ اگر کاشتکار کی ہتیلی میں بال بھی نکل آئیں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اُسمیں سے ریشہ نکل آئے یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔

خرابیم و رضایش در خرابیہای ما باشد　　　ز چشمِ بد نگہدار د خدا ما دوستکاماں را

خراب - مست، ویران، اور تباہ، تینوں معنوں میں آتا ہے۔ دوست کام وہ شخص جسکی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو، یعنی عمدہ حالت ہو۔ کہتا ہے کہ ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں پس ہم دوست کاموں کو جنکی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالےٰ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

بسا افتادہ۔ سرمست و بسا افتادہ در طاعت　　　تو دانی تا بہ لطف از خاک برداری کداماں را

عالم آئینۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں　　　تابِ اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

یعنی اگر تو سوچ نہیں سکتا تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کہ اُسکا ظاہر اور باطن سب مظہرِ اسرارِ الٰہی ہے۔

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار　　　نیست گر صبحِ بہارے شبِ ماہے دریاب

گر پس از جور بہ انصاف گراید چہ عجب　　　از حیا روے بما گر ننماید چہ عجب

کہتا ہے کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں یعنی اپنے پچھلے ظلم یاد کر کے حیا سے ہمکو منہ نہ دکھلائے تو کچھ تعجب نہیں مطلب یہ کہ انصاف بھی کریگا تو اس طرح کریگا کہ ہم اُسکے دیکھنے سے محروم رہیں۔

بو دش از شکوہ خطر ور نہ سری دشت بمن　　　بزرم اگر از مہر بیاید چہ عجب

خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔

با چنیں شرم کہ از ہستیِ خویشتن باشد　　　غالب از رخ بر دوست فنا ید چہ عجب

یعنی اس شرم سے کہ اپنے تیئں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے تو کچھ تعجب نہیں۔

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمد است　　　آرے کلامِ حق بزبانِ محمد است

آئینہ دار پرتوِ مہر است ماہتاب　　　شانِ حق آشکار ز شانِ محمد است

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است　　　اما کشادِ آں ز کمانِ محمد است

دانی اگر بمعنیِ لولاک وا رسی　　　خود ہر چہ از حق است از آنِ محمد است

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد　　　سوگندِ کردگار بجانِ محمد است

واعظ! حدیثِ سایۂ طوبےٰ فروگذار — کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را — کاں نیمہ جنبشی ز بنانِ محمدؐ است
ور خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود — آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است
غالبؔ ثنای خواجہ بہ یزداں گذاشتیم — کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

یہ غزل مرزا نے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا کی زندگی ہی میں اس غزل کی تخمیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چونکہ وہ تخمیس اب تک شائع نہیں ہوئی اسلئے مقتضائے مقام یہ ہے کہ اسکو بھی اس غزل کے ساتھ نقل کر دیا جائے۔

اعجاز از خواصِ لسانِ محمدؐ است — عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمدؐ است
گر نور و گر ہدے کہ ازانِ محمدؐ است — حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است

دانی ز پیشِ چشمِ تو برخیزد ار حجاب — کز نورِ شمع پردۂ فانوس راست تاب
باشد ظہورِ روشنیِ عارض از نقاب — آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

لطفِ خداست گر بکسے نہاد دست — قہرِ خداست چوں ز سرِ کیں بحملہ جست
داند کسیکہ شد ز رمے مارمیت مست — تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

گوئی اگر بعالمِ ادراک وارسی — بینی اگر بہ دیدۂ دراک وارسی

سنجی اگر بمرتبہ خاک وارسی — دانی اگر بمعنیِ لولاک وارسی
خود ہر چہ از حق است ازانِ محمدؐ است

شاہد بقتلِ عاشق و عاشق بجانِ خود — مجنوں بپائے لیلیٰ و لیلیٰ بعزِ خود
مومن بہ آلِ احمد و آتش بروحِ جد — ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است

اے خامہ وصفِ قامتِ معشوق کم نگار — اے دل سخن ز راستیِ قد اں میاں میار
قمری! ز ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار — واعظ! حدیثِ سایۂ طوبےٰ فروگذار
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

حکمش بمہر و ماہ رواں است چوں قضا — دیدی کہ باز گشتنِ خورشید بر قفا
بودہ است بر اشارۂ ابروی مصطفےٰ — بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است

آنجا کہ از مناقبِ عترت سخن رود — ور آل و از صحابۂ وے ہست سخن رود
داں کانہمہ ز ختمِ رسالت سخن رود — ور خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است

ہمت بمدحِ شہ من و حالی گماشتیم — گفتیم واز نگاشتنی ہا نگاشتیم
چوں کام و لب فراخورِ وصفش نداشتیم — غالبؔ ثنائے خواجہ بیزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

شوخی

بیخود بوقتِ ذبح تپیدن گناہ من — دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

یا واز عدو نیارم وا نیهم زدور بنیست — کاندر دلم گذشتن با دوست ہمنشینی ست

کہتا ہے میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا یہ دور بینی کی بات ہے کیونکہ میرے دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے اگر رقیب کا خیال دل میں آئیگا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہمنشیں ہوجائیگا۔

شوخی

من سوی او بہ بینم دانند زبیحیائی ست — او سوی من نہ بیند دانم زشرمگینی ست

عاشقانہ

چہ فتنہ ہا کہ در اندازۂ گمانِ تو نیست — قیامت است - دلِ دیر مہربانِ تو نیست

رواں فدای تو با نامِ کہ بُردۂ ناصح؟ — زہے لطافتِ ذوقیکہ در بیانِ تو نیست

چونکہ ناصح ترکِ عشق کی نصیحت کرتا ہے اس لئے معشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی طرح نہیں لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کرکے کہتا ہے کہ میری جان تجھپر قربان ہو! تونے کسکا نام لیا؟ وہ کیسی لطافت اور لذت ہوگی جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے؟ یعنی جس طرح اُسکا نام لینا چاہئے تھا اگر اُس طرح تو بھی وہ نام لیتا تو کیسی لطافت اور لذت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چونکہ ناصح نے بُری طرح سے اُسکا نام لیا تھا۔ اس لئے کہتا ہے کہ وہ کیسی لطافت ہوگی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔

عاشقانہ

دل از خموشیِ لعلت امیدوار چراست — چہ گفتۂ بزبانے کہ در دہانِ تو نیست

معشوق نے مُنھ سے کچھ نہیں کہا مگر اُسکی نگاہ یا تبسم یا کسی اور ادا سے اُسکے التفات یا وصل کی امید بندھی ہے پس کہتا ہے کہ تیرے لعل لب کی خاموشی سے میرا دل اس قدر کیوں امیدوار ہے تونے اُس زبان سے جو تیرے مُنھ میں نہیں ہے کیا کہدیا ہے جس سے اُسکو امید بندھی ہے۔

عاشقانہ

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی — بد است مرگ و لے بدتر از گمانِ تو نیست

انحراف

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست — قعرِ دریا سلسبیل و روی دریا آتش ست

دوسرے مصرع میں عرفی کے مضمون کو اُلٹا ہے۔ اُسنے۔ اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے۔ یوں کہا تھا ”روی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست“ مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ دریا میں انسان جبھی تک بیچین رہتا ہے جب تک کہ ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جب ڈوب گیا پھر کچھ بھی بے چینی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ ”قعرِ دریا سلسبیل و روی دریا آتش ست“

شوخی

پاک خور امروز و زنہار از پےِ فردا منہ — در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

جو لوگ شرابِ طہور کی امید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے اُسکو کل کیلئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پس اُن سے کہتا ہے کہ ”پاک خور امروز“ یعنی سب آج ہی نبیڑ دے اور کل کیلئے مت رکھ! کیونکہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے اور کل وہی آگ ہو جاویگی۔

تصوف

زوہم نقشِ خیالی کشیدۂ ورنہ — وجودِ خلق چو عنقا بدہر نایاب است

تصوف

قوی فتادہ چو نسبت - ادب مجو غالب — ندیدۂ کہ سوی قبلہ پشتِ محراب است

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے تو پھر آدابِ ظاہری کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ دیکھو! قبلہ کی طرف پشت کرنا ہر ایک کے لئے خلافِ ادب ہے! مگر محرابِ مسجد جسکو قبلہ سے نہایت مضبوط تعلق ہے۔ اُسکی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے۔

شوخی

ہر چہ فلک نخواستہ است ہیچکس از فلک نخواست — ظرفِ فقیہ نے نجست بادۂ ما گزک نخواست

بحث و جدال بجای ماں۔ بیکدہ جوی کا ندراں — کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

بجائے ماں بمعنی بجائے دار یعنی بحث و جدال کو یونہیں رہنے دے اور میخانے میں جا کر وہاں نہ جمل کا جھگڑا ہے نہ فدک کا قصہ ہے جمل سے مراد جنگ جمل ہے جسمیں حضرت عائشہ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہو کر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجوروں کا باغ تھا جسپر حضرت سیدۃ النسا فاطمہ زہرا نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعوے کیا تھا یہ دونو جھگڑے منجملہ ان بیشمار نزاعوں کے ہیں جسپر سنی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے۔

دل جلوہ میدہد ہنر خود در انجمن — رحمے مگر بجان حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا اب علی الاعلان اپنے ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں گویا اب حاسد کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔

غالبؔ بہاں بریدہ و آگندہ گوش نیست — آنا دماغ گفت و شنودش نماندہ است

بلبل بدولت بنالۂ خونیں بہ بند نیست — آسودہ زی کہ یار تو مشکل پسند نیست

یعنی اے بلبل تو اپنے نالۂ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے، جب چاہتی ہے نالہ کرتی ہے۔ بس تو آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گل مشکل پسند نہیں ہے۔ بخلاف ہمارے کہ ہمکو رونے اور فریاد کرنے کی بندی ہے، حالانکہ نالۂ خونیں سے دل بھرا ہوا ہے۔

بے خود بزیر سایۂ طوبے غنودہ اند — شبگیر رہروان تمنا بلند نیست

یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں انکا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے انکا منتہاے مقصود طوبے کے سایہ میں آرام کرنا ہے۔

اختری خوشتر از نیم بجہاں می بایست — خرد و پیر مرا بخت جواں می بایست

تا تنک مایہ بدریوزہ خود آرا نشود — نرخ پیرایۂ گفتار گراں می بایست

گفتم بروزگار سخنور چو من بسی ست — گفتند اندریں کہ تو گفتی سخن بسی ست

مشکیں غزالہا کہ نہ بینی بہیچ دشت — در مرغزارہاے خطا و ختن بسی ست

در صفحہ نبودم ہمہ آں چہ در دل ست — در بزم کمتر ست گل و در چمن بسی ست

در از دستی من چاکے ار فگند چہ عیب — ز پیش دلق ورع با ہزار پیوند است

نگفتہ کہ بہ تلخی لب از و پند پذیر — برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یہ خطاب ناصح کی طرف ہے۔

اگر نہ بہر من۔ از بہر خود عزیزم دار — کہ بندہ۔ خوبی او خوبی خداوند است

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم — با ما سخن از طوبی و کوثر نتواں گفت

یعنی ہمکو آگے جانے کی جلدی ہے ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبی اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است — بر دار تواں گفت بمنبر نتواں گفت

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا — مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

گفتم ز کہ پرسم اثر عمر گذشتہ — ساقی بقدح بادۂ دہ سالہ فرو ریخت

در قالب ملا اثر ش پردہ کشا شد — خاکے کہ قضا در تن گم سالہ فرو ریخت

گر منافق۔ وصل ناخوش در موافق۔ ہجر تلخ — دیدہ وا غم کرد روے دوستاں دیدن قدا شست

یعنی دوستوں کا منھ دیکھنا اور انسے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہیئے تھا، کیونکہ جو منافق ہیں انکا ملنا ناگوار ہے

اور جو موافق ہیں اُن کی جدائی تلخ ہے۔

انسان

بُرد آدم از امانت ہرچہ گردوں بر نتافت — ریخت مے برخاک چوں در جام گنجیدن نماند است

یعنی بارِ امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اُٹھ سکا وہ انسان نے اُٹھایا گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پہ گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لئے اور جام آسمان کے لئے کس قدر مناسب واقع ہوا ہے۔ اور بارِ امانت جو انسان پر ڈالا گیا اُسکی تشبیہ اُس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے!!

بدیں نیاز کہ با تست۔ ناز می رسدم — گدا بسایۂ دیوار پادشا خفت است

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز — گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

عسس بخانۂ و شہ در حرم سرا خفت است — غمت بہ شہر شبیخوں زناں بہ بنگۂ خلق

یعنی کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ حرم سرا میں آرام کرتے ہیں۔ اُنھیں کیا خبر ہے کہ تیرا غم یعنی عشق شہر میں خلقت کے گھروں پر شبخوں مار رہا ہے۔

دلم بہ سبحۂ و سجادہ و ردا لرزد — کہ دزدِ مرحلہ بیدار و پارسا خفت است

کہتا ہے کہ پارسا یعنی زاہد تو اس گھمنڈ میں کہ میں عبادت میں مصروف ہوں غافل ہے اور دزدِ مرحلہ جو منزلگاہ میں لگا ہوا ہے یعنی نفسِ اَمارہ جاگ رہا ہے، یعنی تاک میں بیٹھا ہے۔ پس مجھے سبحہ و سجادہ و ردائے زاہد کی خیر نہیں معلوم ہوتی، اِسلئے میرا دل کانپ رہا ہے۔

ببیں ز دُور و مجو قربِ شہ کہ منظر را — دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفت است

قربِ درگاہِ الٰہی میں جو مشکلات و خطرات ہیں اُنکو بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ دُور ہی سے دیکھ لے

اور قُرب کا طالب نہو۔ اگرچہ منظر کے پٹ کھلے ہوئے ہیں مگر دروازے پر اژدہا سوتا ہے۔

براہ خفتنِ ما ھمرہ کہ بنگرد داند — کہ میرِ قافلہ در کارواں سرا خفت است

کہتا ہے کہ میں منزل پر پہنچنے سے پہلے راہ ہی میں ایسا غافل و بے خبر سوتا ہوں جیسے کہ کارواں سالار منزل پر پہنچکر آرام سے پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہے۔

دگر ز ایمنیِ راہ و قربِ کعبہ چہ حظ — مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفت است

قفس و دام را گناہے نیست — ریختن در نہادِ بال و پر است

نہاد۔ جبلّت کو کہتے ہیں۔ قفس اور دام دونو جانور کے لئے تکلیف اور اذیت کے مقام ہیں جہاں اکثر جانور تڑپ تڑپ کر مرجاتا ہے اور اُسکے بال و پر گرجاتے ہیں۔ یہاں قفس اور دام سے دنیا اور اُسکی تکلیفات مراد ہیں۔ کہتا ہے کہ قفس اور دام پر کچھ الزام نہیں ہے بال و پر گرنے ہی کے لئے بنے ہیں اور جاندار مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند — ہم خزاں ہم بہار در گذر است

یعنی خزاں اور بہار دونوں رفتنی ہیں، اُسمیں پتے جھڑتے ہیں تو اِسمیں پھول جھڑتے ہیں۔

بے تو گزیستہ ام سختیِ ایں درد بسنج — بگذر از مرگ کہ وابستہ ہنگامی ہست

یعنی موت کے لئے تو ایک وقت معین ہے اُس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں، بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیونکر رہا اور کیونکر جدائی کے رنج اور تکلیف کو برداشت کیا۔

کیست در کعبہ کہ رطلے ز نبیدم بخشد — در گروگاں طلبد جامۂ احرامے ہست

رطل پیمانۂ شراب۔ نبید۔ شراب۔ گروگاں وہ شے جسکو گرو رکھیں۔ جامۂ احرام وہ بن سلا کپڑا

جو مناسک حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

(عاشقانہ)

نہ بر جستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد — سوختم۔لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

رماد۔ راکھ۔ پہلا سوختم لازمی۔ دوسرا سوختم متعدی۔کہتا ہے میں جل تو ضرور گیا مگر معلوم نہیں اُسنے کس طرح مجھے جلا دیا؛ نہ کوئی پتنگا اُڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔

(عاشقانہ)

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مُدام — داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

دوست کو حور سے۔ بادہ کو کوثر سے۔ اور خلوت کو دار السّلام یعنی جنّت سے تشبیہ دی ہے۔

(شوخی)

دلخستۂ غمیم و بود مئے دوا سے ما — با خستگاں حدیثِ حلال و حرام چیست
یعنی بیماران و معذوران

از کاسۂ کرام نصیب است خاک را — تا از فلک نصیبۂ کاسِ کرام چیست

(شوخی)

نیکی ز تست از تو نخواہیم مُزدِ کار — در خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

یعنی اگر ہمنے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے اُسکی اُجرت ہم نہیں چاہتے اور اگر ہم بد ہیں تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں پھر سزا کس لئے ہے۔

(شوخی)

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت — پرسد چرا کہ نرخِ مئے لعل فام چیست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا پس اُسنے اُنکو اگر بیچ نہیں دیا تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے بہم فروخت کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونوں کو ایک ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا تو شراب کی قیمت نہ ادا ہوسکیگی۔

(عاشقانہ)

لطفِ خدا ے۔ ذوق نشاطش نمیدہد — کا فر دلے کہ با ستمِ دوست خو گرفت

یعنی وہ کا فر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو اُسکو خدا کی مہربانی میں بھی مزا نہیں آتا۔ لطا

یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے؛ مگر درحقیقت یہ ایک فیکٹ ہے جو ہوا و ہوس کے کوچے میں ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ بوالہوس لوگ سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں؛ جدائی کے صدمے، رشک کی جلن، ذلت و بے آبروئی، معاشیق کی بے التفاقی و بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں مگر ہوا و ہوس سے باز نہیں آتے؛ اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعثِ خوشنودی خدا ہے اُسکو اختیار نہیں کر سکتے۔

(فخریہ)

رضواں چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد — بے چارہ باز داد و مئے مشکبو گرفت

(فخریہ)

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم — نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی ست

یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے پس اگر اصولِ مذہب سے واقف نہوں تو مجھکو معذور سمجھنا چاہئے۔

(درس تصوف)

نشاطِ جم طلب از آسمان نہ شوکتِ جم — قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبی ست

دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی۔یعنی انگوری شراب چاہئے جس سے جمشید کا سا عیش حاصل ہو یاقوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسر ہو تو نہ سہی۔

(فخریہ)

ہر آنچہ در نگری جز بجنس مائل نیست — عیارِ بیکسیِ من شرافتِ نسبی ست

یعنی جسکو دیکھئے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافتِ نسب میں کوئی میری مثل نہیں ہے اِسلئے میری طرف کوئی مائل نہیں ہے؛ اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

(تصوف)

نشاطِ معنویاں از شرابخانۂ تست — فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

اس تمام غزل میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔

تصوف

بجام و آئنہ حرفِ جم و سکندر چیست | کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گذرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

تصوف

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہان ما را | قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدہ میں۔ مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے

تصوف

سپہر را تو بتاراج ما گماشتۂ | نہ ہر چہ دزد زما بُرد در خزانۂ تست؟

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہمسے لوٹ کرلے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟

تصوف

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسمان پیماست | نہ تیزگامیِ توسن ز تازیانۂ تست؟

اس شعر میں ضمناً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے؛ اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کرکے عالم بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا ہے۔

صوفی / تصوف

شبابِ پنجہ! اچہ ناقدردانیِ ہستی ست | بلا بجانِ جوانانِ پارسا ریزد
آخرِ منزلِ نخست خوی تو راہ میزند | اولِ منزلِ دگر بوی تو زاد میدہد

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزل قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے تو سخت سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے تو لذتِ قرب حاصل ہونے لگتی ہے جو مثل زادِ راہ کے آگے بڑھنے کی

ہمت بندھواتی ہے۔

تصوف

اے کہ بدیدہ نم زتست و بکہ بسینہ غم زتست | تا زِ شِ غم کہ ہم ز تست خاطر شاد میدہد

تصوف

مستِ عطای خود کند ساقیِ ما نہ مستِ مے | دادہ ز یاد مے برد بسکہ زیاد میدہد

یعنی ہمارا ساقی شراب سے مست نہیں کرتا بلکہ اپنی عطا و بخشش سے مست کرتا ہے چونکہ وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ دیتا ہے اس لئے پہلا دیا ہوا بھول جاتے ہیں اسکے احسان کے نشے پر شراب کا نشہ غالب نہیں آنے پاتا۔

اخلاق

دل اسبابِ طرب گم کردہ در بندِ غمِ نان شد | زراعتگاہِ دہقان میشود چون باغ ویران شد

یہ مضمون مرزا کے حسبِ حال ہے اور عموماً مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے اوّل عیش و عشرت اور پھر نون تیل لکڑی کی فکر زراعت اور باغ کی مثال کس قدر مثل لہ کے مطابق واقع ہوئی ہے۔

زہ اگرم است این ہنگامہ۔ بنگر شورِ ہستی را | قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انسان شد

یعنی جو کچھ دنیا میں فتنے اور فساد اور جنگ و جدال اور شور و غوغا ہے وہ انسان ہی کے دم سے ہے اگر حضرت انسان نہوتے تو تمام عالم میں سناٹا ہوتا۔

قضا از ذوقِ معنی شیرۂ میریخت در جا نہا | نے از لاے پالایش چکید و آبِ حیوان شد

لائے بالا صافی کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

جلوہ اے داغ کہ ذوقِ قم زنمک مے خیزد | مژدہ اے درد کہ ننگم ز دوا مے آید

یعنی اے داغ اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آگیا کیونکہ نمک جو تیرے طول پکڑنے اور ترقی

پانے کا باعث ہے مجھے اُسمیں مزا آنے لگا ہے اور اے درد تیری بن آئی ہے کیونکہ مجھے دوا سے ننگ آنے لگا ہے۔

ہمچو رازے کہ بہ مستی ز دل آید بیروں   در بہاراں ہمہ بوئیت ز صبا مے آید

اِس شعر میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اِس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ اِنَّ لِرَبِّکُمْ فِیْ اَیَّامِ دَہْرِکُمْ نَفَحَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَہَا۔

خوش است آنکہ با خویش جز غم ندارد   ولے خوشتر ست آنکہ ایں ہم ندارد

سرابے کہ رخشد بویرانہ۔ خوشتر   ز چشمیکہ پیرایۂ نم دارد

یعنی وہ سراب جو صحرا میں چمکے اُس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

سخن نیست در لطفِ ایں قطعہ غالب   بہشتے بود ہند کا دم ندارد

قطعہ سے مراد قطعۂ زمین ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند   شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند   دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

سوخت آتشکدہ۔ ز آتش نفسم بخشیدند   ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند   بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند   بہ سخن ناصیۂ فرِ کیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند   ہر چہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

ہر چہ در جزیہ ز گبراں مئِ ناب آوردند   بشبِ جمعۂ ماہِ رمضانم دادند

ہر چہ از دستگہِ پارس بہ یغما بردند   تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

اخیر کے چھہ شعروں میں اِس بات کا بیان ہے کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے وقت عجم سے چھینا اُسکے عوض میں مجھکو۔ کہ میں بھی عجمی الاصل ہوں۔ کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتشکدہ جل کر راکھ ہوگیا تو مجھے آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی۔ اور جب بتخانہ گرگیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی۔ شاہانِ عجم کے جھنڈوں کے موتی اُتار لئے اور اُسکے عوض میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اِسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھکو شاعری میں اقبالِ کیانی مرحمت فرمایا۔ پھر کہتا ہے کہ موتی تاج میں سے توڑ لئے اور علم و دانش میں جڑ دئے یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا تھا وہ مجھے چپکے سے دیدیا۔ اور آتش پرستوں سے جو شراب جزیے میں لی وہ ماہ رمضان کی شب جمعہ کو مجھے پلائی۔ خلاصہ یہ کہ پارس کی جو کچھ پونجی لوٹی تھی اُسمیں سے زبان مجھکو فریاد کرنے کے لئے دیدی۔

خوباں نہ آں کنند کہ کس از زیاں رسد   دل بُرد۔ تا دگر چہ ازاں دلستاں رسد

یعنی دل لیا ہے تو ضرور اُسکے عوض میں کچھ اُس سے وصول ہوگا؛ کیونکہ اچھے لوگ ایسا کام نہیں کرتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔

مقصودِ ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست   ہر جا کنیم سجدہ۔ بداں آستاں رسد

گم شد نشانِ من چو رسیدم بہ کنجِ دیر   مانندِ آں صدا کہ بگوشِ گراں رسد

شعرائے متصوفین دیر و خرابات و میکدے سے اکثر خانقاہ یا وہ مقام جہاں فقر و فنا کی تعلیم ہوتی ہے مراد لیتے ہیں۔ اپنا نشان دیر میں پہنچکر گم ہوجانے سے مراد فنا ہے۔ اِسکی تشبیہ اُس صدا سے جو

بہرے آدمی کے کان تک پہنچکر گم ہو جاتی ہے کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

در دام بہرِ دانہ نیفتم مگر قفس   چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

اپنے اعزازِ نفس کا اظہار ہے۔ یعنی اگر عزت کے ساتھ قید کرو تو مجھے قید ہونے سے کچھ انکار نہیں ہے۔ پس یہ امید نہ رکھو کہ میں دانے کے لالچ سے جال میں آپھسونگا؛ نہیں۔ بلکہ قفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھونسلے تک پہونچ جائے؛ میں قفس میں فوراً چلا آؤنگا۔

تیرِ نخست را غلط انداز گفتہ ام   اے وائے گر نہ تیرِ دگر بر نشاں رسد

غلط انداز اُس تیر کو کہتے ہیں جو خطا کر کے غیر مقصود جگہ جا لگے چونکہ عشاق معشوق کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں اس لئے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اُسکا آکر لگا ہے مگر میں اُسکو اپنی نحوستِ طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی اُسی جگہ آکر لگا تو میں سمجھونگا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا ورنہ میرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا صحیح ہو جائیگا اور امید بالکل باقی نرہے گی۔

امیدِ غلبہ نیست بہ کیشِ مغاں درآے   مے گر بہ جزیہ دست ندادا ز مغاں رسد

یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی اُمید نہیں ہے تو اُنکا مذہب اختیار کرلے؛ کیونکہ اس صورت میں اگر شراب جزیہ میں نہ آویگی تو ہدیہ اور سوغات میں ضرور آویگی۔ اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ و استیلا حاصل کرنے کی علت غائی یہی ہے کہ جزیے میں شراب آیا کرے۔ پس جب غلبہ کی اُمید نہو تو لاچار کیشِ مغاں اختیار کرنا چاہئے؛ تاکہ اگر جزیے میں نہیں تو ہدیہ وارمغان ہی میں شراب وصول ہوا کرے۔

جاں بر سرِ مکتوبِ تو از شوق فشاندن   از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد

آں کشتی بشکستہ ز موجم کہ تباہی   افگند در آتش گر از آبم بدر آورد

جب کشتی موج کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جاتی ہے تو اُسکے تختوں کو پانی سے نکال کر آگ میں ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں۔ اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اُسی کشتی کی سی ہے کہ ڈوبنے سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا۔

گر جلوۂ رخ تو بہ ساغر ندیدہ ایم   چندیں بذوقِ بادہ دل از جا چہ میرود

ہفت آسیا بگردش و ما درمیانِ او   غالب دگر مپرس کہ برما چہ میرود

محو آسودگی گمرہی کاندریں وادی   چو خار از پا برآمد۔ پا ز داماں برنمی آید

یعنی کسی حالت میں آدمی دنیا کے مخمصوں سے نجات نہیں پا سکتا اگر کانٹا پاؤں سے نکل گیا تو پاؤں دامن میں اُلجھے گا۔

برآر از بزمِ بحث اے جذبۂ توفیق غالب را   کہ ترکِ سادۂ ما با فقیہاں برنمے آید

ترکِ سادۂ ما یعنی غالب جو کہ ایک بھولا بھالا ترک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور فرہادِ من یعنی خود میں۔ با فقیہاں برنمی آید یعنی مولویوں کی دلیلوں اور حجتوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔ باکسے برنیامدن کے معنی ہیں اُس سے سر نہ ہونا اور عہدہ برآ نہونا۔

چشم و دل باختہ ام داد ہنر خواہد داد   آنکہ چوں من ہمہ دان ہمہ بینِ تو شود

یعنی چونکہ میرے دل نے تجھکو جانا ہے جیسا کہ تو ہے اور میری آنکھ نے تجھکو دیکھا ہے جیسا کہ تو ہے اس لئے دل اور آنکھ دونوں کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اس کام کی داد وہی دیگا جو میری طرح تیرا ہمہ داں اور ہمہ بیں ہوگا۔

تصوف

کفر و دیں چیست جز آلایشِ پندار وجود | پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دینِ تو شود

عاشقانہ

رفتہ بودی و گراز جا بہ سخن سازیِ غیر | منت از بخت کہ خاموشیِ ما یاد آمد

یعنی تونے رقیب کی سخن سازی سے پھر دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اسکی سخن سازی دیکھکر ہماری خاموشی تجھکو یاد آگئی۔ جس سے تجھکو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشق مُنہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔

عاشقانہ

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روی تو بود | چشم سوئے فلک و روی سخن سوی تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا شکوہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھسے کر رہا تھا ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے۔

عاشقانہ

دوست دارم گرہے راکہ بکارم زدہ اند | کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروی تو بود

تصوف

گر چنیں نازِ تو آمادۂ یغما ماند | بہ سکندر نرسد ہر چہ ز دارا ماند

معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ سکندر سے مراد بادشاہ فاتح، اور دارا سے بادشاہِ مفتوح۔

تصوف

ہم بسودای تو خورشید پرستم آرے | دل ز مجنوں بَرد آہو کہ بہ لیلا ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں تو وہ بھی درحقیقت تیری ہی پرستش ہے، جیسے مجنوں ہرنوں پر اس لئے فریفتہ تھا کہ انکی آنکھیں لیلے سے مشابہ تھیں۔

عاشقانہ

شکوۂ دوست ز دشمن نتوانم پوشید | گر غمِ ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بے صبر کرنے والا رہا تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا جا سکیگا یہاں تک کہ اسکو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکونگا۔

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز | مگذارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

تصوف

بستند رہِ جرعۂ آبے بسکندر | دریوزہ گر میکدہ صہبا بکدو بُرد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور میکدے کا فقیر شراب جیسی نایاب چیز کا تونبا بھر کرلے گیا مطلب یہ کہ بادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو میکدے یعنی خانقاہ کے ادنے گداؤں کو نصیب ہے۔

تصوف

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضا دہ | تا تلخیِ آں زہر توانم بہ گلو برد

یعنی جب دو سو دفعہ رونے کو ضبط کروں تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے تاکہ اس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ روکر حلق سے دور کروں۔

عاشقانہ

ز جوشِ شکوۂ بیدادِ دوست می ترسم | مبادا مُہرِ سکوت از دہن فرو ریزد

ایک معقول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے مطلب تو یہ ہے کہ اُسکے شکوے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اُسکو ضبط نہ کرسکوں مگر اُسکو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُسکی بیداد کا شکوہ دل سے اس جوش کے ساتھ اُبلا ہے کہ مُنہ پر جو مُہرِ سکوت لگی ہوئی ہے کہیں اُسکے ریلے میں بہ نہ جائے۔

بُریدہ ام رہِ دورے کہ گر بیفشانم | بجاے گرد رواں از بدن فرو ریزد

یعنی میں نے ایسی راہ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جائے۔ یہ تمثیل ہے اُس محنت و مشقت کی جو فکرِ شعر اور تکمیلِ فنِ سخن میں اُٹھانے کی ہے۔

عاشقانہ

مکن ز پیرہنم از شکوہ منع کایں خونیست | کہ خود ز زخمِ دمِ دوختن فرو ریزد

عجیب و غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے۔ قاعدہ ہے

کہ جب معشوق مہربان ہوکر عاشق کی پرسشِ حال کرتاہے تو اُسوقت عاشقِ مہجور کا دل بھرآتاہے، اور وہ شکایت کرنی شروع کرتاہے. پس کہتاہے کہ تو میری پرسشِ حال کے وقت شکایت سے مجھکو منع نہ کر، کیونکہ تو جو پرسش حال کرتاہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتاہے، اور ٹانکے لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے. پس یہ شکایت وہ خون ہے جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتاہے.

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گذرد — زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

یعنی عمر کا سفر میں گذرنا نہایت عمدہ ہے بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گذرے اُسپر انسان فریفتہ نہ ہوجایا کرے.

بوصل لطف باندازۂ تحمّل کن — کہ مرگِ تشنہ بود آب چوں زسر گذرد

کہتاہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اُسکی خوشی کا تحمّل نہ کرسکوں اور خوشی کے مارے مرجاؤں، کیونکہ پیاسے کے لئے وہ پانی موت ہے جو سر سے گذر جاے.

ہرکجا دشنۂ شوقِ تو جراحت بارد — جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد

طوبیِ فیضِ تو ہرجا گل و بار افشاند — جز نسیمے بہ پرستش گہِ مریم نرسد

جگر گوشۂ ادہم یعنی ابراہیم بن ادہم- کو اُن زخموں میں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی. اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبیٰ سے جھڑتے ہیں اُنمیں سے صرف ایک ہوا کا جھونکا محرابِ مریم تک پہنچا ہے.

مے بہ ترسا دہ مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب — پیشِ ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

خواجہ فردوس بہ میراث تمنّا دارد — واے گر در روشِ نسل بہ آدم نرسد

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے موقع پر اُردو میں تیسرے شخص کے لئے آپ یا حضرت بولتے ہیں. کہتاہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلبگار ہیں. بڑا مزا ہو اگر آپ کا سلسلۂ نسب آدم تک نہ پہنچے. یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مرزا کو یہ احتمال ڈارون کی تھیوری کے موافق سُوجھا ہوگا، شاید انکا یہ مطلب ہے کہ آپکے اخلاق وعادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہوں.

جاں در غمت فشاندن مرگ از قفا ندارد — تن در بلا فگندن بیمِ بلا ندارد

چوں لعلِ تست غنچہ اما سخن نداند — چوں چشمِ تست نرگس اما حیا ندارد

فارغ کسیکہ دل را با درد واگزارد — کشتِ جہاں سراسر دارد گیا ندارد

بادیر سے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند — آرے دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند

کو فنا تا ہمہ آلایشِ پندار برد — از صُوَر جلوہ و از آئینہ زنگار برد

عشوۂ مرحمتِ چرخ مخر کایں عیار — یوسف از چاہ برآرد کہ ببازار برد

عشوہ خریدن دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں نہ آنا کہ یہ عیار یوسفؑ کو چاہ سے اس لئے نکالتاہے کہ بازار میں لیجا کر بکوائے.

ہر شمیمے را نشانے در خور است — بوے پیراہن بہ کنعاں می رود

جوہرِ طبعم درخشانست لیک — روزرم اندر ابر پنہاں می رود

نومیدیِ ما گردشِ ایّام ندارد — روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

بلبل بچمن بنگر و پروانہ بہ محفل — شوق ست کہ در وصل ہم آرام ندارد

یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں، اسی لئے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے۔ اور نہ پروانے کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

چہ خیزد از سخنے کز درونِ جاں نبود — بُریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی وہ کچھ اثر نہیں کرتی۔ پس کٹیو وہ زبان جو خونچکاں یعنی دردِ دل سے بھری ہوئی نہو۔

حکیم ساقی و مے تند۔ و من زبد خوئی — زرطلِ بادہ بخشم آیم ار گراں نبود

حکیم سے مراد خدا ہے کہتا ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولتِ دنیا نہایت تند ہے مگر میں اپنی بدخوئی اور زیادہ طلبی سے اگر شراب کا پیالہ ہلکا پاتا ہوں تو غصے ہوتا ہوں۔

زخویش رفتہ ام و فرصتے طمع دارم — کہ باز گردم و جز دوست ارمغاں نبود

قاعدہ ہے کہ جب آدمی کہیں سفر کو جاتا ہے تو وہاں سے کچھ سوغات و ہدیہ و ارمغاں لیکر وطن میں واپس آتا ہے کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو جا چکا ہوں اب یہ چاہتا ہوں کہ واپس پھر کر اپنے آپے میں آؤں تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لیکر نہ آؤں۔

زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوق است — بسوے قیس گرایش ز ساربان نبود

یعنی لیلی کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اسوقت اُسکی باگ تصرفِ شوق قیس کے ہاتھ میں ہے وہ جدھر چاہتا ہے لیجاتا ہے۔

بتانِ شہر ستم پیشہ شہریار انند — کہ در ستم روشِ آموزِ روزگار انند

پرند دل بادائے کہ کس گماں نبرد — فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دار انند

نہ زرع و کشت شناسند نے حدیقہ و باغ — ز بہرِ بادہ ہوا خواہِ باد و باراں اند

یعنی ہوا اور مینھ کچھ اس لئے نہیں چاہتے کہ اُس سے کھیتیاں اور باغ سرسبز و شاداب ہونگے بلکہ صرف اسلئے کہ شراب پینے کا لطف بغیر باد و باراں کے نہیں آئیگا۔

یہ مضمون مرزا کو کہیں سے تلاش کرنا نہیں پڑا، بلکہ یہ خاص اُنکی طبیعت کا اقتضا تھا جس مکان میں مرزا رہتے تھے اُسکے دروازے پر ایک کمرہ تھا، اور کمرے کے آگے ایک برآمدہ تھا جسکے نیچے رستہ چلتا تھا۔ یہ برآمدہ گذرگاہ سے تقریباً چار گز اونچا ہوگا۔ ایک روز مینھ برس رہا تھا اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے ابر و باراں کی مدارات میں مصروف تھے۔ اُس وقت عالم سرخوشی میں فرمانے لگے کہ جی چاہتا ہے ایسا برسے کہ گلی کی رو کا پانی برآمدے تک آجائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا گلاس بھر بھر کر پانی پیوں۔ کسی نے کہا حضرت! برآمدے تک پانی آگیا تو شہر پہلے ڈوب جائیگا۔ مرزا ہنسکر چپکے ہو رہے۔

چہ لطفِ رہروی آنرا کہ خار خاری نیست — مرو بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد

خار خار خلجان۔ کہتا ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہو سفر میں کچھ لطف نہیں۔ پس اگر کعبہ کی راہ پُر امن ہے تو کعبے جانا نہیں چاہئے۔ فی الحقیقۃ جو لوگ نہایت کٹھن منزلیں طے کرکے مقامِ مقصود تک پہنچتے تھے۔ جو خوشی اُنکو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہوگی اُسکا سوّاں حصہ بھی اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا جو ریل اور اسٹیمر میں آج کل سفر کرتے ہیں۔

بیا و ریہ گرایں جا بود زباندانے — غریبِ شہر سخن ہاے گفتنی دارد

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں ہوتا ہے اور اُسنے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اُسکی زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کچھ تو اس لئے کہ کسی کو اپنا قدردان اور پایہ شناس نہیں پاتا، اور کچھ اِس لئے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھتا۔ اپنے تئیں غریبِ شہر یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں۔ جو کہنے ہی کے لائق ہیں کہنی چاہتا ہے۔

بیشم ازاں بپرس کہ پرسی و اہلِ کوے ۔۔۔ گویند خستہ زحمتِ خود زیں دیار برد

نازم فریبِ صلح کہ غالب زکوے تو ۔۔۔ ناکام رفت و خاطرِ امیدوار برد

ہرکرا رخت نمازے بنود از نم مے ۔۔۔ جاے در حلقۂ رندانِ قدح نوش مباد

جامہ یا رخت کا نمازی ہونا اُسکے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

مُغتیاں! بادہ عزیزست۔ مریزید بخاک ۔۔۔ جوشد از پردہ دگر خونِ سیاوش۔ مباد

دوسرے مصرع کی تقدیر عبارت یوں ہے "مباد اخونِ سیاوش۔ دیگر از پردہ بجوشد۔ سیاوش کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بیگناہ اپنے سسرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اور اُسکے خون کے وبال میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اے مغنیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے، اسکو زمین پر مت گراؤ، ایسا نہو کہ خونِ سیاوش پھر جوش مارے۔

از رشک کرد آنچہ بمن روزگار کرد ۔۔۔ در خستگی نشاطِ مرا دید۔ خوار کرد

یہ غزل غالباً اُس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے مواخذے میں پھنس گئے تھے۔ یعنی

زمانے نے جب مجھکو دیکھا کہ خستگی اور تکلیف میں بھی خوش ہے تو مجھے ذلیل و خوار کر دیا کہ اب خوش نہ رہیگا۔

در دل ہمی ز بینش من کینہ داشت چرخ ۔۔۔ چوں دیدکاں نماند نہاں۔ آشکار کرد

یعنی میری دانش و بینش کے سبب مجھسے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا، اب جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا ہے تو آسمان کھُل کھیلا اور علانیہ دشمنی کرنے لگا۔

لنگر گسست و سر بکشتی شکست موج ۔۔۔ دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

یعنی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں بلکہ قضا و قدر کے حکم سے۔

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر ۔۔۔ نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

ماحصل شعر کا یہ ہے کہ درحقیقت میں ہوں تو ناامید مگر چونکہ تجھسے ناامید ہونا کفر ہے اور تو کفر سے راضی نہیں اس لئے مجبور اپنے تئیں امیدوار بنایا ہے۔

بشرع آویز و حق میجو۔ ز مجنوں کم نہٗ بارے ۔۔۔ دلش با محمل است۔ امّا زباں با ساربان دارد

یعنی شرع سے بھی تعلق رکھ اور خدا کو بھی ڈھونڈھ، آخر تو مجنوں سے تو کم نہیں ہے کہ اُسکا دل تو محمل میں اٹکا ہوا ہے، مگر زبان کو ساربان سے سروکار ہے۔ یعنی ساربان سے باتیں کر رہا ہے اور دل لیلی سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساربان سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور یہ نہایت بلیغ تمثیل ہے اور شعر نوادر افکار سے ہے۔

خدارا وقت پرسش نیست گفتم۔ بگذر از غالب ۔۔۔ کہ ہم جاں بر لب و ہم داستاں بر زباں دارد

گفتم یعنی میں نے کہدیا ہے، یا میں کہے دیتا ہوں۔ کہ یہ پرسش کا وقت نہیں ہے، تو غالب کے حال سے درگذر اور پرسش کا خیال چھوڑ دے۔ کیونکہ اُسکی جان لبوں پر ہے اور داستان زبان پر۔

مبادا وہ اپنی دردانگیز داستان. بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اُسکی جان بھی نکل جائے۔

گویند صنعاں توبہ کرد از کفر۔ نادان بندۂ کز خود فروشیہای دین بخشش نہ یزداں خوش نکرد

صنعاں کا قصہ مشہور ہے جو پہلے عابد تھا پھر فسق وفجور میں مبتلا ہوگیا یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچ گئی پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صنعاں کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے۔ وہ عجب نادان بندہ ہے جسنے دین کی خود فروشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نکرتا، اور کفر ہی پر مرتا، اور پھر خدا اُسکو بخش دیتا، اور اب جو وہ بخشا جائیگا تو یہ بخشش دین کی قیمت ہوگی پس گویا اُسنے دین کی خود فروشی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا۔ خوش کردن کے معنی ہیں پسند کرنا۔

آں خود بہ بازی سے بُرد۔ دیں را دو جُومی شمرد بنمودش دیں خندہ زد۔ آور دش جاں۔ خوش نکرد

با من میاویز اے پدر فرزندِ آذر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

میاویز یعنی مجھسے جھگڑا مت کر۔ فرزند آذر ابراہیم علیہ السلام۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔ یہ نرا مضمون ہی نہیں ہے بلکہ مرزا کے حسبِ حال بھی ہے؛ کیونکہ۔ جہاں تک ہمکو معلوم ہے۔ مرزا کے والد سنّی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔

در ستم حق ناشناسش گفتن از انصاف نیست آں کہ چندیں تکیہ بر حلمِ خداوندش بود

کہتاہے کہ اُس ظالم کو حق ناشناس کہنا انصاف نہیں ہے جسکو خدا کے حلم پر اسقدر بھروسا ہے کہ اُسکے بھروسے پر ظلم کئے چلا جاتاہے؛ اور اُسکے مواخذے سے نہیں ڈرتا۔

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوے گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

بہرِ خواری بسکہ سرگرمِ تلاشم کردہ اند پارۂ نزدیک در ہر دور باشم کردہ اند

دور باش۔ ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں۔ جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں۔ کہتاہے کہ مجھکو جو قضا وقدر نے سرگرم تلاش کیا ہے اُس سے مقصود میرا خوار وذلیل کرناہے۔ پس راہِ تلاش میں جو دھکا مجھپر پڑتی ہے اُس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت وخواری زیادہ ہوتی ہے؛ اور اِس طرح جو امر میرے سرگرم تلاش کرنے سے مقصود ہے وہ حاصل ہوتاہے۔ پس گویا ہر دور باش پر میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتاہوں۔

چرخ ہر روزم غمِ فردا بخوردن میدہد تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند

ارچہ غالب خواجگیہای جہاں ننگِ منست گر نہ با سلمان وبوذر خواجہ تاشم کردہ اند

بخشم ناسزا میگوید واز لطفِ گفتارش گماں دارم کہ حرفِ دلنشینی بعد ازیں گوید

لطفِ گفتار کی تعریف اِس سے بہتر کسی پیرائے میں نہیں ہوسکتی۔ کہتاہے کہ معشوق غصّے میں برابر مجھکو بُرا بھلا کہتاہے؛ مگر اُسکے لطفِ کلام سے میں ہمیشہ اِسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات کہتاہے، اب کوئی مہربانی کا کلمہ اُسکی زبان سے نکلتاہے۔

دل از پہلو بروں آرم جمش جامِ خود انگارد وگر لختے بر افشانم سلیمانش نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتاہے کہ اگر اُسکو پہلو سے نکالکر دکھاؤں تو جمشید اُسکو اپنا جامِ جہاں بیں سمجھے؛ اور اگر اُسکا ایک لختہ نکالکر ڈال دوں تو سلیمان اُسکو خاتمِ سلیمانی کا نگیں بتائے۔

من بہ وفا مردم ورقیب بدر زد نیمہ لبش انگبین ونیمہ تبرزد

بدر زد یعنی نکل بھاگا۔ تبرزد۔ مصری۔ کہتاہے کہ میں تو نباہ کرتا کرتا مرگیا اور رقیب نکل بھاگا۔ گویا

معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ میں اسمیں پھنس کر رہ گیا؛ اور آدھا مصری تھا کہ رقیب اسپر اڑ گیا۔

دعوے اور ابود دلیل بدیہی   خندۂ دنداں نما بحسن گہر زد

کتنے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اسکے دانت نظر آنے لگے پس اسکا خندہ گویا اس بات کا دعوے ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں؛ اور اس دعوے کی دلیل اسکا خندۂ دنداں نما ہے؛ کیونکہ اسکے دانتوں کا سب پر ظاہر ہو جانا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی اسکے دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے پس اسکے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے۔

نہم جبیں بدرش آستاں بگرداند   نشنیمش بسرِ رہ عناں بگرداند

آستاں بگرداند یعنی چوکھٹ کے پتھر کو الٹ کر اوپر کا رخ نیچے اور نیچے کا رخ اوپر کر دیتا ہے۔

تو نالی از خلۂ خار و نسگری کہ سپہر   سرِ حسینؑ علیؑ بر سناں بگرداند

قطعہ

برو۔ بشادی و اندوہ دل منہ۔ کہ قضا   چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند

یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند   کلیم را بلباسِ شباں بگرداند

تیغت ز فرق تا بہ گلویم رسیدہ باد   شوخی ز حد گذشت زبانم بریدہ باد

اول یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور حلق تک اتر جائے۔ پھر یہ سمجھکر کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گذر گئی میری زبان قلم ہو جیو۔

گر رفتہ ام زکوے تو آساں نرفتہ ام   ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد

ذوقیست ہمدمی بفغاں۔ بگذرم ز رشک   خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد

یعنی اگرچہ تیرے عشق میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں؛ مگر چونکہ کئی آدمیوں کے ملکر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے اس لئے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ "خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد"

در تیغ زدن منت بسیار نہادند   بُردند سرازدوش و سبکدوش نکردند

یعنی تلوار سے سر اتار کر بھی معشوق نے سبکدوش نہ کیا پہلے سر کا بوجھ تھا اب اس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سر اتارا ہے۔

روزیکہ بہ مے زور و بہ نے شور نہفتند   اندیشہ بکارِ خرد و ہوش نکردند

یعنی شراب کا نشہ اور نے کی آواز کا درد۔ دونو عقل و ہوش کے دشمن ہیں۔ پس جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور اور نے میں شور ودیعت کیا تھا اس وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

تاجرِ شوق بداں رہ بتجارت نرود   کہ رہ انجامد و سرمایہ بغارت نرود

یعنی شوقِ الٰہی کا تاجر اس رستے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہو جائے اور اس رستے میں سرمایہ لوٹا نہ جائے۔

رمز نشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد   محرم آنست کہ رہ جز باشارت نرود

کہتا ہے کہ ہر نکتہ یعنی کائنات کی ادنےٰ سے ادنےٰ چیز میں ایک ادا۔ یعنی ایک معنی یا راز چھپا ہوا ہے۔ پس ہر چیز کی رمز کو سمجھنا چاہئے؛ کیونکہ محرمِ راز وہی شخص ہے جو بغیر ادھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اٹھاتا۔ یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اسکے موافق عمل کرتا ہے۔ کھانے میں، پینے میں

سونے میں، جاگنے میں؛ غرضکہ ہر کام اور ہر چیز میں تیجر کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔

شوخی

زاہد از حورِ بہشتی بجز ایں نشناسد — کہ شود دستِ زدِ شوق بکارت زدود

دست زدِ شوق ہونا یعنی شوق کے زیر مشق ہونا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ زاہد شریعت کے تمام الفاظ سے انکے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارہ و کنایہ پر محمول نہیں کرتا۔

عاشقانہ

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر — چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

کہتا ہے کہ آ۔ اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اسکو دیکھ۔ اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوشِ تمنائے دیدار کی تصویر اِس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ "میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہوں"

عاشقانہ تصوف

ز من بجرمِ طپیدن کنارہ مے کردی — بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

دمیدہ دانہ و بالیدہ آشیاں گہ شد — در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

کہتا ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا جال بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسانے کیلئے ڈالا تھا وہ اگا اور بڑھا، اور یہاں تک بڑھا کہ اسمیں گھونسلے بنگئے بگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔

غزل مسلسل عاشقانہ رندانہ

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور — غوغائے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور

گر خود بجہد از سر از دیدہ فرو بارم — دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدمِ فرزانہ دانی رہِ ویرانہ — شمعے کہ نخواہد شد از بادِ خموش آور

ویرانہ یعنی غریب خانہ۔ جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے گی یعنی شراب۔

شورابۂ ایں وادی تلخ است اگر آری — از شہر بسوئے من سر چشمۂ نوش آور

کہتا ہے کہ میں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے اے ہمدم فرزانہ اگر تو فیاض ہے تو شہر سے میرے لئے سرچشمۂ نوش یعنی شراب لا۔

دانم کہ گذرے داری - ہر جا گذرے داری — مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور

گر مغ بہ کدو ریزد بر کف نہ و راہی شو — ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور

کہتا ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے؛ اگر بادشاہ عطا کرے تو فبہا۔ ورنہ بادہ فروش سے لا۔ اگر مغ (آتش پرست) یعنی بادہ فروش تونبے میں ڈالدے تو تونبا ہاتھ پر رکھ اور چلدے۔ اور جو بادشاہ گھڑا بھر کر عنایت کرے تو کندھے پر اٹھا اور لے آ۔

ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل — آں در رہِ چشم افگن ایں در رہِ گوش آور

رامش۔ راگ۔ آں سے مراد ریحاں اور ایں سے مراد قلقل۔

گاہے بسبکدستی از بادہ ز خویشم بر — گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور

گاہے بسبکدستی یعنی کبھی جلدی سے مجھکو شراب پلاکر مدہوش کردے اور پھر جب میں بدمست ہوجاؤں تو مجھکو گانا سنا کر ہوشیار کر۔

غالب کہ بقایش باد - ہمپائے تو گر ناید — بارے غزلے، فردے، زاں موینہ پوش آور

ہمپائے تو یعنی ہمراہِ تو۔ موینہ پوش اونی کپڑے پہننے والا۔ مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے تھے، اکثر اونی یا پشمینے کا چغہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے۔

عاشقانہ تصوف

یقینِ عشق کن و از سرِ گماں برخیز — بآشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز

چرا بہ سنگ و گیاہ پیچی اے زبانۂ طور — ز راہِ دیدہ بدل در رو و ز جاں برخیز

زبانہ۔ شعلہ وہ تجلی جو سنگ وگیاہ یعنی کوہ طور اور نخل ایمن پر ظاہر ہوئی تھی اُسکی طرف خطاب کرتا ہے کہ اے شعلۂ طور! پتھر اور درخت سے۔ جو کہ تیرے قابل نہیں ہیں کیوں لپٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں اُتر اور جان سے بھڑک اُٹھ۔

عیادت است نہ پرخاش تندخوئی چیست؟
بیا و، غمزدہ بنشین، ولب گزاں برخیز

معشوق عیادت کو آیا ہے اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھکر بے لطف ہوا ہے اُس سے کہتا ہے کہ تو عیادت کے لیئے آیا ہے، لڑائی کے لئے نہیں آیا! پھر یہ تندخوئی اور بدمزاجی کیسی ہے؟ یہاں آکر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہوسکتا ہے؟ پس آ۔ اور مغموم بیٹھ۔ اور ہونٹ کاٹتا ہوا اُٹھ۔

نفس چوں زبوں گردد دیو را بفرماں گیر
محرم سلیمانم نقشِ خاتم از من پرس

کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہوگیا پھر جن کو محکوم کرلینا آسان ہے۔ میں سلیمان کا محرم راز ہوں اُنکی انگوٹھی پر یہی نگیں کندہ تھا جس سے تمام جن اُسکے محکوم تھے۔

بوسہ از لبانم دہ، عمرِ خضر از من خواہ
جامِ مے بہ پیشم نہ، عشرتِ جم از من پرس

وردِ من بود غالب، یا علی بوطالب
نیست بخل با طالب، اسمِ اعظم از من پرس

کہتا ہے کہ میرا وظیفہ یا علی ابن ابی طالب ہے! مجھکو طالبِ صادق سے کچھ بخل نہیں ہے، اسمِ اعظم مجھسے پوچھے کہ یہی "یا علی" اسمِ اعظم ہے۔

لطفِ بخت ہرنگہ خشمگیں شناس
آرایشِ جبینِ تنگرفان زچیں شناس

بے غم نہادِ مردِ گرامی سنے شود
زنہار قدر خاطرِ اندوہگیں شناس

زنہار کے معنی یہاں ضرور بالضرور کے ہیں۔ یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ہرگز کے معنی ہوتے ہیں

اور جب امر پر آتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے۔

دودِ سودائے تتق بست، آسماں نامیدمش
دیدہ برخواب پریشاں زد، جہاں نامیدمش

دنیا ومافیہا کا ہیچ ہونا بیان کرتا ہے؛ اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دُھواں اُٹھکر شامیانہ سا بنگیا ہمنے اُسکا نام آسمان رکھ لیا۔ اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا اُسکو جہاں سمجھ گئے۔ اِسی طرح اِسکے بعد کے کئی شعروں میں اِسی مضمون کی تفصیل ہے۔ مثلاً

وہم۔ خاکے ریخت در چشم۔ بیاباں دیدمش
قطرہ بگداخت۔ بحرِ بیکراں نامیدمش

باد دامن زد بر آتش۔ نوبہاراں خواندمش
داغ گشت آں شعلہ۔ از مستی خزاں نامیدمش

چونکہ نوبہار میں تمام جذباتِ نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق وہوس کی تحریک ہوتی ہے؛ اِس لیئے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوانے آگ کو دامن سے سُلگایا میں نے اُسکو بہار قرار دیدیا۔ اور جب وہ شعلہ جل بُجھا تو میں نے اُسکا خزاں نام رکھدیا۔

غربتم ناسازگار آمد۔ وطن فہمیدمش
کرد تنگی حلقۂ دام۔ آشیاں نامیدمش

کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہنچنے لگیں تو میں اُسکو وطن سمجھا؛ گویا جب دام کے حلقہ نے تنگی کی تو میں اُسکو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن میں اِس قدر بے مہری اور مغائرت لوگوں سے دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھکو راس نہ آیا تو میں نے اُسکو بھی وطن ہی تصور کرلیا۔

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل مے گفتمش
رفت از شوخی بآئینے کہ جاں نامیدمش

یہاں بود کی ضمیر معشوق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکیں کے ساتھ بیٹھا تھا جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے۔ اور وہ شوخی سے اُٹھکر اِس طرح چلا گیا کہ میں اُسکو

جان کہ اٹھا یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے وہی اُسکے جانے سے ہوئی۔

دل زباں را رازدانِ آشنائیہا نخواست　　گاہ بہماں گفتمش گاہے فلان نامیدمش

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم　　کعبہ دیدم نقشِ پائے رہروان نامیدمش

دل در غمش بسوز اکہ جاں میدہد عوض　　ورجاں دہی سخنے بہ ازاں میدہد عوض

بنود سخن سرائیِ مارائگاں کہ دوست　　دل می برد زما و زباں میدہد عوض

کہتا ہے کہ یہ سخن سرائی ہمکو مفت نہیں ملی ہے، بلکہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اُسکے عوض زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقۃ جب تک انسان کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہوسکتی، خواہ عشقِ مجازی ہو اور خواہ عشقِ حقیقی۔

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ　　ترا کہ ہست ونیا شامی از بہار چہ حظ

خوش است کوثر و پاکست بادۂ کہ در وست　　ازاں رحیقِ مقدس دریں خمار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسرین و دلربائی نیست　　بدشتِ فتنہ ازیں گردِ بےسوار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسرین سے مراد دنیا ہے، اور دلربا سے مراد وہ ذات بے نشان ہے جو دید و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اِس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں - جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں - اِس گردِ بےسوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو

✦ بہماں اور فلاں دونو مرادف یکدگر ہیں۔ جب کسی کا نام صراحۃً نہیں لینا ہوتا تو وہاں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اُردو میں ایسے موقع پر وہ یا وہ شخص، یا اُنکا ڈھمکا بولتے ہیں ۱۲

خطرہ ہوتا ہے اور اُسکی کمک کے لئے کوئی سوار آتا ہے تو اول گرد نظر آتی ہے، پھر سوار نمودار ہوتا ہے مگر اِس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں۔

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا　　ز میوہ تا نہ فتد خود ز شاخسار چہ حظ

یعنی جبکہ نخل اِس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لئے پتھر ناپید ہیں تو جب تک میوہ خود درخت سے نہ گرے - یعنی جب تک جاذبہ عنایت ہمکو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہدِ حقیقی خود اپنی جھلکی نہ دکھائے - ہمکو کیا فائدہ؟

نہ مرا دولتِ دنیا - نہ مرا اجرِ جمیل　　نہ چو نمرود توانا - نہ شکیبا چو خلیل

بُنہ و بار بہ شبگیر در افگندہ براہ　　آنکہ دانست سراسیمگیِ صبحِ رحیل

بُنہ و بار - ساز و سامان۔ شبگیر پچھلی رات - یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبراہٹ اور کھلبلی پڑتی ہے وہ رات ہی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر رستے کے سرے پر ڈال دیتا ہے۔

نکنی چارہ لبِ خشک مسلمانے را　　اے بہ ترسا بچگاں کردہ مے ناب سبیل

یہ خطاب ہے خدا کی طرف - معنی ظاہر ہیں۔

غالبِ سوختہ جاں راچہ بگفتار آری　　بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

ندانند نظیری ز قتیل یعنی نظیری اور قتیل میں فرق نہیں کرتے۔

بسکہ بیچ بہ خویش جادہ زگمراہیم　　رہ بدرازی دہر عشوۂ کوتاہیم

ایک معقول بات کو محسوسات کی تمثیل میں ظاہر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ طریق معرفت سے

نابلد ہیں، یا یوں کہو کہ اِس رستے میں گمراہ ہیں، وہ معرفتِ الٰہی کو اُس قدر دشوار نہیں سمجھتے
جس قدر کہ عرفا اور کُمّلِ اولیا سمجھتے ہیں۔ اِس مطلب کو یوں بیان کرتا ہے کہ میری گمراہی کی
شامت سے راہ اپنے اوپر اِس طرح بل کھاتی ہے جس طرح رسّی یا ڈورا زیادہ بل کھانے
سے چھوٹا ہو جاتا ہے پس وہ یعنی راہِ معرفت باوجودیکہ بہت دور و دراز ہے مجھکو کوتاہی کا عشوہ
یعنی فریب دیتی ہے۔

شعلہ چکد عنم کرا۔ گل شگفد مزد کو   شمعِ شبستانیم۔ بادِ سحرگاہیم

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اُسپر لوگوں کی بیدردی اور ناقدردانی ظاہر کرتا ہے
کہتا ہے کہ مَیں گویا شمعِ شبستانی ہوں کہ اُسمیں سے شعلے جھڑتے ہیں مگر کسی کو اُسکے ساتھ ہمدردی
نہیں۔ اور گویا میں بادِ سحرگاہی ہوں جو پھول کھلاتی ہے مگر اُسکی اُجرت کوئی نہیں ادا کرتا۔

از صفِ طفلان و سنگ رہ شدہ بر خلق تنگ   زود ز کو نگذرد کوکبۂ شاہیم

یعنی میری شاہانہ سواری کوچے سے جلد نہیں گذرتی کیونکہ لڑکوں کے ہجوم اور پتھروں کے
ستھراؤ سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔

جذبِ تو باید قوی کاں برد۔ باک نیست   گر نتواند رسید بخت بہمراہیم

کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہیئے جو مجھکو منزل تک لیجائے۔ پس نصیب اگر میرے ساتھ
نہ چل سکے تو کچھ حرج نہیں۔

غالبِ نام آورم نام و نشانم مپرس   ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم
بر لبِ یا علی سرائے۔ بادہ روانہ کردہ ایم   مشربِ حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

روانہ کردہ ایم یعنی جاری کردہ ایم۔ کہتا ہے کہ چونکہ لب پر یا علی جاری ہے اِس لحاظ سے
تو ہمنے مذہبِ حق اختیار کیا ہے، اور چونکہ اُسپر شراب جاری ہے اِس لحاظ سے مغوں یعنی
آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ہیں یعنی دنیا اور دین دونو ہمکو حاصل ہیں۔

بادہ بوام خوردہ و زر بقمار باختہ   وہ کہ زہر چہ ناسزاست ہم بسزا نکردہ ایم

یعنی شراب پینا اور روپیہ ضائع کرنا تو بُرا تھا ہی، ہمنے اِن بُرائیوں کو بھی خوبی کے ساتھ نہ کیا
شراب پی تو قرض کی، اور روپیہ کھویا تو جوئے میں۔

نالہ بلب شکستہ ایم۔ داغ بدل نہفتہ ایم   دولتیانِ مُمسکیم زر بخزانہ کردہ ایم

نالہ بلب شکستہ ایم یعنی اُسکو منھ سے نہیں نکلنے دیتے، اور ضبط کرتے ہیں، اور داغ کو دل میں
چھپائے رکھتے ہیں، ہم دولتمند تو ہیں مگر خسیس ہیں اپنی دولت کو خزانے میں رکھتے ہیں۔

رفتہ ام از خویشتن چند آنکہ دریاد خودم   گر فراموشی بفریادم رسد۔ وقتست وقت

کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو گذر گیا ہوں مگر ابھی آپے کو بھولا نہیں ہوں اگر فراموشی
اِسوقت میری فریاد کو پہنچے اور آپے کو بھلا بھی دے تو بہت مناسب ہے۔

ہمچو شمعِ بزم در راہِ فنا زادِ خودم   ہر قدم لختے ز خود رفتن بود در بارِ من

کہتا ہے کہ راہِ فنا میں جو کچھ کہ میرے بار یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے وہ صرف یہی ہے
کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپے سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہِ فنا
میں آپ ہی اپنا زادِ راہ ہے۔ کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زادِ راہ کی طرح نبڑتی جاتی ہے۔ اسی
طرح میں بھی آپ اپنا زادِ راہ ہوں۔

عاشقانہ

یاد باد آں روزگاراں کاعتباری داشتم　　　آہِ آتش ناک وچشمِ اشکبارے داشتم

جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ جبکہ بوالہوسی یا عشق ومحبت زور شور پر تھا؛ آہ آتشناک تھی اور آنکھ اشکبار.

بیخودی / عاشقانہ / تصوف

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلّف برطرف　　　ایں قدر دانم کہ غالبؔ نام یارے داشتم

ایں چہ شورست کہ از شوقِ تو در سر دارم　　　دلِ پروانہ وتمکینِ سمندر دارم

آں چہ اد طرب ۔ ایں چہ و درتعب است　　　خندہ بر غفلتِ درویش وتوانگر دارم

کہتا ہے کہ میں درویش اور توانگر دونوں کی غفلت پہ ہنستا ہوں جبکہ دنیا کا طرب اور تعب دونو ہیچ ہیں تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا رنجیدہ کس لئے ہے؟

مناجات

رازدارِ تو و بدنام کن گردشِ چرخ　　　ہم سپاس از تو و ہم شکوہ ز اختر دارم

خدا سے کہتا ہے کہ جو تجھسے تکلیف پہنچتی ہے اُسکی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں، مگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں۔ پس در حقیقت تیرا احسانمند ہوں مگر بظاہر ستارے کا شکوہ گزار.

عاشقانہ

خوشنودم از تو و زپئے رد باشِ خلق　　　آوازۂ جفائے تو در عالم افگنم

کہتا ہے کہ میں نے تجھکو جفاکار اس لئے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نہ کرے ورنہ میں در حقیقت تجھسے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں.

فخریہ / اور ہوس عشق / عاشقانہ

دوزند گر بفرض زمین را بہ آسماں　　　حاشا کہ ہیں فشار در ابروخم افگنم

ہم بعالم ز اہلِ عالم برکنار افتادہ ام　　　چوں امام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

زمن حذر نکنی گر لباسِ دیں دارم　　　نہفتہ کافرم وبت در آستیں دارم

اِس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریاکار لوگ ہیں جنکو متشرع اور مقدس سمجھکر انکے آگے کوئی بات ہنسی یا بے تہذیبی یا رند مشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے؛ مگر انکو ذرا ٹٹول کر دیکھئے تو وہ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں خطاب معشوق کی طرف ہے۔ جو نوعمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت سے بھاگتا ہے.

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ وہنوز　　　ہزار دزد بہر گوشہ درکمیں دارم

ہنوز کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اردو میں "تاہم" یا "باوجود اسکے" بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضمون چراتے ہیں۔ میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چوٹے میری گھات میں لگے ہوئے ہیں.

زوعدہ دوزخیان را فزون نیاز ارند　　　توقعے عجب از آہ آتشیں دارم

کہتا ہے کہ اہل دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعاد معین سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھینگے؛ پس اس خیال سے میں اپنی آہ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں؛ یعنی یہ کہ آہ آتشیں بھی ہمیشہ نہ رہے گی اس توقع کو عجیب اس لئے کہا ہے کہ اُسکو بھی دوزخ پر قیاس کرکے اُس سے آخرکار نجات کا امیدوار ہے.

جوابِ خواجہ نظیری نوشتہ ام غالبؔ　　　خطا نمودہ ام وچشمِ آفریں دارم

دوسرا مصرع نظیری کا ہے۔ جس کا پہلا اصل مصرع یہ ہے "دمرا یہ سادہ دلیہاے من توان بخشید"، نظیری کا یہ شعر بڑے رتبے کا ہے؛ مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تضمین کیا کیا ہے گویا اُسکو

چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہوگیا کہ نظیری کی غزل پر غزل لکھنی بھی تو خطا۔ مگر میں نے اسپر ایسی غزل لکھی ہے کہ اپنی اِس خطا پر آفریں کا امیدوار ہوں۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تاکہ آسماں کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم تم دونوں ملکر پلٹ دیں، اور حکم قضا کو رطل گراں یعنی جام شراب کی گردش سے پھیر دیں۔

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم　　بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

در فراز کنیم یعنی دروازہ بند کردیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھرتا رہے اور کسیکو آنے نہ دے۔

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم　　وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

(یعنی نندیشیم)

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم　　وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے برہگذر پاشیم　　مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم　　بکار و بار زنے کارداں بگردانیم

(خادمہ)

گہے بلابہ سخن با ادا بیامیزیم　　گہے ببوسہ زباں در دہاں بگردانیم

لابہ۔ تملق و خوشامد سخن کو ادا کے ساتھ ملانا۔ بناؤ چاؤ اور راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نہیم شرم بیکسو و باہم آویزیم　　بشوخیٔ کہ رخ اختراں بگردانیم

ز جوش سینہ سحر را نفس فرو بندیم　　بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دو تو ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کردیں، اور اُسکو طلوع نہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہاں سے ٹالدیں۔

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم　　ز نیمہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

یعنی سب کو رات کے دھوکے میں ڈالدیں۔ یہاں تک کہ چرواہے کو ریوڑ سمیت آدھے رستے سے شہر کی طرف اُلٹا پھیر دیں۔

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را　　تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم

یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں انکو ڈر باغ کے باہر ہی سے خالی چھال کے ساتھ پھیر دیں۔

بصلح بال فشانانِ صبحگاہی را　　ز شاخسار سوے آشیاں بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آکر کلیل کرتے ہیں اُن کو نرمی اور چمکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود　　گر آفتاب سوے خاوراں بگردانیم

کہتا ہے کہ ہم تم حیدری ہیں، ہمسے تعجب نہیں کہ جس طرح بقولِ بعض حیدر کرار سے معجزۂ ردالشمس ظاہر ہوا تھا۔ ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

رفت بر ما انچہ خود ما خواستیم　　وایہ از سلطاں بغوغا خواستیم

قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل کرتا ہے تو اُسکو مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے۔ کہتا ہے کہ ہمپر جو سختی گذری وہ خود ہمنے ہی چاہی تھی؛ کیونکہ بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت غل شور بہت کیا؛ اِس لئے وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان سے مراد خدا تعالےٰ ہے۔

دانش و گنجینہ پنداری یکیست   حق نہاں داد آں چہ پیدا خواستیم

پنداری اور گوئی اور گویا کے ایک معنی ہیں. کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز ہیں ؛ کیونکہ جو چیز ہمنے علانیہ مانگی۔ یعنی دولت۔ وہ خدانے ہمکو پوشیدہ طور پر دی۔ یعنی علم و ہنر

رفت و باز آمد ہما در دامِ ما   باز سرِ دادیم و عنقا خواستیم

کہتا ہے کہ ہما ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا پھر آن پھنسا ؛ اب چاہیئے تھا کہ اُسکی زیادہ نگرانی کرتے اور اُسکو نکلنے نہ دیتے ؛ مگر ہمنے اُسکو خود چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی. ہما سے مراد دولتِ دنیا ؛ اور عنقا سے مراد احدیتِ ذات.

وحشتے در سفر از برگِ سفر داشتہ ایم   توشۂ راہ۔ دلے بود کہ برداشتہ ایم

داغِ احسانِ قبولی لیمانش نیست   ناز بر خرمیِ بختِ ہنر داشتہ ایم

قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے. خرمیِ بختِ ہنر۔ یعنی سرسبزیِ بختِ ہنر۔ کہتا ہے کہ ہمکو اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے کیونکہ اُسپر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا داغ نہیں ہے. یہاں خرمیِ بخت کا لفظ استہزاءً ناسازیِ بخت پر بولا گیا ہے.

زخمِ جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم   موجِ گہرم جنبش و رفتار ندانم

یعنی جس طرح زخمِ جگر تک بخیہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آبِ گوہر کی موج میں جنبش و رفتار نہیں ہے ؛ ایسا ہی میرا حال ہے۔ یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے ؛ نہ میرے کمال کی اطلاع ہے

نقدِ خردم۔ سکۂ سلطاں نپذیرم   جنسِ ہنرم گرمیِ بازار ندانم

غالب نبود کوتہی از دوست۔ ہمانا   زاں ساں دہدم کام کہ بسیار ندانم

یعنی وہ اس طرح حاجت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھکو شعور نہیں ہوتا کہ کیونکر یہ کام بنگیا.

ذیل کی غزل نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اسمیں پڑھی گئی تھی. چونکہ دلّی کے تمام نامور شعرا کا۔ جو وہاں فارسی غزلیں لکھکر لیجاتے تھے۔ مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے اس لئے بطورِ یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کیجاتی ہے.

ای پری چہرہ غزالاں ز رمِ مردمِ شاں   دلِ مردم بخمِ طرّۂ خم در خمِ شاں

(یعنی ز بہے پری چہرہ غزالاں)

کافر انند جہاں جوے۔ کہ ہرگز نبود   طرّۂ حور دلا ویز تر از پرچمِ شاں

آشکارا کُش، و بدنام، نکو نامی جوے   آہ ازیں طائفہ۔ وانکس کہ بود محرمِ شاں

رشک بر تشنۂ تنہا روِ وادی دارم   نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزمِ شاں

بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی۔ ہش دار   خستگانند کہ دانی و نداری غمِ شاں

یعنی اُن مصیبت زدوں کو جانے دے جنکو تو نہیں جانتا ؛ مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے آفت زدہ ہیں جنکو تو جانتا ہے مگر اُن کا کچھ غم تجھکو نہیں.

داغِ خوں گرمیِ ایں چارہ گرانم۔ گوئی   آتش است آتش اگر پنبہ و گر مرہمِ شاں

ایکہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم   چہ بہ منتِ بسیار نہی از کمِ شاں

(بحبت دہمہ رو ی را)

ہند را خوش نفسانند سخنور۔ کہ بود   باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

(یعنی خوش نفساں سخنور اند)

مومن و نیّر و صہبائی و علوی۔ وانگاہ   حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار   ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدمِ شاں

مومن یعنی حکیم مومن خاں۔ جنکے دیوان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔ نیّر یعنی نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو۔ جنکا کلام دونو زبانوں میں بقدر معتد بہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ **صہبائی** یعنی مولانا امام بخش۔ جنکی نظم و نثرِ فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ **علوی** مولانا عبد اللہ خانِ علوی اُستادِ مولانا صہبائی۔ جنکی نظم و نثرِ فارسی چھپ چکی ہے ؛ اور عربی میں بھی اُنکے قصائد موجود ہیں۔ **حسرتی** ۔ نواب محمد مصطفٰے خاں رئیسِ جہانگیر آباد۔ جنکے دیوان اردو و فارسی دونو زبانوں میں چھپ چکے ہیں ؛ اور اِسکے سوا سفرنامۂ حج، تذکرۂ گلشنِ بیخار، اور رقعات فارسی بھی اُنکی تصانیف سے شائع ہو چکی ہیں۔ **آزردہ** مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں جنکا کلام اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا مگر افسوس ہے کہ اُسمیں سے بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے۔ لیکن بعض مذہبی رسالے جو اُن سے یادگار رہ گئے ہیں شائع ہو چکے ہیں۔

تا نہ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن   این مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است   شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا   چاک ہا ایشا رِ جیبِ پیرہن خواہد شدن

حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت   دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

کہتا ہے کہ میرا ایک ایک حرف مذاقِ فتنہ میں جگہ پائیگا۔ یعنی فتنہ کو پسند آئیگا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ برہمن اُسکو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کریگا ؛ اور دونو اپنی اپنی جگہ اُسپر فخر کرینگے، اور ایک دوسرے کو جھٹلائینگے ؛ اور آپس میں گل خپ ہونگے۔

ہے چہ می گویم ؟ اگر اینست وضعِ روزگار   دفترِ اشعار بابِ سوختن خواہد شدن

اِس سے پہلے بطورِ فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور وُوں ہوگا ؛ پھر کہتا ہے کہ ہے ہے میں کیا کہتا ہوں ؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفترِ شعر بابِ سوختن یعنی جلا دینے کے لائق ہو جائیگا۔

چشمِ کور آئینۂ دعوی بکف خواہد گرفت   دستِ شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن

شاہدِ مضموں کہ اینک شہریِ جان و دل ست   روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن

یعنی آیندہ یہ حال ہوگا کہ شاہدِ مضموں جو اب جان و دل کے شہر میں مقام رکھتا ہے وہ کام و دہن کے دیہات میں آوارہ ہو جائیگا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق اور گہری نگاہ سے غور کیجاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہجائینگے اور اُنکی تہ کو کوئی نہ پہنچیگا۔

زاغ زاغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں   ہم نوائے پردہ سنجانِ چمن خواہد شدن

جنگلی کوّے (یعنی تُک بندی کرنے والے شاعر) نغمہ سنجی کی ہوا میں پنکھ پسارے ہوئے چمن کے نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں) کی برابری کرینگے۔

شاد باش اے دل دریں محفل کہ ہر جا نغمہ ایست   شیونِ رنجِ فراقِ جان و تن خواہد شدن

آپ کہتا ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے ؛ یہ سب نغمے موزوں ہوں یا ناموزوں ایک دن موت کے نوحے بنجائیں گے۔

ہم فروغِ شمعِ ہستی تیرگی خواہد گزید   ہم بساطِ بزمِ ہستی پُر شکن خواہد شدن

گرد پندار وجود از رہگذر خواہد نشست   بحرِ توحیدِ عیانی موجزن خواہد شدن

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اُٹھا ہوا نظر آتا ہے یہ سب بیٹھ جائیگا یعنی سب فنا ہو جائیں گے اور توحید عیانی کا دریا موجزن ہوگا یعنی ذاتِ واحد کے سوا کچھ باقی نرہیگا۔

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو　　　کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی، وہ اُسی کے پاس جاتی ہے جو اُسکے لائق ہوتا ہے۔ پس تو اے مخاطب اپنی سعی سے پشیماں ہو۔ اور وہ دولت کیا ہے؟ کافر ہونا۔ کہتا ہے کہ تو کافر تو نہیں ہوسکتا لاچار مسلمانی پر قناعت کر۔ غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے جو صوفیۂ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا مرتبہ مراتبِ فقر و درویشی میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر اِن معنوں کے اِس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسبِ حال بھی ہوسکتے ہیں۔ جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نگذرے ہوں، مگر ضرور ہے کہ انھیں کے نتایج افکار میں شمار کئے جائیں۔ کیونکہ بلغا اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا مقصود ایک خاص معنی سے زیادہ نہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محل رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا جسکو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے۔ یہ تو بہت آسان ہے، مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی۔ کہ اُسکی بھلائی اُنکے بغیر دشوار معلوم ہو۔ اور اُن تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع سے نہ ڈرنا۔ یہاں تک کہ بد مذہب اور کافر مشہور ہونا مگر قوم کی خیر اندیشی سے دست کش نہونا۔ نہایت دشوار بلکہ بعض حالتوں میں قریب ناممکن کے ہے، کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروروں میں ایسا ایک فرد دنیا کی عجائبات میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے، ناچار مسلمانی پر اکتفا کر۔ یہ معنی

کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے، مگر الحمد للہ کہ خود ہماری قوم میں حسنِ اتفاق سے اسوقت ایک شخص موجود ہے جسکی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی اِن معنوں سے زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے۔ یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں جسنے کافر، ملحد، نیچری، دجّال، سب کچھ کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیر خواہی سے دست بردار نہوا۔

از ہر رزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن　　　جوئی! بخیاباں رو سیلی! بہ بیاباں شو

ہرزہ یعنی براے نام جاری ہوجانے سے قلزم نہیں ہوا جاسکتا۔ اے مخاطب تو ایک نالی ہے باغ کی کیاریوں میں جا، اور ایک رَو ہے جنگل کی راہ لے۔ یہ اُن ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے جو کسی فن میں تھوڑی سی شُدبُد حاصل کرکے اپنے تئیں کاملین میں شمار کرنے لگتے ہیں۔

گر چرخِ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ　　　ور گوے زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گرانمایہ ہوجائے اطاعت و فرمانبرداری کرنی ضرور ہے چاہو اطاعت کو عام لو اور چاہو خاص خدا کی فرمانبرداری مراد رکھو کیونکہ جس طرح دین میں بغیر خدا اور رسول کی فرمانبرداری کے کام نہیں چلتا اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک اور ماں اور باپ اور افسر اور آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

دربندِ شکیبائی مُردم ز جگر خائی　　　اے حوصلہ تنگی کن۔ اے غصہ فراواں شو

کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں میں کلیجہ مسوستا مسوستا مر گیا یعنی تھک گیا۔ اب سوا اسکے اور کسی طرح اِس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے اور غم حد سے بڑھجاے۔ پس کہتا ہے کہ اے حوصلے! تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے اب برخلاف اُسکے تنگ ہوجا، اور اے غم! تو زیادہ ہوجا!

تاکہ مجھسے ضبط نہو سکے، اور کھل کھیلوں، اور اس جگر خواری کے عذاب سے نجات پاؤں.

سرمایہ کرامت کن و انگاہ بغارت بر   بر خرمن ما برقے بر مزرعہ باراں شو

اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اول سرمایہ دیتے ہیں پھر جب چاہتے ہیں اُسکو تباہ کر دیتے ہیں مگر شاعر بطور مبالغہ کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر مینھ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پر بجلی گراتا رہتا ہے. یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے.

غزل مسلسل عاشقانہ

ذیل کی غزل مسلسل اور محض عاشقانہ ہے جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی ہیں، اور اُسکو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایت ظریفانہ پر ختم کیا ہے. اِس غزل میں صرف حسنِ بیان کا لطف ہے، خیالات بلند نہیں ہیں.

بتے دارم از اہلِ دل رم گرفتہ   بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

دل گرفتن اُکتا جانا یعنی اِس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپ سے بھی بگڑ جاتا ہے.

ز سفاک گفتن چو گل بر شگفتہ   دریں شیوہ خود را مسلّم گرفتہ

یعنی اگر کوئی اُسے سفاک کہتا ہے تو بُرا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہے گویا اپنی سفاکی کو مسلّم الثبوت مانے ہوئے ہے.

فسوں خواندہ و کارِ عیسے نمودہ   پری بودہ و خاتم از جم گرفتہ

یعنی افسوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہو کر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے.

دمش زخنہ در زہدِ یوسف فگندہ   غمش گندم از دستِ آدم گرفتہ

دم سے مراد بات ہے دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اُسکے غم میں آدم کو گندم جیسی عزیز چیز فراموش ہو جاتی ہے.

گہے طعنہ بر لحنِ مطرب سرودہ   گہے خردہ بر نطقِ ہمدم گرفتہ

بہ بیداد صد کشتہ برہم نہادہ   بہ بازیچہ صد گونہ ماتم گرفتہ

یعنی آپ ہی مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے.

بر رویش ز گرمی نگہ تاب خوردہ   بگویش ز رفتن صبا دم گرفتہ

نیارد ز من ہیچ گہ یاد ہرگز   مگر خوے خاقانِ اعظم گرفتہ

ظفر کز دمِ اوست در نکتہ سنجی   کہ غالب بآوازہ عالم گرفتہ

یہاں دم کے معنی افسون اور کرامت کے ہیں تقدیرِ عبارت یوں ہے کہ غالب در نکتہ سنجی بہ آوازہ عالم گرفتہ.

غزل مسلسل توحید

چوں زبانہا لال و جانہا پُر ز غوغا کردۂ   بادیت از خویش پرسید انچہ با ما کردۂ

یہ تمام غزل توحید میں ہے. کہتا ہے جبکہ تو نے ہماری زبانیں گونگی کر دی ہیں اور باوجود اسکے جانوں کے اندر شورش بھر دی ہے. اب تو اپنے ہی سے پوچھ لے کہ تو نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے.

گر نہ مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش   (جاں فدایت) دیدہ از بہرِ چہ بینا کردۂ

ہفت دوزخ در نہادِ شرساری مضمر است   انتقام ست ایں کہ با مجرم مدارا کردۂ

کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جسکی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپی ہوئی ہیں. پس اگر

تونے گنہگار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اُسکو بخش دیا تو یہ عین انتقام ہے؛ وہ اِس شرمندگی سے۔ کہ باوجود اِس قدر گناہوں کے ہمکو کچھ سزا نہیں دی۔ گویا بآتش دوزخوں میں جھونک دیا گیا۔

صد کشاد آنرا کہ ہم امروز زخ بنمودۂ   مژدہ باد آں را کہ محوِ ذوق فردا کردۂ

خستگاں را دل بہ پرسشہای پنہاں بُردۂ   با درستاں گر نواز شہاے پیدا کردۂ

خستگاں۔ زخمی اور شکستہ دل لوگ یعنی جنکی حالت ظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اُنپر خدا کا غصہ ہے۔ درست۔ صحیح و سالم کو کہتے ہیں؛ درستاں اُسکی جمع ہے یعنی وہ لوگ جنکی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے۔ گویا اُنپر خدا کی عنایت و مہربانی سب سے زیادہ ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تونے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے۔

چشمۂ نوش ست از زہرِ عتابت کام جاں   تلخیِ مَے در مذاقِ ما گوارا کردۂ

خدا تعالےٰ کے غصے اور عتاب کو چشمۂ نوش قرار دیتا ہے؛ اور اُسکو شراب سے تشبیہ دی ہے۔ کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے، مگر شرابیوں کے مذاق میں اس سے زیادہ کوئی شے خوشگوار نہیں۔ اِسی طرح تیرا عتاب گو بظاہر تلخ معلوم ہو مگر تیرے عشاق اُسکو چشمۂ نوش سمجھتے ہیں۔

جلوۂ و نظّارہ پنداری کہ از یک گوہرست   خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

کہتا ہے کہ تونے مخلوقات کو پیدا کرکے اُسمیں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے؛ تو گویا جلوۂ حسن اور نظارۂ عشق درحقیقت ایک ہی جنس سے ہیں یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں۔

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود   پیش ازاں کیں در رسد آنرا مہیّا کردۂ

کہتا ہے کہ بیماری تو جاندار کے ساتھ مخصوص تھی، اور بیماری کا علاج سنگ و گیاہ یعنی معدنیات اور نباتات میں تھا؛ پس تونے جانداروں کے پیدا کرنے سے پہلے سنگ و گیاہ کو مہیا کر دیا۔ جیسا کہ علم جیولوجی میں پہاڑوں اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

دیدہ می گرید، زباں می نالد، و دل می تپد   عقدہ ہا از کارِ غالب سر بسر وا کردۂ

مقطع میں پھر اپنی عادت کے موافق شوخی کی ہے۔ تمام نا ملائم حالتوں کو جو قائل پر گذر رہی ہیں اُن کو از راہ شوخی اور ظرافت کے عمدہ پیرائے میں ڈھالا ہے۔ کہتا ہے کہ آنکھ روتی ہے، زباں فریاد کرتی ہے، اور دل تڑپتا ہے؛ گویا تمام عقدے تونے حل کر دئیے ہیں۔ چونکہ آنکھ کا رونا، زبان کا فریاد کرنا، اور دل کا تڑپنا، اِن تینوں حالتوں میں ایک کشایش کی صورت محسوس ہوتی ہے اِس لئے اِن تمام حالتوں کو اپنے عقدوں کے حل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اِس مضمون کو شوخی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عشق کی معراج یہی ہے کہ آنکھ رو سکے، زبان فریاد کر سکے، اور دل تڑپے؛ پس غالب پر جو یہ حالتیں طاری ہیں گویا عشق کی راہ میں جتنے عقدے تھے وہ تونے سب حل کر دئیے۔

تا ہم ز دل بَرد کا فرادائے   با لا بلندے کوتہ قبائے

چوں مرگِ ناگہ لب یار تلخے   چوں جانِ شیریں اندک وفائے

در کام بخشی ممسک امیرے   در دلستانی مُبرم گدائے

گستاخ سازے پوزش پسندے   طاقت گدازے صبر آزمائے

از خوے ناخوش دوزخ نہیبے   وز روے دلکش مینو لقائے

زر دشت کیشے آتش پرستے　　　برسم گزارے زمزم سرائے

برسم - جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بالشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں، اور عبادت، یا نہانے، یا کھانے کے وقت اُن کو ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔ برسم گزار اور زمزم سرائے آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم اور زمزمہ وہ دعا ہے جو آتش پرست برسم ہاتھ میں لیکر پڑھتے ہیں۔

در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے　　　در مہربانی بستاں سرائے

تفسیدہ دشت تپتا ہوا صحرا - باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

از زلفِ پُرخم مشکیں نقابے　　　از تابشِ تن زرّیں ردائے

یعنی زلفِ پرخم اُسکے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب مُنھ پر پڑی ہوئی ہو۔ اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے وہ بدن کی چمک دمک سے سُنہری معلوم ہوتا ہے۔

در عرضِ دعوےٰ لیلےٰ نکوہے　　　بر رغمِ غالب مجنوں ستائے

یعنی جب دعویٰ حسن و جمال کرتا ہے تو لیلیٰ کی ہجو کرتا ہے ؛ اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑا عاشقِ صادق تھا۔

تو کے ز جور پشیماں شدی - چہ می گوئی　　　دروغِ راست نمائے کہ داشتی داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ "میں ظلم سے پشیماں ہو گیا ہوں"، تو کب پشیماں ہوا ہے ؟ کیونکہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو - جیسا تو پہلے بولتا تھا اب بھی بولتا ہے۔ پس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیماں ہوں یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی و باز　　　نگاہِ مہر فزائے کہ داشتی داری

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے ؛ پھر بھی تیری نگاہِ مہر فزا کا وہی حال ہے جو پہلے تھا ؛ کہ محبت کی آگ بھڑکائے چلی جاتی ہے۔

عتاب و مہرِ تو از ہم شناختن نتواں　　　خرد فریب ادائے کہ داشتی داری

جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب　　　ترا چہ باک ؟ خدائے کہ داشتی داری

بیہودہ نیست سعیِ صبا در دیارِ ما　　　اے بوئے گل پیامِ تمنائے کیستی

یادش بخیر تا چہ قدر سبز بودۂ　　　اے طرفِ جوئبار چمن جائے کیستی

جائے کسے سبز بودن - اُس کی جگہ کا خالی رہنا - اور سبز ہونے کے معنی سرسبز و شاداب ہونے کے بھی ہیں۔ طرف جوئبار - کنارہ جوئبار - چمن کی پٹڑی پر سبزہ دیکھکر کہتا ہے کہ اے کنارہ جوئبار چمن ! تو جو اس قدر سرسبز و شاداب ہے تو کس کی جگہ ہے۔ چونکہ وہاں معشوق کو نہیں پایا اس لئے بطور شگون نیک کے اول یادش بخیر کہکر پھر سوال کرتا ہے۔

نشنیدہ لذتِ تو فرو میرد و بدل　　　اے حرف امحو لعلِ شکر خائے کیستی

از ہیچ نقشِ غیرِ نکوئی ندیدۂ　　　اے دیدہ محوِ چہرۂ زیبائے کیستی

با ہیچ کافرایں ہمہ سختی نمیرود　　　اے شب بمرگِ من کہ تو فردائے کیستی

بمرگِ من - یعنی اے شب تجھکو میری موت کی قسم ؛ چونکہ اُس وقت اپنی موت سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا اس لئے رات کو اپنی موت کی قسم دے کر پوچھتا ہے کہ تو کسکی فردائے قیامت ہے ؟ یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گذر رہی ہے کسی کافر کے ساتھ نہ گذرتی ہوگی۔ پھر تو کافر سے بھی بڑھکر کونسے گنہگار کی قیامت کا دن ہے ؛ بتا تو سہی ؛

غزل مسلسل عاشقانہ

ایکہ گفتم نہی داد دل-آرے نہی
تا چون دلِ جسمان شیوہ نگارے نہی

چشمہ نوش ہمانا نہ تراوو زِدِلے
کش نگیرئ و در اندیشہ فشارے نہی

کہتا ہے کہ اُس دل سے یقیناً چشمہ نوش نہیں ٹپک سکتا جباو کہ تو بھینچکر تصور میں فشار ندیوے۔
یعنی جب تک کہ دل عشقِ مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا اور طرح طرح کی کوفت اُسمیں نہیں اُٹھاتا اُسمیں
صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند
تو کہ باشی؟ کہ بجز زحمت کارے نہی

اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جاوے۔

سر براہِ دم شمشیر جوانی نہ نہی
تن بہ بندِ غم فتراک سوارے نہ نہی

خوں بہ ذوقِ غم یزدان نشناسے نخوری
دیں بمہرِ حقِ الفت مگذارے نہی

یزدان نشناس اور حقِ الفت مگذار، دونوں مرکب صفتیں ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

آخرِ کار نہ پیداست؟ کہ در تن فسرو
کفِ خونے کہ بدان زینتِ دارے نہی

فسرد فسردن کا مضارع ہے۔ فسردن ٹھٹھر جانا خشک ہو جانا یعنی کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے؟ کہ وہ
خون جس سے تو کسی صلیب کو رنگین نکریگا مرنے کے بعد بدن ہی میں خشک ہو کر رہجائیگا۔

حیف گر تن بسگان سرِ کوئے نرسد
وائے گر جاں بسر رہگذارے نہی

رہزنانِ اجل از دستِ تو ناگاہ برند
نقدِ ہوشے کہ بسودائے بہارے نہی

بخمِ طرّۂ حورانِ بہشت آویزند
نازپرور دہ دلے را کہ بیارے نہی

گر تنزل نبود-ابرِ بہاری غالب
کہ در افشانی و زافشاندہ شمارے نہی

یعنی اگر اس کہنے میں تیری کسرِ شان نہو تو اے غالب تیری مثال ابر بہاری کی سی ہے کہ موتی برساتا ہے
اور اُنکی گنتی نہیں بتاتا یعنی بے شمار موتی برساتا ہے۔

تصوف

دریاز حباب آبلہ پائے طلب است
نورِ نظرِ اے گوہرِ نایاب کجائی

تصوف

شور یست نواریزی تارِ نفسم را
پیدا ئہ اے جنبشِ مضراب کجائی

یعنی میرے تارِ نفس سے جو نغمے نکل رہے ہیں اُنھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے، مگر اے جنبشِ
مضراب کہ جس سے یہ تار بج رہا ہے تو کہاں ہے؟ تیرا کہیں پتا نہیں۔

تعلّی

بنمائے بہ گوسالہ پرستاں یدِ بیضا
غالب بہ سخن صاحبِ قرتاب کجائی

قرتاب کرامت اور معجزے کو کہتے ہیں۔ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناقص العیار شاعروں
کو مانتے ہیں۔

تصوف

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمار دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری

دیدہ ور یعنی صاحب نظر وہ شخص ہے کہ جب اسکو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں کون سی چیزیں دلکش و دلربا
ہیں تو وہ انگھڑ پتھر کے اندر بتانِ آزری کو رقص کرتے ہوئے دیکھ لے یعنی مادے میں جو قابلیت
اور استعداد خدا نے ودیعت کی ہے وہ پہلے اِس سے کہ قوت سے فعل میں آئے اُسپر ظاہر ہو جائے۔

تصوف

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روی نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

یہ خطاب ہے جنابِ احدیت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرے کو دیکھئے اُسکا منھ تیرے ہی رستے کی طرف
پھرا ہوا ہے اور اس لئے تیری راہِ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ
اُسکا ہر ذرہ تیری طرف رہنمائی کرتا ہے۔

تصوّف

ہرکو لست در برش- داغ تو روید شُد دل   تا چو بدیگرے دہد- باز بری بداوری

کہتا ہے کہ جسکے پہلو میں دل ہے اُسکے دل سے تیرا داغ روئیدگی کی طرح اُگتا ہے، اور یہ اس لئے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگالے تو تو اِس حجّت سے- کہ تیری نشانی اُسپر موجود ہے- وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داوری جھگڑا، مُنشا، اور حجّت۔

تصوّف

رشکِ ملک چہ و چرا؟ چوں بتو رہ نمی برد   بیہدہ در ہوائے تو می پرد از سبکسری

یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جبکہ وہ بھی بے فائدہ تیری تلاش میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور تجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔

شکایت

حیف کہ من بخوں تپم- وز تو سخن رود کہ تو   اشک بدیدہ بشمری، ناله بسینہ بنگری

یعنی افسوس ہے کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

ناداری

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم زبے نمی   طوبیٰ اگر زمن شود ہیمہ کشم زبے بری

یعنی میری شومیٔ بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر مجھکو ملجائے تو اُسمیں نمی باقی نرہے اور مجھے اُس خاک کے سوا کچھ حاصل نہو اور اگر طوبیٰ میری مِلک ہوجائے تو وہ ایسا بے بر ہوجائے کہ اُسکی لکڑی ایندھن کے کام آئے۔

حالتِ فکرِ شعر

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل   غالب اگر دمِ سخن رہ بضمیرِ من بری

کہتا ہے کہ اگر فکرِ شعر کے وقت تو میری حالتِ درونی کو ٹٹولے تو دل کے گداز سے ایک آگ کی رَو بہتی ہوئی تجھکو نظر آئیگی۔ یہ اُس جوش اور اُس آگ کا بیان ہے جو اصلی شاعروں کے دلمیں شعر کہتے وقت بھڑکتی رہتی ہے۔

مرزا کی غزلیات- جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اور جن میں منتخب اور برگزیدہ اشعار ایک چوتھائی سے کم نہونگے۔ اُنمیں سے کسی قدر اشعار- جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ معلوم ہوئے بطور نمونے کے یہاں نقل کردئے گئے ہیں- تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں- مگر اتنا دماغ نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اوّل سے آخر تک بنظر غور دیکھیں- وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھکر اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ مرزا کی غزل شعراے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے؟ اور اُنکی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟ اگرچہ بمقتضاے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ اُن سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جنکی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ اپنی تمام شاعری کی بنیاد رکھی ہے؛ یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، اسیر وغیرہ مگر چونکہ اس مختصر میں زیادہ گنجائش نہیں؛ اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی بھی نہیں معلوم ہوتی اس لئے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے- کہ اسوقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں- کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل یا خفتست اور بلا خفتست ہے مرزا صاحب نے بھی اسپر غزل لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نو بیت کی ہے جسمیں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے۔ اس لئے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف آٹھ بیتیں یہاں لیجائینگی تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہوسکے اور بعد موازنے کے مرزا کے باقی اشعار بھی نقل کردئے جائینگے۔

نظیری   **غالب**

نظر بقا ہر و صیاد در قفا خفتست   بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفتست

اجل رسیدہ چہ داند بلا کجا خفتست　　بسینہ می سپرراہ گرچہ پا خفتست

نظیری نے اس بات کو، کہ عشق ایسے طور پر وفتنہ پیدا ہو جاتا ہے جسکا سان گمان تک نہیں ہوتا۔ ایک معمولی حالت کے پیرائے میں۔ جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گذرتی رہتی ہے۔ بیان کیا ہے۔ نظیری کا بیان۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ بہت صاف اور نیچرل ہے۔ اور گو یہ مطلع اُسکے اعلےٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا لیکن مرزا کے مطلع سے بہر حال بہتر ہے۔

مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گذار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرت خضر بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں۔ مرزا کے اس مطلع پر اُن کی زندگی میں "عصا خفتست" کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا؛ مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے "دو سے بجملہ اول عصاے پیر بخفت"، مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا؛ کیونکہ شیخ کے ہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ "عصا خفتن" سے جو معنی اُسنے بطور استعارے کے مراد رکھے ہیں اُن کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ بخلاف مرزا کے شعر کے۔ کہ جب تک یہ نہ بتایا جاے کہ سعدی نے عصا خفتن کے یہ معنی لئے ہیں۔ تب تک اُس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے۔

نظیری

کجا ز عشوۂ آں چشم نیم باز رہیم
کہ فتنہ خاستہ از خواب و پای ما خفتست

غالب

دگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ
مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

نظیری معشوق کی اُس حالت کو۔ جب کہ وہ سوتے سے اُٹھا ہو، اور آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ مندی ہوں اور اپنا جی اُسکے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا نہو۔ اس طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے، اور ہمارا پانوں سو گیا ہے؛ پس اُسکی چشم نیم باز کے عشوے سے کیونکر رہائی ہوگی

مرزا مسافر کی اُس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزل مقصود قریب ہو مگر مسافر میں نہ اُسکی سواری میں آگے قدم اُٹھانے کی طاقت نہو اس طرح بیان کرتے ہیں دگر ز ایمنی راہ الخ ان دونو شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جاسکتی جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کرینگے مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے اور ہر شخص جسپر ایسی حالت گذرے اُسکا مصداق ہو سکتا ہے یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظیری

کسے بہ قلب شبستم ترکتاز مے آرد
کہ بر فراش قصب پاے در حنا خفتست

غالب

غمت بشہر شبیخوں زناں بہ بنگہ خلق
عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفتست

نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اول اُسکو سوجھا ہے مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے کہتا ہے کہ میرے گھر پر آدھی رات گئے وہ شخص آکر ڈاکا ڈالتا ہے جو ریشمی بچھونوں میں پانوں کو مہندی لگائے پڑا سوتا ہے مطلب یہ کہ اُسکا تصور اور اُسکا خیال بغیر اسکے کہ اُسکو اطلاع ہو رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت

آرام بالکل برباد کردیتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شبخوں مار رہا ہے اور کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محلسرا میں چین سے پڑے سوتے ہیں یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعر سے پیدا ہوا ہے مگر مرزا کی غیر معمولی آنچ اور بلند پروازی کے ثبوت کے لئے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونو پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

غالب	نظیری
ببیں ز دور و مجو قربِ شہ کہ منظر را	شمیمِ مہر ز باغِ وفا نمے آید
دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفتست	بہر چمن کہ تو بشگفتۂ صبا خفتست

اگرچہ مآل دونو شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔ نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفائے حقیقی کے باغ سے مہر والتفات کی خوشبو نہیں آتی، گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوقِ حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں کی صبا پڑی سوتی ہے (یعنی اسکو اہتزاز مطلق نہیں ہے) جس سے اُس چمن کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اُسکو دُور ہی سے دیکھ لو، اور قربِ شاہ یعنی ذاتِ بحت کی تلاش مت کرو، کیونکہ اگرچہ جھروکے کے پٹ کھلے ہوئے ہیں (یعنی اُسکے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیونکہ عین دروازے پر اژدھا سوتا ہے۔

اِس تقریر سے ظاہر ہے کہ مآل دونو کا یہ ہے کہ معرفتِ ذات محالات سے ہے۔ مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

غالب	نظیری
بصبحِ حشر چنیں خستہ رو سیہ خیزد	طبیبِ عشق بُبرد طمع ز بیمارے
کہ در شکایتِ درد و غمِ دوا خفتست	کہ شب براحت ازیں درد و بے دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرضِ عشق کا طبیب اُس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے جو کسی رات کو اس درد و بے دوا یعنی عشق کی بےچینی سے آرام کے ساتھ سو گیا ہو، گویا مریضِ عشق کی علامتِ محمود یہی ہے کہ اُسکو کبھی راحت نصیب نہو۔ مگر شعرائے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے، حالانکہ عاشق صادق کی علامت یہی ہے کہ اُسکو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہو، بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عینِ راحت معلوم ہو۔ پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشقِ صادق وہی ہے جو ہمیشہ بےچینی اور بیقراری میں بسر کرے، اور جب ایسا ہوگا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اُسکی زبان سے نکلے گی۔

مرزا نے اسی لئے اِس مضمون کو اُلٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن روسیاہ اُٹھے جو درد دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے۔

غالب	نظیری
درازیِ شبِ بیداریِ من انہمہ نیست	کس از معانقۂ روزِ وصل یابد ذوق

کہ چند شب بہم آغوشِ خود جدا خفتست　　ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس۔ آں کس کی جگہ لایا ہے۔ معانقۂ روزِ وصل۔ وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو۔ شعر کا مضمون معمولی ہے، مگر الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شبِ ہجر کی درازی، اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو، یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ ہاں یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے؟ کیونکہ رات کی درازی، اور میری بیداری، اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں۔ سب اُسی کے سو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکمہ دونوں میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور حالی ہے۔ اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اُس میں اَن نیچرل بھی نہیں ہے۔

نظیری	غالب
شبِ امید بہ از روزِ عید مے گذرد کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست	بدیں نیاز کہ باتست نازمی رسدم گدا بہ سایۂ دیوارِ پادشا خفتست

نظیری کا شعر اُسکی تمام غزل میں بیت الغزل ہے بلکہ اُسکے سارے دیوان کے اُن ۲۰ نشتروں میں سے ایک نشتر ہے جو اساتذہ نے اُسکی غزلیات میں سے انتخاب کئے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کرسکتا۔ مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر کا لنا مرزا ہی کا

کام تھا تشبیہ نہایت بلیغ اور دل نشین واقع ہوئی ہے۔ یعنی مجھ جیسے ادنےٰ درجے کے آدمی کو۔ جو تیری جناب میں نیاز ہے اُسپر مجھکو ایسا ہی ناز ہے جیسا اُس فقیر کو ہونا چاہیے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سائے میں پڑا ہو۔

نظیری	غالب
فسانہ صرفِ نظیری مکن کہ خواب کند شکستہ رکہ بصد درد مبتلا خفتست	بخواب چون خوم آسودہ دل ان غالب کہ خستہ غرقہ بخون خفتہ است تا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اِس لئے سنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ و کوفتہ آدمی (نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مبتلا ہو کر پڑ رہا ہے۔ وہ سو رہے گا۔

مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اے غالب! مجھکو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا، کیونکہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو جاگتے یا سوتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

یہاں تک دو تو غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کئے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار۔ جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں لکھتے ہیں۔

خروشِ حلقۂ رندان ز نازنین پسریست　　کہ سر بزانوے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز　　گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست

دلم بسبحہ و سجّادہ وردا لرزد　　　کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست

براہ حقیقتِ من ہر کہ بنگرد داند　　　کہ میرِ قافلہ در کارواں سرا خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے؛ اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی لطافت نہیں رکھتا۔ اُسکے بعد کے تینوں شعر ہم ستے کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں۔ انمیں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے۔ اور پچھلے دونو شعر بھی نظیری کے غزل کے عام اشعار سے کسی طرح رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے توہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونو غزلوں کو مساوی درجے میں رکھیں۔ ورنہ انصاف یہ ہے کہ ہیأتِ مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لیجانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دیجائے۔ نظیری وہ شخص ہے جسکی نسبت مرزا صائب کہتے ہیں۔

"صائب چہ محال ست شوی ہمچو نظیری　　　عرفی بہ نظیری نرسانید سخن را"

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں:

ہمچیشمی نظیری حد بشر نباشد

اور شیخ ابو الفضل آئین اکبری میں اُسکی نسبت لکھتے ہیں "درے از نزہتگاہ معنی بر وی کشودہ اند" پس ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اُس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کی بنا

اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں اُن میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی جسمیں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہو۔ کیونکہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی انھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں جو اُنکے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی غزلوں میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لیجانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونو غزلیں شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں

"شب فراق چہ داند کہ تا سحر چندست　　　مگر کسیکہ بزندانِ عشق دربندست"

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا متتبع ظاہر کرتے ہیں اس لئے اُسکی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے اُسمیں۔ یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب۔ اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے جسکے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لئے گئے ہیں؛ اور اُسکے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخہ سے بھی کر لیا گیا ہے۔ اس لئے وہی غزل موازنے کے لئے انتخاب کی گئی ہے۔ اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے اس واسطے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اُسمیں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے۔ اور نیز دونو غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی

یعنی وش دش بیت کی ہیں۔

ظہوری	غالب
بعشق قابلِ دیوانگی خردمندست	چو صبح من ز سیاہی بشام مانندست
بجز ز جملہ کہ آزاد مرد ایں بندست	چگویمت کہ ز شب چند رفت یا چندست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے اسی کو خردمند سمجھنا چاہیے بس چاہیے کہ تو سب سے قطع تعلق کردے، کیونکہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے وہی بندِ عشق کا مرد (یعنی اسکے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جبکہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے تو مجھسے کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گذری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی ہی تاریکی چھائی رہتی ہے، پس مجھے کیا خبر ہے کہ کتنی رات گذری اور کتنی باقی ہے؟ ظہوری کے شعر میں اسکے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اُسنے اپنی عادت کے موافق اسمیں بھی صنعتِ تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خردمندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

ظہوری	غالب
بشکر دیدۂ تر۔ تر زبانئے دارم	نگاہِ مہر بہ دل سر نداده چشمۂ نوش
کہ زہر گریہ۔ طراوت دہِ شکر خندست	ہنوز عیشِ باندازۂ شکر خندست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدۂ تر کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں، کیونکہ گریہ کا زہر

معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اُسکو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق گو بظاہر ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے۔ اِس مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اُسکی نگاہِ مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی، بلکہ ہم صرف اُسکے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور تر زبانی یا زہر گریہ اور شکر خند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں مگر مرزا کا شعر اُس سے زیادہ بلیغ، نیچرل اور عاشقانہ ہے۔

ظہوری	غالب
مگر کہ رخصتِ بے طاقتی شود مرہم	نہ گفتۂ کہ بہ تلخی لب باز و پند پذیر
کہ گوشِ دل شدگاں ریشِ گشتۂ پندست	برو۔ کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پندست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگاں (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصح کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے ہیں، اُن کے اس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ انکو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ ناصح سے گلخپ ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کہا؟ کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت) سے موافقت کرلے، اور ہمارا کہنا مان لے۔ جا! اپنا رستہ لے، ہماری شراب اس نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، پس ہمکو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قافیہ کیا

جیسا کہ ظاہر ہے۔ مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

ظہوری

چہ غم کہ عہد گسل دارد کشاکشِ ناز
کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوند ست

غالب

درازدستی من چاکی ارفگند چہ عیب؟
زپیش۔ دلقِ ورع با ہزار پیوند ست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش مجھسے عہد شکنی کراتی رہتی ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں، کیونکہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے اُسی قدر پیوندِ عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری درازدستی اور بیباکی ورندمشربی نے دلقِ ورع و تقوےٰ کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے تو میرا چنداں قصور نہیں ہے، کیونکہ اُسمیں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں۔ یعنی خود اہلِ ورع و تقویٰ ہی اُسکی دھجیاں اُڑا چکے ہیں، مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اُسکا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے۔ جو عشاق پر ہمیشہ گذرتا ہے۔ اور صنعتِ تضاد کا التزام بھی نہیں چھوڑا، کہ گسیختن پر اُسکے ضدِ حقیقی یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودیکہ ظہوری کے ہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا۔ مرزانے بھی اِس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم دادِ بلاغت نہیں دی، یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو مشکل سے اُسپر ترجیح دیجا سکتی ہے۔

ظہوری

غالب

بگو حدیثِ وفا از تو باور ست بگو
شوم فدائے دروغی کہ راست مانند ست

زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی
نہ گویدار چہ بمرگِ من آرزومند ست

مرزانے مانند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا۔ اور ظہوری کے ہاں آرزومند کا قافیہ کہیں نہیں بندھا۔ اِس لیئے یہ دو تو مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھدی گئی ہیں جنکی دونوں کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے۔ مرزانے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر۔ یہ سُنکر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزومند ہے خوشی سے مرجانا۔ واقع کے بالکل خلاف ہے۔

ظہوری

زاہلِ مہر و محبت نشاں نمی ارم کس
بہ مہرِ خویش وبہ بیمہریِ تو سوگند ست

غالب

وجود او ہمہ حسنست و ہستیم ہمہ عشق
بہ بختِ دشمن و اقبالِ دوست سوگند ست

ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اوّل دعوے کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں، اور اِس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بے مہری کی قسم کھاتا ہے جسکی خوبی اور لطافت ظاہر ہے۔ مرزا کا دعوےٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے، اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے۔ اور اِس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے جسمیں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ رقیب کے نصیب کی قسم اسلئے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے وہ بالکل اُسی کے حصّے میں آگیا ہے۔ اور معشوق کے اقبال کی قسم اِس لیئے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اُسکے سودا میں عشق و محبت کا پتلا بنگیا ہے۔

اِسکے سوا لفظی مناسبتیں جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست، اور بخت و اقبال۔ یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا۔ اِسنے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

ظہوری	غالب
ز رہروانِ تو منزل شمار را کہ شمرد	شمارِ کجروی دوست در نظر دارم
غم از کسے کہ نمید اند اندہش چندست	دریں نورد ندانم کہ آسماں چندست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے، اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے۔ اُسکو تیرے رہروؤں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ "غم از کسی ست"، یعنی غم معشوق اُس شخص کا حصہ ہے جسکو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصوّر ایسا جما ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ اِس نورد (یعنی کجروی) میں آسمان کی کس قدر شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے مگر مضمون کے لحاظ سے دونو شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری	غالب
شود گسستہ بایام گرچہ زنجیر ست	برنج از پے راحت نگاہداشتہ اند
اسیر آنکہ بتار نگاہ در بند ست	ز حکمت است کہ پای شکستہ در بند ست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدّت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے؛ پس درحقیقت قیدی وہی ہے جو نازِ نگاہ معشوق میں اُلجھا ہوا ہے۔ جسکو اِس قید سے کبھی رہائی نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہمیں تکلیف میں اِس لیئے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو۔ اور اِسکی مثال یہ ہے

کہ پا شکستہ آدمی کو جو چلنے پھرنے نہیں دیتے، اور جب تک ہڈی جڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں۔ اِس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اُسکو راحت حاصل ہو۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے مگر شعر کی بندش سُست اور ڈھیلی ہے مرزا کے ہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے مگر بیان نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

ظہوری	غالب
ز بندگاں نسزد آرزو۔ خدا نکند	اگر نہ بہرِ من۔ از بہرِ خود عزیزم دار
ہمیں بس ست کہ ما بندہ او خداوندست	کہ بندہ۔ خوبیِ اُو خوبیِ خداوندست

ظہوری کے شعر میں "خدا نکند"، یا تو محض حشو ہے، اور یا اُسکے بعد کچھ عبارت مقدّر ہے یعنی "خدا نکند کہ ما آرزو بکنیم"۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

مرزا کا شعر اُن کی غزل میں بیت الغزل ہے؛ اور معنیً اور لفظاً دونو طرح سے ظہوری کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے۔

ظہوری	غالب
اسیرِ عشق۔ ظہوری نشانہ دارد	نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب
نشانہ اینکہ ببیدادِ دوست خرسندست	بدیں کہ پرسد و گویند ہست خرسندست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیرِ عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش رہتا ہے۔ مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہلِ دنیا سے وفا کا طالب ہوں؛ بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے؟ اور لوگ اُسکے جواب میں کہیں کہ ہاں ہے۔ دونو مقطع ہموار ہیں مگر باوجود اِسکے مرزا کا بیان بانکپن سے خالی نہیں۔

ہمنے دونوں شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کردی ہے ؛ مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونوں غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی راے پر چھوڑ دیا ہے • وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہونگے • اس بات کا اندازہ کرلینگے کہ دونوں غزلوں میں کیا نسبت ہے •

رباعیات

مرزا کی رباعیاں تعداد میں قریب سوا سو کے ہیں - جنمیں سے اکثر شوخی و بیباکی، بادہ نوشی، فخر و مباہات، اور شکایت و زارنالی کے مضامیں پر مشتمل ہیں • اور کسی قدر متصوفانہ، اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں • خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے • مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے • چنانچہ ان میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کیجاتی ہیں • اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اسکی شرح بھی کردیجائیگی •

۱ غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم — زاں رو بصفای دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی - زدم چنگ بشعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

گہر - گوہر - اصل • دودہ - نسل و خاندان • زادشم - پشنگ کے باپ اور تور ابن فریدوں کے بیٹے کا نام ہے - جسکی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں • دم تیغ - تلوار کی دھار • دمم - یعنی میرا کلام • سپہبدی - سلطنت و سپہ سالاری • نیا - دادا • نیاگاں جمع • کہتا ہے کہ جب سپہبدی ہماری قوم سے رخصت ہوگئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کرلیا ؛ گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بنگیا •

۲ شرطست کہ بہر ضبط آداب و رسوم — خیزد بعد از نبی امام معصوم

زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گراے — مہ جاے نشین مہر باشد - نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر ؛ کیونکہ خلفاے ثلثہ پر نجوم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کرسکتے •

۳ راہیست ز عبد تا حضور اللہ — خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
این کوثر و طوبے کہ نشانہا دارد — سر چشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

کہتا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے ؛ خواہ اسکو دراز سمجھو خواہ کوتاہ سمجھو • اور یہ جو کوثر و طوبے ہیں - جنمیں اسکی راہ کے کچھ کچھ نشاں پائے جاتے ہیں - یہ ایسے ہیں جیسے اثنار راہ میں چشمہ اور سایہ آجاتا ہے •

۴ آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو — نازم بخدا چرا توانا نبود

تیسرے مصرع میں دارد کا فاعل خدا ہے جسکا نام چوتھے مصرع میں لیا ہے خانہ سے مراد خانۂ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں •

۵ با دست غم - آں باد کہ حاصل ببرد — آب رخ ہوشمند و غافل ببرد
بگذاشتہ ام خمے ز صہبا بہ پسر — کش اندہ مرگ پدر از دل ببرد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے - ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا لیجائے ؛ اور دانا اور ناداں کی آبرو کو بہالے جائے ؛ اسی لئے میں بیٹے کے لئے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں ؛ تاکہ باپ کے مرنے کا غم اسکے دل سے دھو دے •

شوخی

۶ اے آنکہ براہِ کعبہ روئے داری — نازم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تندمے خرامی - دانم — در خانہ زنِ ستیزہ خوئے داری

کعبہ جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بدمزاج عورت ہے جسکے سبب سے کعبہ جانے میں اسقدر جلدی ہے۔

فخریہ

۷ شاہا ہر چند دایہ جو آمدہ ام — دانی کہ چہ پایہ نغز گو آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بہ رو آمدہ ام — آبم کہ محیط را بجو آمدہ ام

بے تعلقی

۸ زانجا کہ دلم بوہم دربند نبود — باہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصودِ من از کعبہ و آہنگِ سفر — جز ترکِ دیارِ زن و فرزند نبود

یعنی چونکہ میں وہم میں - جو نیست کو ہست کی صورت میں دکھاتا ہے - گرفتار نہ تھا، اسی لئے کعبہ کے عزم سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عاشقانہ

۹ اے جامِ شرابِ شادکامی زدہ — در جور دم از بلند نامی زدہ
یاد آر ز من چو بینی اندر راہے — تنہا روِ خستۂ حرامی زدہ

حرامی = قزاق، حرامی زدہ = قزاقوں کا لوٹا ہوا۔ اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا ہے اور اپنی حالت کو اُس مسافر کے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو، اور قزاقوں نے اُسے لوٹ لیا ہو، گویا معشوق کو قزاق ٹھیرایا ہے۔

شوخی

۱۰ اے آنکہ ترا سعی بدرمانِ من ست — منعم مکن از بادہ کہ نقصانِ من ست
حیف ست کہ بعدِ من بمیراث رود — ایں یک دو سہ خم کہ در شبستانِ من ست

طبیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر میں گیا تو غضب ہو جائیگا، کہ یہ اکھٹے دو تین مٹکے میرے کام تو نہ آئینگے، میرے وارثوں کو پہنچ جائینگے۔

۱۱ آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیِ دہر — ریزد ہمہ دُردِ دَرد و تلخ آبۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست - کہ مرا — ناہید بہ غمزہ کُشت، و مریخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے خیال کو جانے دو، میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں قسم کے ستارے نحس ہوگئے، کہ زہرہ نے مجھے غمزے سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے۔

۱۲ شرطست کہ روی دل خراشم ہمہ عمر — خونابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر برگِ مومن — چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

۱۳ غالب روشِ مردمِ آزاد جداست — زنّار اسیرانِ رہ و زاد جداست
ما ترکِ مراد را ارم می دانیم — واں باغچۂ ضبطیِ شدّاد جداست

یعنی آزاد لوگوں کی اَور روش ہے، اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں اُنکا اَور ڈھنگ ہے۔ ہم کہ آزاد لوگ ہیں ہمارے نزدیک ترکِ مراد کا نام ارم ہے، اور وہ ارم جس سے شدّاد محروم رکھا گیا وہ ہمارے ارم سے الگ ہے۔

۱۴ ایں نامہ کہ راحتِ دلِ ریش آورد — سرمایۂ آبروے درویش آورد
در ہر بُنِ مُو دمید جانے - یعنی — سامانِ نثارِ خویش باخویش آورد

۱۵ منصورِ غمش ز نکتہ چیناں چہ بود — در راست خطر ز ہمنشیناں چہ بود

چون عاقبتِ یگانہ بینان دارست | دریاب کہ انجام دو بینان چہ بود

کہتاہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور ذلت سے مارا گیا تو منصور کو اسکی کچھ پروا نہیں مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بیں لوگوں کا انجام دار ہے تو دو بینوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

شوخی

۱۶ ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است | بر خاکِ رہِ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا ارم بدعوے طلبید | شداد ہمانا پسرے داشتہ است

کہتاہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتاہے اسکو عاجزی کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم دعوے کے ساتھ طلب کرتاہے اس سے معلوم ہوا کہ شداد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا۔ کیونکہ اوّل تو ارم جو کہ متروکہ شداد ہے اسکا دعوے کرنا، اور پھر خدا کے سامنے اسکے مانگنے میں ہیکڑی کرنی، یہ دونو باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شداد نے اپنا وارث حقیقی چھوڑا تھا۔

شوخی

۱۷ غالب بسخن گرچہ کسے ہمسر نیست | از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار!!! | ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

کہتاہے کہ اے غالب اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، مگر عقل کا نشہ تیرے دماغ میں بالکل نہیں، شراب چاہتاہے، وہ بھی مفت، اور وہ بھی عمدہ، اور پھر کثرت سے!!! یہ بادہ فروش ہے، ساقی کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کر دیگا۔

شوخی

۱۸ گردیدنِ زاہدان بجنت گستاخ | ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ

چون نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ | مانند بہ بہائم و علف زار فراخ

یعنی زاہدوں کا بہشت میں بیباک پھرنا، اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لئے ہاتھ مارنا، اگر غور کرکے دیکھو تو اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اسمیں ڈھور ڈانگر چرتے پھرتے ہیں۔

اخلاق

۱۹ آں راکہ بود درستی در فرجام | ہم محرمِ خاص آید و ہم مرجعِ عام
آساں نبود کشاکشِ پاسِ قبول | زنہار نہ گردی بہ نکوئی بدنام

فرجام- انجام اور نکوئی انجام اور رنگ و رونق کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رنگ و رونق یعنی شہرت و ناموری مراد ہے۔ کہتاہے کہ جسکی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے وہ ضرور ہے کہ خواص کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاس قبول کی کشاکش- یعنی ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے- نہایت سخت چیز ہے۔ پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی مشہور- ہونا نہیں چاہئے۔ اس موقع پر بجائے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے جس سے ساری رباعی میں جان پڑگئی ہے۔

مذہبی

۲۰ در عالمِ بےزری کہ تلخست حیات | طاعت نتواں کرد بامیدِ نجات
اے کاش زحق اشارت صوم و صلوٰۃ | بودے بوجودِ مال چوں حج و زکوٰۃ

کہتاہے کہ بےمقدوری کی حالت میں جبکہ زندگی تلخ ہوتی ہے نجات کی امید پر طاعت نہیں ہوسکتی کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تموّل شرط ہے روزہ اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔

۲۱ هرچند زمانه مجمعِ جهال ست — درجهل نه حال شان بیک حال ست

کودن همه - لیک از یکے تا دگرے — فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجال ست

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جہلاء جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں اُنکا حال متفاوت و مختلف ہے۔ کودن تو سب ہیں۔ مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خرِ عیسیٰ اور خرِ دجال میں۔

۲۲ تا میکش و جوہر دو سخنور داریم — شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم

در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست — در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

یہ رباعی منشی جواہر سنگھ جوہر اور میر احمد حسین میکش کے حق میں - کہ دونو مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے لکھی ہے۔ در میکدہ پیریم - یعنی پیرِ مینا نیم - باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

۲۳ دستم بکلیدِ مخزنے می بایست — دربود تہی - بدامنے می بایست

یا ہیچ گہم بکس نیفتادے کار — یا خود بزمانہ چون منے می بایست

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہئے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو کہیں کسی کا دامن ہونا چاہئے تھا - جسکے توسّل سے زندگی بسر ہوتی؛ یا مجھکو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا، اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحبِ کمال ہوتا - جو میری قدر کرتا۔

۲۴ ہستم ز مئے امید سرمست و بس ست — دام سرِ این کلاوہ درست - و بس ست

گر از تو بلطف و کرمے نیست رسا — استحقاقِ ترحّمے ہست و بس ست

سرِ این کلاوہ - یعنی سرِ این رشتہ - باقی معنی ظاہر ہیں۔

۲۵ گر گرد ز گنجِ گوہرے برخیزد — مپسند کہ دود از جگرے برخیزد

منت نتوان نہاد بر گدیہ گراں — بنشین کہ بخدمت دگرے برخیزد

گنجِ گوہرے گرد اُٹھنے کے معنی اُسکے خالی ہوجانے کے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر جواہرات کا خزانہ خالی ہوجائے تو بلا سے، مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جگر سے دُھواں اُٹھے۔ بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا؛ خدا نے اُنکی خدمت پر تجھکو کھڑا کیا ہے؛ اگر تجھسے یہ خدمت پوری نہیں ہوسکتی تو بیٹھ جا، تاکہ دوسرا اس خدمت کے لئے اُٹھے۔

۲۶ اے دوست بسوی این فرومانده بیا — از کوچۂ غیر راه گردانده بیا

گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگِ توام — برگفتۂ خویش باش و ناخوانده بیا

اوپر کے دونو مصرعے صاف ہیں اُسکے بعد کہتا ہے کہ اے دوست تونے مجھسے کہا تھا کہ مجھے مت بلانا میں تیری موت ہوں اچھا اب تو اپنے کہنے پر قائم رہ اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے تو بھی بن بلائے چلا آ۔

اے آنکہ ہما اسیرِ دامت باشد — صافِ مئے خسروی بجامت باشد

۲۷ تسبیح بہ اسمِ الٰہی کہ بود — آغاز ز ابتداے نامت باشد

یہ رباعی سبحان علیخاں مرحوم کو جو مرزا نے خط لکھا تھا اُسکے اول میں لکھی تھی معنی ظاہر ہیں۔

۲۸ بازی خورِ روزگار بودم ہمہ عمر — از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر

بے مایہ بفکرِ سود ماندم ہمہ جا — بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

۲۹ باید کہ دلت ز غصّہ برہم نشود — از رفتنِ زر دست خوش غم نشود

این سیم و زرست خواجه! این سیم و زرست — غم نیست که هر چند خوری کم نشود

دست خوش۔ مغلوب و زبردست۔ کہتا ہے کہ اے دولتمند! چاہئے کہ روپے کے کم ہو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں دبا ہوا رہے۔ اے حضرت یہ سیم و زر ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم و زر ہے، یہ غم نہیں ہے کہ جس قدر کھائے جائیے کم نہیں ہوتا۔

۳۰ دارم دلِ شاد و دیدہ بینائے — وز کرّیِ گوشم نبود پروائے
خوب ست کہ نشنوم ز ہر خود رائے — گلبانگ اَنا ربّکُمُ الاعلائے

کہتا ہے کہ مجھکو کرّی گوش یعنی ثقلِ سماعت کی کچھ پروا نہیں بلکہ اسکو بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ میں ہر خود پسندوں کی زبان سے انا ربکم الاعلیٰ (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

۳۱ اے کردہ بآرائشِ گفتار بسیچ — در زلفِ سخن کشودہ راہِ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی — ذاتے ست بسیط منبسط دیگر ہیچ

بسیچ۔ قصد۔ زلفِ سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی۔ کہتا ہے کہ عالم جسکو تو نے کچھ اور چیز سمجھ رکھا ہے۔ وہ صرف ذات واحد ہے جو بسیط ہے یعنی مرکب نہیں۔ اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ بس اسکے سوا کچھ نہیں۔

۳۲ اے تیرہ زمیں کہ بودۂ بسترِ من — ہر خاک کہ با تست ہمہ بر سرِ من
زر بہرِ کسان و بہرِ من دانہ و دام!! — اے مادرِ دیگران و مادندرِ من

مادندر سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لئے تجھ پر سونا بچھا ہوا ہے، اور میرے لئے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں، گویا تو اوروں کی ماں ہے اور میری میندر ہے۔ یہ مضمون

تھوڑے تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے، مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے رودکی کہتا ہے "جہانا چہ بینی تو از بچگاں ÷ کہ مادر گہے گاہ مادندری" اور فرخی کہتا ہے۔ "مہرِ فرزندی بر خواجہ فگندہ ست جہاں ÷ ایں جہاں مادرِ او نیست کہ مادندرِ اوست"

۳۳ آنرا کہ ز دستِ بے زری پامال ست — رسوائی نیز لازمِ احوال ست
ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بمے — ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

کہتا ہے۔ کہ مفلس آدمی کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بدنام ہو۔ چنانچہ ہمکو دیکھو! کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں، اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں، گویا ساقی کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ منہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ مفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد بدنام اور رسوا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کبھی کلال کی دوکان پر جاکر ہاتھ پسارتا ہے، اور جو تھوڑی بہت مل جاتی ہے تو بدمست ہوکر اسکی دوکان ہی پر یا راہ میں گر پڑتا ہے، اور آتے جاتے والے سب اسکو دیکھتے ہیں، کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں تو اس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے اور سب لوگ دیکھتے ہیں۔ حالانکہ کبھی اسکو اطمینان سے سیر ہوکر شراب پینی میسر نہیں ہوتی۔ اس حالت کو اس تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقیِ تقدیر ہمکو چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو تر نہیں ہوتے اور کپڑے سارے شور بور ہو جاتے ہیں۔ ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں۔

۳۴ اے دادہ بباد عمر در لہو و فسوس — زنہار مشو ز رحمتِ حق مایوس
ہشدار! کہ ز آتشِ جہنم حق را — تہذیب غرض بود نہ تعذیبِ نفوس

فسوس۔ ہزل و استہزا۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے؛

بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اسکی کھوٹ نکالنی منظور ہوتی ہے اِسی طرح آتش جہنم سے نفوسِ انسانی کو مہذب کرنا مقصود ہے۔

ضمیمہ

۳۵ یارب تو کجائی کہ بہ ما زر ندہی | بیدرد خدائی کہ بما زر ندہی
نے نے۔ تو نہ غائبی، و نے بیرحمی، | بے مایہ چومائی کہ بما زر ندہی

اِس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گذر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اسپر کفر کا فتوےٰ دیا جائیگا؛ لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بجائے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و فراخی و خوشحالی و بدحالی کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے؛ اور تدبیر و عقل و دانش کو اُس میں بالکل عاجز و درماندہ سمجھتا ہے؛ یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ ہمنے تدبیر نہیں کی، یا تدبیر میں ہمسے غلطی ہوگئی، یا ہماری کاہلی و سستی سے یہ تنگدستی ہمکو نصیب ہوئی؛ بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہوگیا ہے۔ جو ہم کو کچھ نہیں ملتا؛ ہاں اِس قسم کے خطابات آدابِ شریعت کے بالکل خلاف ہیں؛ اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے۔

"مابروں را ننگریم وقال را | ما دروں را بنگریم وحال را"

قصائد مرزا کے قصائد جن میں قطعات، نوحے، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کیا باعتبار کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت کے اُنکے اصنافِ نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے؛ اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتد بہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور و مسلم الثبوت

اُستاد کی غزل سے گرا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اکثر کی غزل پر ہر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے؛ مگر اسی کے ساتھ غزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جسمیں تغزل کی شان یعنی عام فہم اور خاص پسند ہونا بہت کم پایا جاتا ہے۔ بخلاف قصیدے کے کہ اسمیں قصیدے کی شان جیسی کہ ہونی چاہیے اوّل سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمان و ظہیر کا اور کہیں عرفی و نظیری کا؛ اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے؛ اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا سیٹھا ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا؛ علی الخصوص متاخرین نے مبالغہ کی نے بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا ہے؛ اور اس کلیہ سے مرزا کی مدح بھی مستثنےٰ نہیں۔ البتہ عرفی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے جو اُسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اُس سے مُعرّا ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لیگئی ہیں۔

چونکہ مرزا کے تمام قصائد اور اُنکے ملحقات کے انتخاب کی اِس مختصر میں گنجایش نہیں ہے اِسلئے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں۔ اور ایک آدھ مدح اور کچھ قطعے اور نوحے بطور نمونے کے اِس مقام پر نقل کرتے ہیں اور آخر میں مرزا کا ایک ترکیب بند

نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کرینگے تاکہ اصحاب ذوق صحیح کو دونو کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع سلے کہ مرزانے اکبری طبقہ کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

توحید

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ — گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
دیدہ بیرون و درون از خویشتن پر ۔ و انگہے — پردۂ رسم پرستش در میاں انداختہ
نقش بر خاتم ز حرف بے صدا انگیختہ — شور در عالم ز حسن بے نشاں انداختہ
چرخ را در قالب ابداع در رو وا ریختہ — خاک را بر نطع پیدائی ستاں انداختہ
عاشقاں موقف دار و رسن وا داشتہ — غازیاں در معرض تیغ و سناں انداختہ
رنگہا در طبع ارباب قیاس آمیختہ — نکتہ ہا در خاطر اہل بیاں انداختہ
با چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی — مردہ را از خویش در یا بر کراں انداختہ

دوئی کو مردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے یعنی جسطرح دریا مردے کو باہر پھینکدیتا ہے اسی طرح باوجود ہنگامۂ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نردبانے بستہ با دیوار کاخے در نظر — انتہا شے در نہاد این و آں انداختہ
رفتہ ہر کس تا قدمگاہے ز انجا خویش را — پایہ پایہ از فراز نردباں انداختہ
غم چو گیر د سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد — بہر آسانی اساس آسماں انداختہ

گل چو ماند دیر گرد و بر دلش بازار سرد — بہر تجدید طرب طرح خزاں انداختہ
آتشے از روئے گلہائے بہار افروختہ — شعلہ در جان مرغ صبح خواں انداختہ
دجلہ در ساغر معنی طرازاں ریختہ — رشحہ در کاسہ دریا و کاں انداختہ
جز بدیں آب آتش زردشت نتواں سرد کرد — کعبہ را جوئے بہشت از ناوداں انداختہ
جز بدیں الماس نتواں اینچنیں در سفت — رخنہ از اسلام در کیش مغاں انداختہ

یعنی آتش زردشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی اس لئے میزاب کعبہ سے بہشت کی نہر جاری کردی اور کیش مغاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا اُسکا بیدھنا یعنی اسمیں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا۔

چشم را بخشیدہ چوناں گردشے کار باب ہوش — بر زمیں دانند طرح آسماں انداختہ
دادہ ابرو را بد انساں جنبشے کاہل قیاس — در تن شمشیر پندارند جاں انداختہ
اے ز فرم خاکساران تو از شہپر ہما — چوں گلیم کہنہ ظل را بر کراں انداختہ
ذوق تمکین گدایان تو گنج شاہ را — از دل گنجور در چشم پاسباں انداختہ
تا دریں صورت چشم دشمناں پنہاں بود — دوست را اندر طلسم امتحاں انداختہ
تا علاج خستگی آسایش دیگر دہد — خارہا در رہگذار میہماں انداختہ

مرثیہ و نوحہ

کفر ست کفر ۔ در پے روزی شتافتن — ننگ ست ننگ ۔ در غم دنیا گریستن
گاہے بہ داغ شاہد و ساقی گداختن — گاہے بہ برگ نانک و با با گریستن

بایدم بر دہر زہ گریستن۔ دگر گریست … بیجا گریستیم۔ دریغا گریستن

رشک آیدم بابرکہ در حدِ وسع اوست … بر خاکِ کربلائے معلّیٰ گریستن

رفت آں چہ رفت۔ بایدم اکنوں ہدا نگاشت … از بہرِ نورِ دیدۂ زہرا گریستن

بارانِ رحمتے!!! کہ باندازِ شست وشو … دارد بہ روسیاہی اعدا گریستن

خود را ندیدزاں لبِ نوشیں بکامِ خویش … زیبد بہ شور بختی دریا گریستن

مزدِ شفاعت وصلۂ صبر و خوں بہا … ہیچ از کسے نخواستہ اِلّا گریستن

چوں زرقِ عیب در دو ترا عام کردہ اند … سر میزند زمومن و ترسا گریستن

اے فلک شرم! از ستم بر خاندانِ مصطفےٰ … داشتی زیں پیش سر بر آستانِ مصطفےٰ

اے بمہر و ماہ نازاں ہیچ میدانی چہ رفت؟ … از تو بر چشم و چراغِ دودمانِ مصطفےٰ

سایہ از سرو روانِ مصطفےٰ افگند بخاک … ہاں چہ بر خاک افگنی سرو روانِ مصطفےٰ

گرمیِ بازارِ امکاں خود طفیلِ مصطفےٰ ست … ہیں چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفےٰ

کینہ خواہی ہیں!! کہ با اولادِ امجادش کنی … انچہ باہم کردہ اعجازِ بیانِ مصطفےٰ

نیک بود کز تو بر فرزندِ دلبندش رود … انچہ رفت از مرتضےٰ بر دشمنانِ مصطفےٰ

یا تو دانی مصطفےٰ را فارغ از رنجِ حسینؑ؟ … یا تو خواہی نیں مصیبت امتحانِ مصطفےٰ؟

یا مگر گاہے ندیدی مصطفےٰ را با حسینؑ؟ … یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفےٰ؟

آں حسین ست ایں کہ گفتے مصطفےٰ روحی فداک … چوں گذشتے نامِ پاکش بر زبانِ مصطفےٰ

آں حسین ست ایں کہ بوسی مصطفےٰ چشمش بہ رنج … بوسہ چوں باقی نماندے در دہانِ مصطفےٰ

قدسیاں را نطقِ من گو ز ہ غالب در سماع … گشتہ ام در نوحہ خوانی مدح خوانِ مصطفےٰ

اے کج اندیشہ فلک حرمتِ دیں بایستے … علمِ شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے

تا چہ اخنا دکہ بر نیزہ سرش گردانند … عزتِ شاہِ شہیداں بہ ازیں بایستے

حیف باشد کہ فتد خستہ ز توسن بر خاک … آنکہ جولانگہِ او عرشِ بریں بایستے

حیف باشد کہ ز اعدا دمِ آبے طلبد … آنکہ سائل بدرش روحِ امیں بایستے

تازیاں را بہ جگر گوشۂ احمد چہ نزاع … وطنِ اصلیِ ایں قوم زچیں بایستے

ایہا القوم! تنزل بود ار خود گویم … میہماں بے خطر از خنجرِ کیں بایستے

یعنی یہ تو ادنیٰ درجے کی بات ہے اگر یہ کہا جائے کہ اے اہلِ شام کربلا کا مہمان خنجرِ کیں سے محفوظ رہنا چاہیئے تھا بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لائق ہے وہ یہ ہے یعنی جیسا اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخن اینست کہ در راہِ حسینؑ ابنِ علیؑ … پویہ از روی عقیدت بہ جبیں بایستے

چشمِ بد دور بہ ہنگامِ تماشای رخش … رونما سلطنتِ روی زمیں بایستے

داشتن ناخواستہ در شکرِ قدومش دادن … اگرش مُلک وگر تاجِ و نگیں بایستے

چوں بفرمانِ خود آرائی و خود بینی و بغض … آں نکردید کہ از صدق و یقیں بایستے

با اسیرانِ ستمدیدہ پس از قتلِ حسینؑ … دلِ نرم و منشِ مہر گزیں بایستے

چہ ستیزم بقضا ورنہ بگویم غالب   علمِ شاہ نگوں شد۔ نہ چنیں بایستے

وقت ست کہ در پیچ و خمِ نوحہ سرائی   سوزد نفس نوحہ گر از تلخ نوائی
وقتست کہ آں پردگیاں۔ کز رہِ تعظیم   بر در گہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند   چوں شعلہ دخاں بر سرِ شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ فرسودۂ تشویشِ اسیری   دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہِ رہائی
اے چرخ چو آں شد گر از بہرِ چہ گردی   اے خاک چو ایں شد گر آسودہ چرائی
خوں گرد۔ و فرو ریز! اگر صاحبِ بہری   برخیز و بخوں غلط! اگر اہلِ وفائی
تنہاست حسینؑ ابنِ علیؑ در صفِ اعدا   اکبر تو کجا رفتی و عباسؑ کجائی
توقیعِ شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت   از خونِ حسینؑ ابنِ علیؑ یافت روائی
فریاد ازاں حاملِ منشورِ امامت   فریاد ازاں نسخۂ اسرارِ خدائی
فریاد ازاں زاری و خونابہ فشانی   فریاد ازاں خواری و بے برگ و نوائی
فریاد ز بیچارگی و خستہ درونی   فریاد ز آوارگی و بے سر و پائی
غالب جگری خوں کن و از دیدہ فرو بار   گر روے شناسِ غمِ شاہِ شہدائی

سرو چمن سروری افتاد ز پا۔ ہاے   شد غرقہ بخوں پیکرِ شاہِ شہدا۔ ہاے
بر خاکِ رہ افتادہ تنے ہست۔ سرش کو   آں رومی فرزندۂ وآں لعفِ دوتا۔ ہاے

عباسؑ دلاور کہ دراں ہر دو ہی داشت   شمشیر بیکدست و بیکدست لوا۔ ہاے
آں قاسمِ گلگوں کفنِ عرصۂ محشر   واں اکبرِ خونیں تنِ میدانِ وغا۔ ہاے
آں اصغرِ دل خستۂ پیکانِ جگر دوز   واں عابدِ غمدیدۂ بے برگ و نوا۔ ہاے
اے قوتِ بازوے جگر گوشۂ زہرا   دستِ تو بشمشیر شد از شانہ جدا۔ ہاے
اے شہرہ بدامادی و شادی کہ نداری   کافور و کفن۔ بگذرم از عطر و قبا۔ ہاے
اے مظہرِ انوار کہ بود اہلِ نظر را   دیدارِ تو دیدارِ شہِ ہر دو سرا۔ ہاے
اے گلبنِ نو رستۂ گلزارِ سیادت   نایافتہ در باغِ جہاں نشو و نما۔ ہاے
اے منبعِ آں ہشت کہ آرایشِ خلدند   داغم کہ رسن شد بگلوے تو روا۔ ہاے
بالغ نظرانِ روشِ دینِ نبی۔ حیف   قدسی گہرانِ حرمِ شیرِ خدا۔ ہاے
ماتم کدہ آں خیمۂ غارت زدگاں حیف   غارت زدہ آں قافلۂ آلِ عبا۔ ہاے
آں تابشِ خورشید دراں گرم روی حیف   واں طعنۂ کفار دراں شورِ عزا۔ ہاے
غالب بملائک نتواں گشت ہم آواز   اندازۂ آں کو کہ شوم نوحہ سرا۔ ہاے

بیا در کربلا تا آں ستمکش کاروان بینی   کہ در روے آدم آلِ عبا را ساربان بینی
نہ بینی ہیچ بر سر خازنانِ گنجِ عصمت را   مگر در خارِ تن ہا تار و پودِ طیلسان بینی
ہمانا سیلِ آتش بردہ بنگاہِ غریباں را   کہ ہر جا پارۂ از رخت و موجے از دخان بینی
ببینی چشمۂ از آب و چوں جوئی کنارش را   ز خونِ تشنہ کاماں چشمۂ دیگر روان بینی

بہ بینی سرخوشِ خوابِ عدم عباس غازی را   ز شکش در خمِ بازو نہ تیرش در کماں بینی

ہجومِ خستگان و سوز و سازِ نو گرفتاراں   نوآئیں بزم طوئے قاسمِ ناشادماں بینی

نمی بینی کہ چوں جاں داد سیداد بدخواہاں   علی اکبر کہ ہمچوں بخت بدخواہش جواں بینی

گر از ختم کا ینہمہ بینی دلے داری دو چشمے ہم   بخوں آغشتہ نازک پیکرِ اصغر چساں بینی

چہ دنداں بر جگر افشردہ باشی کاندراں وادی   حسین ابنِ علی را در شمارِ کشتگاں بینی

نیاری گرد آں کوشی کہ پایش در رکاب آری   نہ بینی گر خود آں خم ہی کہ دستش بر عناں بینی

تنے راکش گلِ گل خار بودے بر زمیں یابی   سرے راکش زافسر عار بودے بر سناں بینی

ستایشِ روزگار

ہست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد   آئینِ دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

مردست مرد - ہر چہ کند بے خطر کند   رادست راد - ہر چہ دہد رایگاں دہد

گلزار را اگر نہ ثمر - گل بہم نہد   درویش را اگر نہ سحر - شام ناں دہد

گنجِ سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر   وانگہ کلیدِ گنج بدستِ زباں دہد

تا روزِ خاک تیرہ نہ گردد ز رشکِ چرخ   رخشانے ستارہ بریگِ رواں دہد

تا آدمی ملال نگیرد ز یک ہوا   سرمائے نو بہار و تموز و خزاں دہد

ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن   تا راحتِ مشام و نشاطِ رواں دہد

ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق   تا آرزوے کام و مرادِ دہاں دہد

آں راکہ بخت دسترسِ بذل ہا نیست   طبعِ سخن رس و خرد خردہ داں دہد

آں راکہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست   نعم البدل ز خامۂ پروین فشاں دہد

دانم کہ آسماں بزمیں پیشکار کیست   عکسِ چہ جلوہ روشنیِ روشناں دہد

چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داورست   بیداد نبود انچہ بما آسماں دہد

رنگ از گل ست و سایہ ز نخل و نوا ز مرغ   ہر جا بہار - ہر چہ بود در خورِ آں دہد

در نشترِ نفحۂ قرعہ بنامِ ہوا زند   در نشوِ سبزہ حکم بہ آبِ رواں دہد

مستیز با نسیم اگر بلبلے بباغ   جاں در نور دِ خارو خس آشیاں دہد

دار روز بہرِ زندگی آمد - نہ بہرِ مرگ   جرمِ پزشک چیست اگر خستہ جاں دہد

پرویز دیر یاب شہے بود - ورنہ بخت   آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دہد

فرہاد زود میر کسے بود - ورنہ دہر   کامِ دلِ غریب پس از امتحاں دہد

دارم ز روزگار نویدے کہ آں نوید   در پیریم بشارتِ بختِ جواں دہد

از داورِ زمانہ باندیشہ درست   شادم کہ مژدۂ بندگیم ناگہاں دہد

ہرگہ بسر نوشت سرآید شمارِ غم   راہم بہ بارگاہِ شہِ انس و جاں دہد

سلطانِ دین محمد مہدی کہ رائے او   منشورِ روشنی بہ شہِ خاوراں دہد

صفتِ سالکانِ طریقت

رہرواں چوں گہرِ آبلۂ پا بینند   پاے را پایہ فراتر ز ثریا بینند

ہر چہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند   ہر چہ در سینہ نہانست ز سیما بینند

راستی از رقمِ صفحۂ ہستی خوانند   نقشِ کج بر ورقِ صفحۂ عنقا بینند

یہ شعر گویا ماحصل ہے اِس قول کا کہ "لَیْسَ فِی الْاِمْکَانِ اَبْدَعُ مِمَّا کَانَ" یعنی جو نظامِ عالم کہ اب موجود ہے اِس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دور بینانِ ازل۔ کوری چشم بدبیں — ہم دریں جا نگرند انچہ در آنجا بینند

رازِ زیں دیدہ دراں جوئے کہ از دیدہ وری — نقطہ گرد در نظر آرند سویدا بینند

(یعنی چشم بد دور ۱۲)

راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی — جادہ چوں نبضِ تپاں رگِ صحرا بینند

شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جَست — زخمہ کردار بتارِ رگِ خارا بینند

قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست — صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند

(یعنی گہر خواہد شد ۱۲)

شام در کوکبۂ صبح۔ نمایاں نگرند — روز در منظرِ خفاش ہویدا بینند

وحشتِ تفرقہ در کاخِ مصور سنجند — مجمعِ اُنس بہ نَنے بستِ زلیخا بینند

کاخِ مصور وہ محل جسکو زلیخا نے وصالِ یوسف کے لئے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامانِ عیش و کامرانی جمع تھا۔ نَنے بست وہ جھوپڑا جو یوسفؑ کے قید ہو جانے پر اُنکی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لئے بنا لیا تھا اور اُسمیں رہتی تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کاخِ مصور جیسے آراستہ محل میں اُس تفرقہ کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخرکار پیدا ہوا اور اُنس اور ملاپ کو اُس نَنے بست میں دیکھ لیتے میں جو یوسف اور زلیخا کو اُسکے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہر چہ گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند — ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

یعنی خسرو و شیریں کا قصہ جو اہل عجم بیان کرتے ہیں یہ لوگ اُسکو خود خسرو اور شیریں کی زبان سے سُن لیتے ہیں اور وامق و عذرا کی روئداد جو عرب اسے بیان کرتے ہیں یہ لوگ اُسکو خود وامق و عذرا پر گذرتی دیکھ لیتے ہیں۔

نستوہند اگر ہمرۂ مجنوں گردند — نخروشند اگر محملِ لیلے بینند

خوں خورند و جگر از غصہ بدنداں گیرند — خویش را چوں بسرِ مائدہ تنہا بینند

یعنی جب اُنکے ساتھ کوئی دوسرا دسترخوان پر نہیں ہوتا تو دانت پیستے ہیں یعنی جو فیض اُن کو پہنچتا ہے اُس میں اوروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سر و تن را اگر از درد ستوہ انگارند — جان و دل را اگر دوست شکیبا بینند

قطرۂ آب بہ لب بوسۂ نشتر شمرند — پارۂ ناں بہ گلو ریزۂ مینا بینند

یہ دونو شعر دست و گریباں ہیں مطلب یہ ہے کہ دردِ طلب سے اکتا جانا اور دوست کے خیال سے فارغ ہونا کبھی نہیں چاہتے۔

قشقہ را رونقِ ہنگامۂ ہندو خوانند — بادہ را شمعِ طربخانۂ ترسا بینند

یعنی ہر ایک شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب و موزوں خیال کرتے ہیں اور کسی چیز سے ازراہِ تعصب ناک نہیں چڑھاتے۔

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب — خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلے بینند

برسم و زمزمہ آتش پرستوں کے ساتھ، قشقہ و زنار ہندوؤں کے ساتھ اور صلیب عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے مصرع میں شعائرِ اسلام کا بیان ہے کہتا ہے کہ وہ لوگ برسم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلے وغیرہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔

اشعار فخریہ

دل نہ بندند بہ نیرنگ و دریں دو رنگ — ہر چہ بینند بعنوان تماشا بینند

جام جویند و زرندی نہ گرایند بزہد — سبحۂ انجم اگر در ید بیضا بینند

ہر چہ در سو نتواں یافت بہر سو یابند — ہر چہ در جا نتواں دید بہر جا بینند

ہمہ گردند دراں پایہ کہ او را دانند — ہیچ باشند دراں وقت کہ خود را بینند

ایں نظرہائے گرانمایہ فراموش کنند — چوں بہ نیرنگ سخن شعبدۂ ما بینند

نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند — نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند

گہ پئے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند — گہ پئے فال بصد رنگ تمنا بینند

بردہ از یاد کہ دنیاست نمود بے بود — ایں دل افروز نمود یکہ ز دنیا بینند

اِس مقام پر اِس شعر کی خوبی وجدانی ہے بیان میں نہیں آسکتی۔ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ دل افروز نمود یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گذرے گی تو وہ اُنکے دل سے اِس عارفانہ خیال کو فراموش کر دیگی کہ دنیا محض ایک نمودِ بے بود ہے۔

صفتِ موسم بہار

تشبیب قصیدہ مدح ملکہ معظمہ

شکر کہ آشوبِ برف و باد سر آمد — نامیہ از بندِ زمہریر بر آمد

کسبِ ہوا نفعِ آبِ خضر رساند — سبزہ جہان را بہ بیشہ راہبر آمد

یعنی آج کل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو آبِ حیات کے پینے سے ہوتا ہے اور جس طرح خضر آبِ حیات کا رستہ بتاتا ہے اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔

در چمنستاں کشودہ بارِ نوادر — باد کہ بازارگانِ بحر و بر آمد

اشتلم انتظارِ گُل بود۔ ارنہ — دیدۂ نرگس ز حدقہ چوں بدر آمد

تا ز چہ دانستہ قُربِ مقدمِ گُل را — سبزہ بہ باغ از شگوفہ پیشتر آمد

یعنی سبزہ جو شگوفے سے پہلے باغ میں آیا ہے اِسنے گُل کی آمد آمد کہاں سے سُن لی۔

بیہدہ بنود خروشِ مرغِ سحر خواں — کوکبۂ گل بگر بباغ در آمد

قیس کجا تا کند شمارۂ محمل — از پسِ ہر غنچہ غنچۂ دگر آمد

غنچے کو محمل سے اور گُل کو لیلی سے تشبیہ دی ہے کہتا ہے کہ قیس جو ایک کے سوا دوسرا محمل نہیں جانتا وہ آئے اور محملوں کو شمار کرے کیونکہ ہر غنچے کے بعد دوسرا غنچہ اور دوسرے کے بعد تیسرا و ہَلُمَّ جَرّا نکلتے چلے آتے ہیں۔

کثرتِ انواعِ گُل نگر کہ ہیولے — رنجہ ز بارِ فزونیِ صُوَر آمد

یعنی طرح طرح کے پھولوں کی اِس قدر کثرت ہے کہ ہیولے بشمار مختلف صورتوں کی بہتات سے عاجز آگیا ہے اور تھک گیا ہے۔

لالہ بسیچد ز تیغ کوہ گذشتن — دامنش اینک ز زیرِ سنگ بر آمد

بسیچد یعنی ارادہ کرتا ہے تیغ کوہ قلۂ کوہ۔ دامن از زیرِ سنگ برآمدن مصیبت سے نجات پانا۔

نکہتِ گل شد وبائے عام جُعَل را — زنجرہ ہر شب تہ ہرزہ مویہ گر آمد

جُعَل ایک جانور ہے سیاہ رنگ جسکو خوشبو راس نہیں اسی لئے موسمِ بہار میں مرجاتا ہے اور چونکہ گوبر میں پیدا ہوتا ہے اس لئے اُسکو ہندی میں گُبریلا کہتے ہیں۔ زنجرہ جھینگر جو رات کو اکثر بولتا ہے۔ مویہ گر نالاں و گریاں۔

میکدۂ خسروِ گل ست - رزستاں صورتِ مینا ز غورہ در نظر آمد

کہتا ہے کہ رزستاں یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسرو گل کا شرابخانہ ہے کیونکہ اسمیں نیم خام انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شراب کی بوتلیں۔

رَوِ غم تردامنی مخور - کہ جہاں را موجِ گل از ہر کرانہ تا کمر آمد
فتویِ مَے داد ابر و باد و لیکن شیشہ نہاں بر کنارہ بدگہر آمد

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا۔

در روزگار ما نتواند شمار یافت خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت
پرکارِ تیز گردِ فلک درمیاں ببیں حق داد دادِ حق کہ بمرکز قرار یافت
درہاے آسماں بزمیں باز کردہ اند ہرکس ہر انچہ جست بہر روزگار یافت
آمد اگر بفرض ز بالا بلا فرود بر روی خاک پیچ و خمِ زلفِ یار یافت
چوں حسنِ ماہ یک شبہ بینی - سیداں کہ ماہ یادِ اشِ جانگدازیِ شبہای تار یافت
چوں رنگِ روی گل نگری - شاد شو کہ گل اجرِ جگر خراشیِ پیکانِ خار یافت
در خاک و باد و آتش و آب آشتی فزود ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جز بہ وادگرایش نمی کند درد ہر انچہ صورت ازیں چہار یافت
ہرکس بقدرِ فطرتِ خویش ارجمند گشت ہر شے بحسنِ جوہرِ خویش اشتہار یافت
گر خواجہ بندہ را خطِ آزادگی نبشت ہم بر درِ سرای خودش بندہ وار یافت

در بندہ خود ز خشم خطِ بندگی درید توقیعِ خوشدلی ز خداوندگار یافت
مہ روشنی - و مہر فروزش - ز سر گرفت لیل و نہار صورتِ لیل و نہار یافت
بہرام دل بہ بستنِ تیغ و کمر نہاد ناہید ذوقِ ورزشِ مضراب تار یافت
نظارہ یعنی چشم فتنہ ہای عیاں از نظر سترد اندیشہ گنجہای نہاں آشکار یافت
جام از شراب - روشنی آفتاب داد بزم از بساط تازگیِ نوبہار یافت
روی سخن صفای بناگوش گل گزید بانگِ قلم نشاطِ نوای ہزار یافت
بلبل
برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بہ دہر ہرکس نشاطِ تازہ ز ہر گونہ کار یافت
فیضِ سحر بہ غالبِ پیمانہ کش رسید ذوقِ صبوح عابدِ شب زندہ دار یافت
رہزن متاعِ خویش بر ابن السبیل ریخت کودک رضای لہو ز آموزگار یافت
گر زاہد ست نیز ز مِن مے بجام بُرد ور مجرم ست نیز ز شہ زینہار یافت
با فتنہ ہم مضایقہ در خرمی نرفت خود رخصتِ خواہش از رگِ گل نوکِ خار یافت
دولت سپند سوخت کہ شد ملک تازہ روی ملک آفریں سرود کہ دولت مدار یافت
از انتظامِ شاہی و آئینِ سروری سور و سرور رونق و داد اعتبار یافت
بر خستگانِ ہند بہ بخشود از کرم و کٹوریا کہ رونق از روزگار یافت

شکوۂ تغافل و عدم توجہ بہ نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رام پور در زمانہ سختی دیے بالگی کہ بعد از فتح دہلی روزے چند روے دادہ بود

چون نیست مرا شربتِ آبے ز تو حاصل
دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل

در بادیہ بر گورِ غریباں ز چہ سوزد
آں شمع فروزاں کہ بود در خورِ محفل

زاں خسروِ خوباں چہ قدر چشمِ وفا بود†
صد حیف کہ شد (یعنی من) نقشِ امیدم ہمہ باطل

افسانۂ غم گر بسرایم نبود عیب
با دوست کہ پیوستہ ہمی بُرد غم از دل

میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ "تن زن" (خاموش باش)
چوں می ندہد داد ز فریاد چہ حاصل"

از طعنہ شدم خستہ دل و از رہِ تیمار (غمخواری ۱۲)
دل گفت کہ ہاں شیوۂ عشاق فروہل

تا کس نبرد ظن کہ بہ شاہد بودم روے (یعنی اردی سخن ۱۲)
حاشا کہ حکایت کنم از لیلیٰ* و محمل

شاہد بود آں دوست کہ اندر غزل اورا
خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل

من نالم ازاں دوست کہ در عالمِ انصاف
شایاں بودش گویم اگر خسروِ عادل

او خسروِ خوباں بود و بندہ گدایش
او قلزم و عمّاں بود و من خسِ ساحل

خود ہر چہ سرودم ہمہ با اوست نہ زیں پیش
امید گہم بود بہر وادی و منزل

یارب چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من
بربستہ بردیم درِ ارسالِ رسائل

ای یوسفِ ثانی کہ بود در ہمہ عالم
مشتاقِ جمالِ تو چہ دیوانہ چہ عاقل

† نواب یوسف علیخاں مرحوم صاحبزادگی کے زمانے میں جب تحصیلِ علم کے لئے دلّی میں آئے تھے اس وقت مرزا صاحب سے بہت ربط تھا مفتی صدرالدین خاں مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی۔ مرزا نے اس قصیدے میں اس زمانے کو یاد دلایا ہے چنانچہ اسی قصیدے پر نواب ممدوح نے سو روپیہ ماہوار مرزا کے لئے مقرر فرمایا تھا جو مرزا کی دمِ واپسیں تک برابر جاری رہا ۱۲

* چونکہ تشبیب میں اکثر معشوق کی طرف خطاب ہوتا ہے اس لئے کہتا ہے کہ میں اس تشبیب میں لیلیٰ و محمل کا ذکر نہیں کرتا یعنی معشوق کی طرف میرا روئے سخن نہیں ہے ۱۲

تا نزدِ تو چوں آیم و دُور از تو چہ سازم
ماندن ز تو دشوار و رسیدن بتو مشکل (یعنی از تو دور ماندن ۱۲)

اے کاش بکوئے تو چنیں رہ نمودے
زینساں کہ فرو رفتہ مرا پای دریں گل (یعنی در وطن خود ۱۲)

چونست کہ گاہے نکنی روی بدیں سوے
از چیست کہ ہرگز نہی وایہ بہ سائل (روزینہ ۱۲)

گر جاں دہم از غصہ تو دانی کہ بگیتی
حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل

خواہی کہ مرا بنگری؟ از در بفرماے
تا نزدِ تو آرند یکے طائرِ بسمل

از صنعتِ استادِ ازل داں کہ ز ہر سوے
چوں قبلہ نما سوی تو ام ساختہ مائل

غالب سخن نام من آمد ازل آورد
دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل

در فنِ سخن دم مزن از عرفی و طالب (یعنی قدیم و اردی ۱۲)
ایں آیۂ خاص ست کہ بر من شدہ نازل

من گنجم و گردوں بگل اندودہ درم را (یعنی میرے در کو چھپا دیا ہے ۱۲)
مے بیں درِ گنج ارچہ کشودن شدہ مشکل

خود در خورِ ویرانہ بود گنجِ گرانمند (گنجِ گراں بہا ۱۲)
غم نیست گر آبادیِ دہلی شدہ زائل

ہاروت فسونِ نفسِ گرم چہ داند
اعجاز ز دہلی بود و سحر ز بابل

آں را کہ صریرِ قلمم ہوش رباید
دیگر نبرد ذوق ز آوازِ عنادل

توقیعِ بریلی بتو فرخندہ کہ من نیز (یعنی فرمانِ الحاقِ بریلی برام پور ۱۲)
بستم بہ فرہ مندیِ خویش از کرمت دل (اقبال مندی ۱۲)

حاشا کہ ستانم ز رقم قاضی و مفتی (یعنی عہدۂ قاضی و مفتی نمیخواہم ۱۲)
حاشا کہ پذیرم عملِ شحنہ و عامل

بفرست خردمند کساں را بحکومت
در جیبِ گدا ریز قلیلے ز مداخل

ہر سال ازاں شہر بمن وایہ رواں دار (یعنی از محاصلاتِ بریلی ۱۲)
کز بہرِ ہمیں گشتہ در اقطاعِ تو شامل (جاگیر ۱۲)

امید کہ لب تشنگیِ من نہ پسندی
زاں رشحہ کہ بر صفحہ فشانی ز انامل

زاں رشحہ یعنی مداد، مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط کتابت جاری رہے۔

امید کہ بپذیری و برمن نہ کنی قہر   نپذیرم اگر معذرت فرط مشاغل
امید کہ آں شیوہ نورزی کہ بگویم   کز درد دلم فارغ و از من شدہ غافل

کیفیت آغاز موسم سرما

عید اضحےٰ بسر آغاز زمستاں آمد   وقت آراستن حجرہ و ایواں آمد
گرمی از آب برون رفت و حرارت ز ہوا   محمل مہر جہاں تاب بہ میزاں آمد
روز می کاہد و شب راست درازی افزائش روے   موسم دیر غنودن بہ شبستاں آمد
آذر افروز و خز و اطلس و سیفور بدوز   مہر مہ میرود اینک مہ آباں آمد
ہند در فصل خزاں نیز بہارے دارد   گونہ گوں سبزہ مخملی بند خیاباں آمد
دے و بہمن کہ در اقلیم دگر یخ بندد   اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد
نیشکر بسکہ صف آراست کہ دور است نسیم   گفت جانیست دگر سر زدہ نتواں آمد
نخل نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ   گوی و چوگاں کف آورد و بمیداں آمد
تا برد داغ غم ہجر شقائق ز دلش   گل صد برگ بہ دلجوئی دہقاں آمد

گرنہ ایں گرمی ہنگامہ تماشا دارد
از چہ نرگس پے نظارہ بہ بستاں آمد

صفت موسم بہار

سحر کہ باد سحر عرض بوستاں گیرد   دہد بہ نکہت گل حکم تا جہاں گیرد
پرات بزر گل کردہ اند پنداری   کہ غنچہ را سپہ سبزہ درمیاں گیرد
مگر بگرد گل از بہر پاس حلقہ زدہ است   کہ ژالہ را ز ہوا سبزہ بر سناں گیرد
ستادہ سرو بداں اہتمام بر در باغ   کہ تا بہار دگر راہ بر خزاں گیرد
ز ژالہ غنچہ بہ سر مست شاہدی ماند   کہ بعد بادہ شکر ریزہ در دہاں گیرد
چمن ز عکس شفق ساتگین مل گردد   سمن ز جوش طرب رنگ ارغواں گیرد
زنند گر بہ آتش بہ نار گل بالد   کشند گر بہ پیکر ز سنگ جاں گیرد
ز انبساط ہوا بعد ازیں عجب دارم   کہ مرغ قبلہ نما جا در آشیاں گیرد
ز گل نگہ نتواں داشت دل بہ [illegible] عشق   اگر ز ما نتواند ز دلستاں گیرد
چناں بہ کنج چمن یافت ذوق طاعت حق   کہ شیخ شہر چو ما ترک خان و ماں گیرد
حریص جلوہ نگہ در ہجوم لالہ و گل   چو آں گدائے کہ دنبال کارواں گیرد
چنیں کہ شاخ ہمی سینہ بر زمیں مالد   چرا کسے ثمر از دست باغباں گیرد

کیفیت صبح

صبحے کہ در ہوای پرستاری بت   جنبد کلید بتکدہ در دست برہمن
در رفتہ رہرو بہ رہ دم گرم رہباں   آرد بر دل گداختہ شمع از لگن

خیز نیز دستۂ دستِ مغان نشستہ روی — وز آرزوی چیدنِ برسم ز نار دون

از شورِ دیریان گمانِ خروشِ صور — اموات را ز رقص بتن بر درد کفن

رخشند ستارہ از رخِ ناشستۂ صنم — بالد بنفشہ از قدِ خم گشتۂ شمن*

بر روی خاک جلوہ کند سایہ در نظر — بر بوی دوست حلقہ زند مرغ در چمن

خواہد چراغِ کشتہ چو شخصِ بریدہ سر — خیزد گلِ شگفتہ چو رنجورِ خستہ تن

بر جامِ گل ز دیدۂ شبنم چکیدہ گاہ — بر روی گل ز طرۂ سنبل دود شکن

غوغای روز پردہ کشاید ز خوب و زشت — آوای کوس خواب رباید ز مرد و زن

فخر و خود ستائی باشکوۂ بخت و گردوں

اِس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جناب امیرؑ کی منقبت میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں۔ چونکہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانۂ حال کے عام مذاق نا آشنا ہیں گر باوجود اسکے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے اسلئے نہ اُسکو اِس موقع پر بالکل قلم انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ اوّل سے آخر تک نقل کیجا سکتی ہے۔ لہذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار متضمن مضمون مندرجۂ عنوان انتخاب کرکے اِس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں

برسم جھاؤ یا انار وغیرہ کی تیلی تیلی بالشت بھر کی شاخیں جن کو آتش پرست عبادت یا غسل یا طعام کے وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں ۱۲

* شمن بت ۱۲

اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی مشکل مقامات کی شرح بھی کیجائیگی۔

بند اول

آن سحر خیزم کہ مہ را در شبستان دیدہ ام — شب نشیناں را دریں گردندہ ایوان دیدہ ام

اِس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اُس نورِ ظہور کے وقت میں آسمان پر یا زمین پر نظر آیا ہے اُسکو نہایت بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اُس سے ایک لطیف نتیجہ نکال کر شکایت آمیز فخر پر بند کو ختم کیا ہے۔ شعرِ مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اُسکی خوابگاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں یعنی کواکب یا ملائک کو اِس گردندہ ایواں (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

اینت خلوتخانۂ روحانیاں کانجا ز دور — زہرہ را اندر ردائی نورِ عریان دیدہ ام

اینت کلمۂ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہے و خہے۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوتخانہ روحانیوں کا ہے جہاں میں نے دُور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادرِ نور میں عُریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے۔

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش — لولئے را در دو عشر تگہ دو مہماں دیدہ ام

ہر گزائے ناداں برسوائی نبندی دل کزین — ماہ را در ثور و کیواں را بہ میزاں دیدہ ام

اِن دونوں شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے منجموں نے دورِ فلک کو بارہ حصّوں پر تقسیم کیا ہے جن میں سے ہر ایک حصّے کو بُرج کہتے ہیں اور اُنکے نام یہ ہیں حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ اِنمیں سے

ہر ایک برج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال۔ مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں اور برعکس اسکے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں اسی طرح ہر برج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے ثور اور میزان جن کا دوسرے شعر میں نام آیا ہے یہ دونوں زہرہ کے خانے ہیں اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اسکے شرف کے مقام (یعنی ثور) میں اور کیوان یعنی زحل کو اسکے شرف کے مقام (یعنی میزان) میں دیکھا اور چونکہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں اس لئے اس مطلب کو اسطرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لولی (رنڈی) یعنی زہرہ کی دو عشرتگاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گاہ میں نہیں ہے پھر دوسرے شعر میں دفع دخل مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بیان کو کسی برے معنی پر محمول کرنا چاہئے بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان میں دیکھا ہے۔

رفتہ ام زاں پس بسیر باغ و مرغاں زا باغ　　　سر برسم خواب زیر بال پنہاں دیدہ ام

برسم خواب۔ یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے۔ سر زیر بال پنہاں۔ یعنی بازو تلے سر گھسائے ہوئے۔

کلک موج نکہت گل دم ز گردش نا زدہ　　　نامۂ فیض سحر نوشتہ عنواں دیدہ ام

موج نکہت گل کو کلک یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیض سحر کو نامہ یعنی خط ٹھیرایا ہے۔ کہتا ہے

کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا کہ میں نے فیض سحر کا مکتوب جبکہ اسکا سرنامہ نہیں لکھا گیا تھا دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیض سحر ابھی عام نہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا۔

شانۂ باد سحرگاہی بجنبش نا مدہ　　　طرۂ سنبل ببالیں پریشاں دیدہ ام

اس بیت میں باد سحرگاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جسکے ملائم جھوکوں سے گویا سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانۂ نسیم صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرۂ سنبل بالین راحت پر پریشان پڑا ہوا تھا۔

باد سرمستانہ می جنبید و شبنم می چکید　　　غنچہ را در رخت خواب آلودہ داماں دیدہ ام

یہ اس حالت کے بعد کا بیاں ہے جو پہلے دو شعروں میں بیاں ہوئی ہے کہتا ہے کہ ہوا رسان رسان چل رہی تھی اور شبنم ٹپک رہی تھی جسکی وجہ سے میں نے غنچہ کو رخت خواب میں آلودہ داماں دیکھا یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم ہوتا تھا مگر چونکہ وہ عنقریب کھلنے والا تھا اس لئے وہ گویا اپنے رخت خواب میں آلودہ دامن ہو چکا تھا۔

صبح اول گو بروئے کس نیاورد از حیا　　　صبح ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

اب ان تمام عجائبات کی جو آخر شب اسکو نظر آئے انکی قلعی کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ صبح اول (یعنی صبح کاذب جو گویا کہ شرم و حجاب سے ایک جھلکی دکھا کر غائب ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا کے اصل بھید منہ پر نہیں لائی مگر صبح ثانی یعنی صبح صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خندہ زن

دکھیا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمیائی جلوے تھے جنکو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور
اسی لئے صبحِ صادق اُنپر خندہ زن تھی۔ اسکے بعد بند کو اس گرہ کے شعر پر ختم کرتا ہے اور
کہتا ہے۔

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند　　　تا بجرمِ گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

کہتا ہے کہ اگرچہ مجھکو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے، مگر اس لئے کہ کوئی میری بات
نہ سُنے اور پوشیدہ راز ظاہر ہونے پائیں مجھکو دنیا میں ذلیل و خوار کردیا ہے۔

از بند سوم

روشناسِ چرخ در جمعِ اسیرانش منم　　　نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم

کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اُسکا روشناس اور پہچاننے والا صرف میں ہوں؛
گویا میں اُس زنداں کے روزنِ دیوار کی جسمیں آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں۔
آنکھ کا نور ہوں۔

ثابت و سیارِ گردوں را رصد بستم بہ علم　　　رشتۂ تسبیحِ گوہرہای غلطانش منم

چونکہ رصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہوجاتے ہیں اس لئے کہتا ہے کہ میں نے جو آسمان کے
ثوابت و سیارات کی رصد باندھی ہے تو گویا میں اُسکے گوہرہاے غلطاں (یعنی کواکب)
کی تسبیح کا ڈورا ہوں جسکے سبب سے تمام ستارے مثل دانہاے تسبیح کے منتظم ہوگئے ہیں۔

نے ز دانش کامیاب و نی ز سختی تنگدل　　　شرمسارِ کوششِ برجیس و کیوانش منم

اہل نجوم کے نزدیک برجیس یعنی مشتری علم کا افاضہ کرنے والا ہے اور کیوان یعنی زحل

سختی اور مصیبت کا بھیجنے والا ہے کہتا ہے کہ نہ میں علم سے کامیاب ہوں اور نہ سختی اور مصیبت سے
گھبرانے والا ہوں تو گویا مشتری اور زحل دونو کی کوشش میرے باب میں رائگاں جاتی ہیں
اور اسلئے میں ان دونو سے شرمندہ ہوں۔

در لئیمی شہرۂ دہر از تہیدستیست چرخ　　　رفتہ مسکیں را ز یاد گنجِ پنہانش منم

کہتا ہے کہ آسمان جو لئیمی اور بخل میں مشہور ہے یہ اُسکی تہیدستی کا نتیجہ ہے کیونکہ اُسکے پاس
دینے کو کچھ باقی نہیں وجہ یہ کہ اُسکا گنجینۂ پنہاں میں تھا سو وہ اپنے خزانے کو یعنی مجھکو بھول گیا
ہے۔ مسکیں سے مراد خود آسمان ہے جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھکر بھول گیا۔

در غریبی خویش را از غصہ در دل می خلم　　　خوردہ ام از شستِ غم تیرِ کہ پیکانش منم

یعنی عالمِ غربت میں بسبب غم کے میں خود اپنے دل میں چبھتا ہوں گویا غم کی چٹکی سے وہ تیر
میرے آ کر لگا ہے کہ خود میں ہی اُس تیر کی بھال ہوں۔

ماندہ ام تنہا بکنج از دورباشِ پاسِ وضع　　　خانۂ دارم کہ پندارند دربانش منم

دورباش۔ ہٹو بڑھو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب اُمرا و سلاطین کی سواری کے آگے آگے
پکارتے جاتے ہیں۔ مگر شعرا اُسکو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت و مزاحمت کے معنوں میں
استعمال کرتے ہیں کہتا ہے کہ پاسِ وضع مجھکو گھر کے کونے سے کہیں باہر نہیں جانے دیتا
بس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اُسکا درباں میں ہی ہوں۔

پایۂ من جز بچشمِ من نیاید در نظر　　　از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

از بند چہارم

چوں بغیر از عمر کاں مفتست ہیچم مایہ نیست | تنومندم ہیم زیاں گر چرخ کج بازد بمن
تیر بنش دستے تواند بود۔ زاں بالاترم | دل بنازم۔ شیر گردوں پنجہ گر یازد بمن

پہلے مصرع کی تقدیر عبارت یہ ہے "من ازاں بالاترم کہ فلک را بر من دستے تواند بود" "شیر گردوں" سے مراد خود گردوں یا برج اسد یا مریخ۔ پنجہ یازیدن دست دراز کردن و حملہ نمودن۔ دل باختن بدحواس شدن۔

ہر کرا گردوں بلند آوازہ تر خواہد بدہر | نوبتِ شاہی دہد وانگاہ بنوازد بمن

بنوازد بمن۔ یعنی اُسکو میرے ذریعے سے معزز کرتا ہے دوسرے شعر میں اُسکی تشریح ہے۔

پادشاہاں را سخن گفتن بکارِ ہر کس است | دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن اندازد بمن
ور تو گوئی پادشہ را مایہ نبود۔ بیم نیست | خود بشاہاں مایہ بخشم گر بپردازد بمن
آنکہ چوں در ملکِ ہستی سکۂ شاہی زند | سکۂ شاہی بطغرائے یدُاللّٰہی زند

قولہ "پادشہ را مایہ نبود" اِس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطینِ عہد اِس قدر مایہ نہیں رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں؛ اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ مرحوم جو اُس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور بادشاہ کے لقب سے ملقب تھے وہ گردشِ روزگار سے بے مایہ ہیں۔ قولہ "گر بپردازد بمن" بپردازد کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے یعنی "آنکہ چوں در ملکِ ہستی الخ" مراد اِس سے حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ ہیں جنکی منقبت میں مرزا نے یہ ترکیب بند لکھا ہے۔

قطعات

ہزار معنیِ سرجوش خاصِ نطقِ من ست | کز اہلِ ذوق دل۔ وگوی از عمل بردست
ز رفتگاں بیکے گر توارد م رو داد | مداں کہ خوبیِ آرایشِ غزل بردست
مراست ننگ و لے فخر اوست کاں بسخن | بسعیِ فکرِ رسا۔ جا بداں محل بردست
مبر گمانِ توارد۔ یقیں شناس کہ دزد | متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بردست

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار | ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند | حق را بسجودے۔ و نبی را بدرودے

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم | مخلصِ صادق الولاے تو من
گرترا شیوہ شاہدی بودے | کردمے جان و دل فداے تو من
ور ترا پیشہ شاعری بودے | سودمے چشم و سر بپاے تو من
ور ترا پایہ خسروی بودے | سُفتمے گوہر ثناے تو من
چوں ازینہا نہ۔ مرا چہ ضرور | کہ شوم ہرزہ مبتلاے تو من
راست گویم۔ بہانہ چند آرم | ناصحِ مشفقم براے تو من
بسکہ بر مال و جاہ مغروری | نیستم خوش ازیں اداے تو من

چکنی! کایں فسادِ سیم و زر ست　　وائے من! اگر بوَم بجاے تومن
بتو ہرگز ندادمے زر و سیم　　خواجہ! اگر بودمے خداے تومن

دیدی آں بدگہر۔ وہمہ و والایش بہ یزید　　کہ بخشم آید۔ اگر زشت و پلیدش گویند
زاں کہ او خود بسرِ ابنِ علی تیغ نراند　　خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند
گفتم البتہ کہ شبیر بداں می ارزد　　کہ شہیدش بنویسند و سعیدش گویند
گفت زاں رو کہ عزیزاں ہمہ مسلم بودند　　نتواں کرد گوارا کہ شہیدش گویند

کردۂ تجدے کہ در ویرانۂ کاشانہ ام　　چرخ در آرایشِ ہنگامۂ عالم نکرد
گریہ بجوت راندہ باشم نکتہ بازجوئے ہیچ　　زانکہ حرفے۔ زانچہ گفتم۔ خاطرم خرم نکرد
بیتے از استاد دیدم ذوقِ فکرے بخشید۔ لیک　　ہیچ در تسکیں نیفزود و زوحشت کم نکرد
"ہمچو تو نا قابلے در صلبِ آدم دیدہ بود"　　زاں سبب ابلیسِ ملعون سجدہ بر آدم نکرد"
حاش للہ! بودنت در صلبِ آدم تہمت ست　　پیشِ ہر کس گفتم ایں اندیشہ باور ہم نکرد

ایا زیاں زدہ غالب کہ از حدیقۂ بخت　　نمیرسد ز تو خار و خسے بہیچ سبیل
چو لازم ست کہ پروردگار تا دمِ مرگ　　بود بہ رزق ضروریۂ عباد کفیل
چراست اینکہ نداری زر از سیاہ و سفید　　چراست اینکہ نیابی بر از کثیر و قلیل

فتادہ در سرِ ایں رشتہ عقدۂ۔ ور نہ　　نہ مُردۂ تو۔ و نے رازق العباد بخیل
ز چند سال بمرگِ تو و تباہیِ رزق　　شدست حکم۔ خود از پیشگاہِ ربِّ جلیل
فرشتۂ کہ وکیل ست بر خزائنِ رزق　　نکرد ہیچ توقف بہ رزق در تعطیل
یعنی در تعطیلِ رزق توقف نکرد[١٢]
دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقروں باد　　روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل
یعنی ملک الموت[١٢]
لطیفۂ کنم از قولِ شاعرے تضمیں　　کہ در لطیفہ مرا در اکسے نبودہ عدیل
"اگر خداے بداند کہ زندۂ تو ہنوز　　ہزار مشت زند بر دہانِ عزرائیل"
ملک الموت[١٢]

بہ آدم زن۔ بشیطاں طوقِ لعنت　　سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم　　گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورۂ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں۔ مرزا کے قصائد و قطعات و مسمطات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے جسکا مولانا نظیری نیشاپوری کی نظم سے بخوبی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مراد کا جو عنفوانِ شباب میں گذر گیا تھا ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے جو اسکے کلیات میں موجود ہے اور چونکہ نظیری کو اُسکے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اسکی شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے اُسکے جلدو میں پائے ہیں اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اُسکا مرثیہ کمال صدقِ دل سے لکھا ہے۔

مرزا نے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا۔ جو عین نشو و نما کے زمانے میں فوت ہو گیا تھا۔ مرثیہ اسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے۔ چونکہ دونو ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیہ میں لکھے گئے ہیں اور دونو کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور دونو کا ہر ایک بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے اس لئے ہم یہ دونو نظمیں مقابل یکدگر لکھے دیتے ہیں تاکہ ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے دونو میں باآسانی موازنہ کر سکے۔ مگر افسوس ہے کہ کلیات نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہمکو دستیاب نہیں ہوا لہذا جیسا کچھ لکھا ہوا پایا نقل کر دیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جنکی نسبت ظن غالب یہ ہے کہ ان میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

غالب	نظیری
ایدل بچشم زخمِ حوادث فگار شو	لب خوش نگشتہ خندہ رہ چنگ میزند
اے چشم از تراوشِ دل اشکبار شو	در بزم مرگ خندہ بر آہنگ میزند
اے خوں بدیدہ دُرد گدازِ جگر فرست	ہرگز زمانہ جامۂ ماتم بروں نکرد
اے دم بسینہ دودِ چراغِ مزار شو	تا رفتہ شب بدامنِ شب چنگ میزند
اے لب بنوحہ نالۂ جانکاہ ساز دہ	وقتِ گذشتہ را بتاسف زپے سعرۂ
اے سر نہفتہ خاکِ سرِ رہگذار شو	کانجا نشاط گام بفر سنگ میزند
اے خاک اچرخ گرنتوان زد زجا درآے	ایں دہر روزکو رکش ایام خصم باد
اے چرخ باخاک گرنتواں شد غبار شو	دستِ طمع بگیسوی شبرنگ میزند

غالب	نظیری
اے نوبہار چوں تنِ بسمل بخوں تغلطٗ	دستِ اجل بتیغ سیاست بُریدہ باٗ
اے روزگار چوں شبِ بےماہ تار شو	از خاک مُہر بر دہنِ تنگ میزند
اے ماہتاب روی بہ سیلی کبود کن	آرائشِ جنازۂ ددستار میکنند
اے آفتاب داغِ دلِ روزگار شو	گوئی کہ گل برافسر داد رنگ میزند
اے فتنہ بادِ صبح وزید۔ ایں قدر مخسپ	ایں چرخِ شوخ دیدہ عجب بے بصارت ست
اے رستخیز وقت رسید آشکار شو	بر جامِ عشرتِ کہ؟ ببیں سنگ میزند
آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سر گذشت	فرزندِ شاہ اکبر والا نژاد مُرد
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت	شیون برآورید کہ سلطان مراد مُرد

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پرشوکت و شاندار واقع ہوئے ہیں اور کوئی شعر صنعتِ شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے مگر واقعہ کی عظمت جس قدر کہ بیان ہونی چاہیے تھی اُس سے بمراتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے بخلاف **نظیری** کے کہ اُسکا بیان اگرچہ دیکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے مگر متانت اور اعتدال کا سررشتہ اُسنے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب	نظیری
بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار	آفاق پُر دریغ و جہاں پُر ندامت ست
با بادشاہِ عہد جفا کرد روزگار	ایں روزِ مرگ نیست کہ روزِ قیامت ست

غالب	نظیری
شاہ سخن سرائے سخنور نواز را	خلقے پر اضطراب - چہ جای تمکن ست
در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار	دہرے پر انقلاب - چہ جای اقامت ست
شاخے کہ بود موسمِ آنش کہ بر دہد	ایں ماتم کسے ست کہ از گریہ تا بہ حشر
از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار	بر جیبِ صبح و دامنِ شبہا علامت ست
مرگ اینچنیں بہ رنج و تنِ نازک ندیدہ بود	خوں میکند بجلوہ دلِ خلق - گوئیا
کامِ اجل بہدیہ روا کرد روزگار	نخلِ جنازہ رستہ ازاں نخلِ قامت ست
شہزادہ خرد سال و بود روزگار پیر	ہر کس چنیں جمال در آرد بحشرگاہ
شوخی بشاہزادہ چسا کرد روزگار	رضواں گرش بہشت دہد در غرامت ست
فرزندِ پادشہ نشناسد معانقہ٭	دل از نویدِ صحت او بزمِ سور بود
آغوشِ گور بہر چہ وا کرد روزگار	اکنوں سرای ماتم و کوی ملامت ست
اے آں کساں کہ خاکِ رہِ شہریار را	یاراں! عجب شکاری از دست دادہ ایم
توجیہ آبروے شما کرد روزگار	بر سر زنید دست کہ وقتِ ندامت ست
ہر چند بے اجل نتواں ہیچ گاہ مُرد	شہباز زما پریدہ رہِ آسماں گرفت
آتش بجود زنید کہ فرخندہ شاہ مُرد	مرغے نرفتہ است کہ دیگر تواں گرفت

یہ دونوں بند سادگی اور مرثیت میں تقریباً برابر سرا بر ہیں۔ البتہ نظیری کے بند کا چوتھا شعر

٭ یہ اشارہ ہے اس دستور کی طرف کہ خاندانِ تیموریہ کے سلاطین اور شاہزادے کسی سے معانقہ نہیں کرتے تھے ۱۲

جس رتبے کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب	نظیری
اے قوم! اخویش را بہ شکیب امتحاں کنید	اے بزمِ تیرہ! آں رخِ چوں ارغواں کجاست
ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید	وے رزمِ درہم! آں شہِ گیتی ستاں کجاست
طفل ست شاہزادہ و در رہ خطر بسی ست	شوقِ سجود و حرمتِ تعظیم کمتر ست
منعش ز عزمِ رہروی آنجہاں کنید	آں نازِ صدر و سرکشیِ آستاں کجاست
از میوہ و گل انچہ دلش خواہد آں دہید	امروز غم بمسندِ شاہی نشستہ است
از حیلہ انچہ رای شما باشد آں کنید	پہلو نشینِ خسروِ ہندوستاں کجاست
ہر حرف دل نشیں کہ بگوئید و نشنود	آں حکم ہا کہ بود از و آبِ کار کو؟
آں گفتہ را بعربدہ خاطر نشاں کنید	واں کارہا کہ آمد از وی بجاں کجاست
ور خود ز رفتنش نتوانید باز داشت	دلہا پر از غم ست۔ عزیزاں چہ واقع ست
بیخود شوید و جامہ درید و فغاں کنید	یک دل شگفتہ نیست۔ خوشی در جہاں کجاست
گیرید دشنہ در کف و ہم بر جگر زنید	ہر جا بسوگِ مرگ گروہے نشستہ اند
تا سینہ را ز دیدہ فزدن خونچکاں کنید	زیں غم کہ عام گشت ندانم اماں کجاست
زنہار پیشِ شاہ مگوئید و بے خبر	برگ و شگوفہ ریخت۔ ثمر از کجا خورم
تابوت را بجانبِ مرقد رواں کنید	بشکست شاخ و برگ۔ مرا آشیاں کجاست

غالب	نظیری
اے اہلِ شہر مدفنِ ایں دودماں کجاست؟	کس را سرودہ در خورِ ایں تعزیت بنود
خاکم بفرق - خوابگہِ خسرواں کجاست؟	پیدا کنید کا وّل ایں داستاں کجاست
	خلقے خموش اند و نگویند حال چیست
	صبرِ سخن شنیدن و تاب بیاں کجاست
	آفاق در مصیبتِ او ممتحن شدہ
	ایں مرگ باعثِ الم مرد و زن شدہ

اِس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کر دئے ہیں نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو مگر مرزا کے بَین نہایت دل خراش ہیں متوفّٰی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں اُسکو جانے سے رُدکو وہ جو کچھ مانگے اُسکو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو وہ کرو اور اگر سیدھی طرح وہ کہنا نہ مانے تو اُسکو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلے تو روؤ اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چناں کرو اور چنیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کئے بغیر تابوت مرقد کی طرف لیجاؤ! یہ تمام پیرائے بیان کے نہایت مؤثر اور دل خراش ہیں اور گرہ کا شعر سارے بند کا نچوڑ ہے۔

بند چہارم

غالب	نظیری
زاں سبزہ خط کہ بر رخِ او نا دمیدہ ماند	غم خاست - در پیالہ می از ساغر افگنید

غالب	نظیری
گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند	شد بزم تیرہ - پردہ از اں رُخ بر افگنید
بُستانیاں بماتمِ شہزادہ بخود اند	شمعے کہ دہر روشن ازو بود - مُردہ است
زیں شوبود کہ پیرہنِ گُل دریدہ ماند	پروانہ را برید و بخاکستر افگنید
خوں گشت و در دل و جگرِ دوستاں فتاد	درخانہ اش ز حلقہ ماتم خرام نیست
آں بادہ ہائے ناب کز و نا کشیدہ ماند	ایں حلقہ را ز صحنِ سرا بر در افگنید
در مدحِ شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر	ریحانِ جلوہ یاسمنِ عشوہ ریختہ
در دا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند	چینید و ہم بر آں قدِ جاں پرور افگنید
در وادیِ عدم نتواں رفت با حشم	بالیں ز تاب کاکلِ آشفتگی کشید
ماند ایچہ بود و صاحبِ عالم جریدہ ماند	کوتہ کنید و عنبر بہ در کشور افگنید
زاں گلبنے کہ صرصرِ مرگش ز پا فگند	رفت آں سرے کہ تاج بدو سرفراز بود
خارے بیادگار بدلہا خلیدہ ماند	بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید
اخلاقِ شاہزادہ بود دلنشینِ خلق	پوشید چند جامۂ نیلی ز جورِ چرخ
بوئے ازاں شگفتہ گُلِ نو رسیدہ ماند	بر آفتاب جامۂ نیلوفر افگنید
آں سروِ سایہ دار کہ بالش نبود کو؟	خیزید تا بآں سرِ تابوت دم زنیم
واں نو گلِ شگفتہ کہ خارش نبود کو؟	عرضے کنیم و کارِ دو داعش ہم زنیم

اِس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت

ے گیا ہے جیسا کہ اصحابِ ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بندِ پنجم

غالب	نظیری
دشنے ست ای سپہر ترا در ستمگری	رفتی و کار ما ہمہ درہم گذاشتی
بارے برسم ز جورِ تو پیشِ کہ داوری	آشفتگی بہ مردمِ عالم گذاشتی
نیرنگ سازِ چرخ کہ بیدادخوی اوست	جانہای غم رسیدۂ و دلہای بیقرار
باگل کند سمومی و باشاخ صرصری	در پیچ و تابِ طرّۂ پُرخم گذاشتی
داغم ز روزگار کہ شہزادہ برنخورد	از تو غبار بر دلِ بیگانہ نہ بود
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری	بہر چہ بر دلِ پدر ایں غم گذاشتی
حیف ست مردنش کہ در آیامِ کودکی	روز و شبت برسمِ جنیبت ستادہ بود
بود اوستاد قاعدۂ بندہ پروری	در زینِ خویش اشہبِ ادہم گذاشتی
شہ در دہ و دو سالگیش کردہ کدخدا	شمعِ مزار و خشتِ لحد ساختی قبول
با فرِّ خسروانی و فرتابِ قیصری	رخسارِ تخت و طرّۂ پرچم [علم ۱۲] گذاشتی
ناگاہ روزنامۂ عمرش دریدہ شد	ہمت ترا بہ ملک نیاورد سر فرو
امضا پذیرنا شدہ توقیعِ شوہری	عالم بہر کہ خواست مسلّم گذاشتی
جز نوعروس صاحبِ عالم نیافتند	[یعنی بجہانگیر] حرمت نگاہ داشتی و جای خویش را
دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بدختری	بہر برادرانِ مقدم گذاشتی

زیبائی و جوانیِ فرخندہ شاہ حیف	خون ست بے تو گریۂ دل چون لبِ من ست
آں نونہالِ سرو قدِ کجکلاہ حیف	ہر دل کہ بے تو خوں نشود سنگ و آہن ست

اگرچہ یہ دونو بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں مگر متانت و جزالت کے لحاظ سے نظیری کا پلہ غالب معلوم ہوتا ہے ۔

بندِ ششم

غالب	نظیری
اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ	اے شاہِ مصر دور ز کنعاں چگونہ
ما بے تو در ہمیم تو بے ما چگونہ	اے یوسف از جدائیِ اخواں چگونہ
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہما	ہرگاہ جلوہ کردہ تقاضا چہ میکنی
اے خفتہ در نشیمنِ عنقا چگونہ	با حسنِ شوخ در تہِ زنداں چگونہ
زاں پس کہ با تو آب و ہوای جہاں نساخت	اسکندر از غمِ تو بظلمت نشستہ است
در روضۂ جناں بہ تماشا چگونہ	در زیرِ گل تو چشمۂ حیواں چگونہ
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی	اے پارۂ ز جان و جگر گوشۂ پدر
با حوریانِ آئنہ سیما چگونہ	گشتہ جدا ز دیدۂ و داماں چگونہ
ما بے تو داں بخلعتِ ماتم نشستہ ایم	ما بارے از فراقِ تو در خون دیدہ ایم
از خویشتن بگوے کہ تنہا چگونہ	تو در میانِ روضۂ رضواں چگونہ
بے مطرب و ندیم و غلامانِ خردسال	آوازِ نوحہ طبع و دل آشفتہ می کند

غالب	نظیری
بے باغ و قلعۂ و لبِ دریا چگونہ	اے بخت خوش بخواب پریشاں چگونہ
بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت	اینجات کار دفتر و دیواں حوالہ بود
اینجا عزیز بودہ آنجا چگونہ	آنجا بگو ز پرسشِ دیواں چگونہ
اے بعدِ مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے	قلزم سبک ثبات ترا آنجا ز شبنم ست
پروانۂ چراغِ مزارِ تو عالمے	در بحرِ کل تو قطرۂ باراں چگونہ
	بشنو کہ بانگ بہر تو بر حشری زنند
	تا بنگریم در صفِ دوراں چگونہ
	چوں کارِ رفتگانِ دگر نیست کارِ تو
	محشر شتاب میکند از انتظارِ تو

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ نظیری کا یہ بند اُسکے تمام ترکیب بند کی جان ہے اگرچہ مرزا کے ہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں مگر تربیت کا رنگ نظیری سے بڑھکر پایا جاتا ہے۔

بندِ ہفتم

غالب	نظیری
گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام اساس	فردا کلاہِ پادشہی بر سر تو باد

✤ خاندانِ تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص بادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شاہزادہ مرجاتا تھا تو اسکی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اسکی سرکار بدستور جاری رہتی تھی۔

غالب	نظیری
در نوحہ شاعری مکنید از من التماس	رسم العمل بروزِ جزا دفترِ تو باد
در پردہ سنجی از دمِ خویشم رسد گزند	فردا کہ روزِ حشر برانگیزی از زمیں
دور رہروی ز سایۂ خویشم بود ہراس	دوش و کنارِ حور و پری محشرِ تو باد
من نیستان و چرخِ سیہ کاسہ نیزباں	روزی کہ کارہا ہمہ موقوفِ حق شود
دُردی خورِ ہلاکم و تلخابہ نوشِ یاس	جبریل کارساز و خدا یاورِ تو باد
باقی نماندہ اشک چہ گریم بہ ہای ہای	وقتِ سوال گوش و لبِ منکر و نکیر
از کار رفتہ دست۔ چہ بر تن درم لباس	پُر از قبولِ نکتۂ جاں پرورِ تو باد
سر حلقۂ پلاس نشینانِ ماتم	آں حلّہ کہ آدم از و ذلّ قدر یافت
اندوہ ہمدمانِ شہ از خود کنم قیاس	گر رحمتِ دو کون بود در برِ تو باد
چوں بود بزمِ ماتمِ شہزادہ بے خروش	مجموعۂ عمل چو بہ محشر در آورے
من دم زدم ز تلخ نوائی بریں پلاس	کارِ تو راست ہمچو خطِ مسطرِ تو باد
از نوحہ عرضِ لطفِ سخن میتواں گرفت	مغز از بخورِ روی مزارت معطر ست
غالب سخن سرای شہنشہ سخن شناس	بوے بہشت ہم نفسِ مجمرِ تو باد
یارب جہاں ز فیضِ تو با برگ و ساز باد	آدم بہاے تو نشناسد دریں جہاں
عمرِ ابو ظفر شہِ غازی دراز باد	تسبیح قدس وردِ لِ کاں گوہرِ تو باد
	نخلِ ریاضِ ملک کہ بابِ عزیز تست

نظیری

سر بسر از دعاے ثنا گسترِ تو باد
کارش بہ حسنِ شاہدِ فرخندگی بود
ہر چند بر تو مرگ ۔ بروز زندگی بود

اِس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں افسوس ہے کہ اسوقت کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ہمکو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیات نظیری کے صحیح نسخہ کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اُسکے ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے اُنکی شرح کیجاتی جس سے ناظرین کو دو نو ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ اگر اِس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو بشرطِ زندگی اِس نقصان کی تلافی کی جائے گی۔

اب ہمکو مرزا کی کلیات نظم فارسی میں سے صرف مثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ہے۔ اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضاے مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی اُنکے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں جنمیں سب سے بڑی مثنوی ۹۲۰ بیت کی ہے اِس مثنوی میں ۔ جسکا نام مرزا نے ابرِ گہربار رکھا تھا۔ اُن کا ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا مگر چونکہ یہ اُنکی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے اِس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت

نہیں پہنچی ۔ صرف دیباچہ کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہات روزگار نے گھیر لیا مگر یہ مثنوی اُنکی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اِسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے اور کچھ نعت میں سے اِس مقام پر نقل کرتے ہیں ۔

از توحید

سپاسے کز و نامہ نامی شود ۔۔۔ سخن در گزارش گرامی شود
سپاسے کہ شوریدگانِ الست ۔۔۔ دہندش بہ بانگِ قلم دل ز دست
سپاسے بہ پوزش در آمیختہ ۔۔۔ ز دل جستہ و با دل آویختہ
سپاسے دوئی سوزِ کثرت ربا ۔۔۔ سپاسے دل افروزِ بینش فزاے
خدا را سزد کز دروں پروری ۔۔۔ بدیں شیوہ بخشد شناسا دری
خداے کہ زاں گونہ روزی دہد ۔۔۔ کہ ہم روزی و ہم دو روزی دہد

+ + + + + + + + +
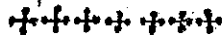
رضا جوے ہر دل کہ در دینش ہست ۔۔۔ ہوا خواہِ ہر رُخ کہ گردیش ہست
ز بخشد زانبوہِ خواہندگاں ۔۔۔ نیاید ستوہ از نیاہندگاں
خرد جنبشِ ہستی فروشندگاں ۔۔۔ دہد مزدِ بیہودہ کوشندگاں
رُباید دل آما ز دل دادگاں ۔۔۔ کشد ناز لیکن ز افتادگاں
ز نا دے کہ بر دل و زد در نہفت ۔۔۔ زباں را بہ پیدا در آرد بگفت

نگہ را کہ بیروں نباشد ز چشم — دہد بالِ پیدائی مہر و خشم
دل و دست با ہم گرہ دوختہ — دریں کیسہ کردار اندوختہ

یعنی در کیسہ کہ از ہم دوختنِ دل و دست بہم رسیدہ۔ کردارِ مردم اندوختہ است۔

روان و خرد با ہم آمیختہ — ازیں پردہ گفتار انگیختہ
نہ زیں سو گہر ہا شمردن تواں — نہ راہ اندریں پردہ بردن تواں

+ + + + + + + +

بہ نیروی نہ چرخ برہم زدن — نشاید ز دانستِ او دم زدن

یعنی بقوتے کہ ازاں نہ چرخ را برہم میتواں زد از معرفتِ الٰہی دم نمیتواں زد۔

گروہے بہ بندِ گہر یافتن — فرو بستہ دل در زمیں کافتن
یکے را دمِ تیشہ بر کاں بخورد — یکے رہ بہ نایاب گوہر نبرد
خرد کز جہانے ست بیشش خبر — نباشد ز عنوانِ خویشش خبر
نہ بیند جز ایں ہیچ بینندۂ — کہ ما را بود آفرینندۂ
نگارندۂ پیکرِ آب و گل — شمارندۂ گوہرِ جان و دل
بہ گردش در آرندۂ نہ سپہر — بہ گردوں بر آرندۂ ماہ و مہر
رواں را بدانست سرمایہ ساز — زباں را بگفتار پیرایہ ساز
بشاہی نشانندۂ خسرواں — ز رہزن رہانندۂ رہرواں
بدانش بر اندیشِ فرزانگاں — بہ مستی نگہدارِ دیوانگاں

جگر را ز خونابہ آشام دہ — نفس را بہ بیتابی آرام دہ
شناسندگاں را بخود رہنمای — ہراسندگاں را غم از دل زدای
نفسہا بسودای او نالہ خیز — جگرہا بہ صحرای او ریز ریز
رگِ ابر را اشکباری ازوست — دمِ برق را بیقراری ازوست
زبانہای خاموش گویای او — نہانہای اندیشہ پیدای او
خرد را کہ جوید شناسائیش — نگہ خیرہ در برقِ پیدائیش
دوئی بے کفن مردہ در رہش — خودی دادگر شحنۂ درگہش

+ + + + + + + +

زہے ہستیِ محض و عینِ وجود — کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود
ز شاخابہ کز قلزمے سر دہد — بہر تشنہ آشامِ دیگر دہد
بیک بادہ بخشد ز پیمانۂ — بہر ذرہ رقصے جداگانۂ
جہانے ز طوفاں بژرفاب در — ہنوزش ہماں چیں بگرداب در
گروہے ز مستی بغوغا دروں — ہنوزش ہماں مے بہ مینا دروں
اسیرش ز بندے کہ بر پای اوست — شناسد کہ بر تختِ چیں جای اوست
شہیدش بخونیش از طرب بہرہ مند — بجز چشمِ زخمش نباشد گزند

+ + + + + + + +

بہر لب کہ جوئی نوائے ازوست — بہر سر کہ بینی ہوائے ازوست

اگر دیوساریست بیہوش و ہنگ (دیوسار یعنی گمراہ ۱۲) — کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ

بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتہ — کہ بت را خداوند پنداشتہ

وگر خیرہ چشمے ست نیّر پرست — بہ دُردِ مے از جامِ اندیشہ مست

بہ بینش ازاں راہ جنبیدہ مہر (یعنی بگر خورشید ۱۲) — کزیں روزنش دوست بنمودہ چہر

زناری دُرونانِ اہرمنی — گروہے بود کز خرد دشمنی

زبس دادِ نا آشنائی دہند — بہ آتش نشانِ خدائی دہند

بہ تن ہا بہ آذر گرایش کناں — بہ دلہا خدا را نیایش کناں

گروہے سراسیمہ در دشت و کوی — خداوند جوی و خداوند گوے

ز رسمے کہ خود را براں بستہ اند — بیزداں پرستی میاں بستہ اند

ز مہرے کہ بخواست در دل بود — پرستند حق گرچہ باطل بود

نظرگاہِ جمعے پریشاں یکے ست — پرستندہ انبوہ - و یزداں یکیست

کدامی کشش کاں ازاں سوی نیست — بد و نیک را جز بوی روی نیست

جہاں چیست؟ آئینۂ آگہی — فضائے نظرگاہِ وجہ اللّٰہی

بہر سو کہ رو آوری سوی اوست؟ — خوداں رو کہ آوردہ روی اوست

از مناجات

بروزے کہ مردم شوند انجمن — شود تازہ پیوندِ جانہا بہ تن

رواں را بہ بینش نوازندگاں — بہ سرمایۂ خویش نازندگاں

گہرہائے شہوار پیش آورند — فروہیدہ (پسندیدہ ۱۲) کردار پیش آورند

ز نور یکہ ریزند و خرمن کنند — جہاں را بخود چشم روشن کنند

بہنگامہ با ایں جگر گوشگاں (یعنی عزیزاں ۱۲) — درآیند مشتے جگر توشگاں (یعنی گروہی از جگرخوارگاں ۱۲)

ز حسرت بدل بردہ دنداں فرو — ز خجلت سر اندر گریباں فرو

دراں حلقہ من باشم و سینۂ — ز غمہائے ایام گنجینۂ

در آب و در آتش بسر بردۂ — ز دشوارئ زیستن مردۂ

تن از سایۂ خود بہ بیم اندروں — دل از غم بہ پہلو دو نیم اندروں

ز ناسازی و ناتوانی بہم — دم اندر رگ آتش ز پیوندِ دم

ز بس تیرگیہائے روزِ سیاہ — نگہ خوردہ آسیبِ دوش از نگاہ

بہ بخشائے برناکسی ہائے من — تہیدست و درماندہ ام - وائے من

بدوشِ ترازو (میزانِ اعمال ۱۲) منہ بارِ من — نسنجیدہ بگذار کردارِ من

بکردار سنجی میفزائے رنج — گراں باریِ دردِ عمرم بسنج

کہ من با خود از ہرچہ سنجد خیال — ندارم بغیر از نشانِ جلال (یعنی قہر ۱۲)

اگر دیگراں را بود گفت و کرد — مرا مایۂ عمر رنج ست و درد

چہ پرسی چو آں رنج و درد از تو بود — غمے تازہ در ہر نورد از تو بود

فرو ہل کہ حسرت خمیرِ من ست — دمِ سردِ من زمہریرِ من ست

مبادا بگیتی چو من ہیچکس — جحیمی دل و زمہریری نفس

پرسش مرا ہم افسردہ گیر پرِ کاہ را صرصرے بُردہ گیر

پس انگہ بدوزخ فرستادہ داں در آتش خس از باد افتادہ داں

پرسش سے مراد بازپرسِ قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے بازپرس سے مستثنےٰ رکھ اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے بازپرس ہوچکی اور ایک پرِکاہ کو بادِ صرصر اُڑا لے گئی اور یہ فرض کرلے کہ میں دوزخ میں بھیجا جاچکا اور ہوا سے ایک تنکا دہکتی آگ میں گرچکا۔

وگر ہمچنیں ست فرجامِ کار کہ مے باید از کردہ راندن شمار

یعنی اگر انجامِ کار یہی ہے کہ اعمال کی بازپرس ہونی ضرور ہے تو۔

مرا نیز بارے گفتار دہ چو گویم براں گفتہ زنہار (پناہ) دہ

دریں خستگی پوزش از من مجوے بود بندۂ خستہ گستاخ گوے

یعنی اِس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے اُسپر مجھسے عذر مت چاہنا کیونکہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بیباک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود چو ناگفتہ دانی نگفتن چہ سود

زباں گرچہ من دارم آواز تست پرست ارچہ گفتارم۔ آواز تست

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم پرستارِ خورشید و آذر نیم

نکشتم کسے را بہ اہریمنی نبردم زکس مایہ در رہزنی

مگر مے کہ آتش بگورم ازوست ہنگامۂ پروازِ مورم ازوست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اُسی سے میری زندگی ہے

اِس مطلب کو اِس طرح ادا کرنا کہ "آتش بگورم ازوست" اور "پروازِ مورم ازوست" انتہائے بلاغت ہے نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور اُمنگ پیدا ہوجاتی ہے اُسکو پروازِ مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اُسکی موت کی علامت ہے اِسی طرح نشۂ شراب کا عارضی نشاط آخرکار موجبِ ہلاکت ہوتا ہے۔

من اندوہگین و مے اندوہ ربائے چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے

حسابِ مے و رامش (نغمہ) و رنگ و بوے ز جمشید و بہرام و پرویز جوے

کہ از بادہ تا چہرہ افروختند دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند

نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ بہ دریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

نہ بستاں سرائے نہ مےخانۂ نہ دستاں سرائے (مطرب) نہ جانانۂ

نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط نہ غوغائے رامشگراں (مطرباں) در بساط

بسا روزگاراں بہ دلدادگی بسا نوبہاراں بہ بےبادگی

بسا روزِ باران و شبہائے ماہ کہ بودہ است بے مے بچشمِ سیاہ

اُفق ہا پُر از ابرِ بہمن تہی سفالینہ جامِ من از مے تہی

بہاراں و من در غمِ برگ و ساز درِ خانہ از بےنوائی فراز (بند)

جہاں از گل و لالہ پر بوی و رنگ من و حجرۂ و دامنی زیرِ سنگ

دمِ عیش جز رقصِ بسمل نبود بہ اندازۂ خواہشِ دل نبود

اگر تافتم رشتہ - گوہر شکست وگر یافتم بادہ - ساغر شکست

چہ خواہی ز ذوقِ مے آلودِ من ببیں جسمِ خمیازہ فرسودِ من

بنا سازگاری ز ہمسایگاں بہ سرمایہ جوئی ز بے مایگاں

سر از منتِ ناکساں زیرِ خاک لب از خاکبوسِ خساں چاک چاک

بہ گیتی درم بینوا داشتی دلم را اسیرِ ہوا داشتی

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد بہر بار زر پیل بارم دہد

کہ چوں پیل زاں جا برانگیزمے زرش بر گدایاں فرو ریزمے

نہ نازک نگارے کہ نازش کشم بہر بوسہ زلفِ درازش کشم

بدیں عمرِ ناخوش کہ من داشتم ز جاں خار در پیرہن داشتم

چو دل زیں ہوسہا بجوش آیدے ز دل بانگِ خونم بگوش آیدے

ہنوزم ہماں دل بجوش اندرست ز دل بانگِ خونم بگوش اندرست

چو آں نامرادی بیاد آیدم بفردوس ہم دل نیاسایدم

دلے را کہ کمتر شکیبد بباغ در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ

صبوحی خورم گر شرابِ طہور کجا زہرہ صبح و جامِ بلور

دمِ شب رویہائے مستانہ کو بہنگامہ غوغائے مستانہ کو

دراں پاک میخانہ بے خروش چہ گنجائیِ شورشِ نای و نوش

سیہ مستیِ ابر و باراں کجا خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

اگر حور - در دل خیالش کہ چہ غمِ ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ

چہ منت نہد ناشناسا نگار چہ لذت دہد وصل بے انتظار

گریزد دمِ بوسہ - انیش کجا فریبد بہ سوگند - دینش کجا

برد حکم و نبود لبش تلخ گوے دہد کام و نبود دلش کامجوے

نظربازی و ذوقِ دیدار کو بہ فردوس روزن بدیوار کو

نہ چشم آرزومندِ دلالہ نہ دل تشنۂ ماہ پرکالہ

ازیں ہا کہ پیوستہ میخواست دل ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

چہ پرسش رگے را کجا دوز دل دو صد دجلہ خونم تراود ز دل

بہر جرم کز روے دفتر رسد ز من حسرتے در برابر رسد

بفرمائے کایں داوری چوں بود کہ از جرمِ من حسرت افزوں بود

ہر آئینہ ہیچوں منے را بہ بند تلافی فراخور بود نے گزند

بدیں مویہ در روزِ امید و بیم بگریم بدانساں کہ عرشِ عظیم

شود از تو سیلاب را چارہ جوی تو بخشی بداں گریہ ام آبروی

وگر خونِ حسرت ہدر کردۂ زیاداش قطعِ نظر کردۂ

گذشتم ز حسرت - امیدیم ہست سپیدابِ روئی سپیدیم ہست

کہ البتہ ایں رندِ ناپارسا کج اندیشہ گبرِ مسلماں نما

پرستارِ فرخندہ منشورِ تست ہوادارِ فرزانہ دستورِ تست

یعنی قرآن کے

از نعت پیغمبر

بہ بندِ امید استواری فرست   بہ غالب خطِ رستگاری فرست

محمد کز آئینۂ روے دوست   جز اینش ندانست دانا کہ اوست

زہے روشن آئینۂ ایزدی   کہ در وی نہ گنجیدہ زنگِ خودی

ز رازِ نہاں پردہ بر زدہ   ز ذاتِ خدا معجزے سر زدہ

تمنّاے دیرینۂ کردگار   بُوَد ایزد از خویش امیدوار

تن از نور پالودہ سر چشمۂ   دِلے ہیچ مہتاب در چشمۂ

بہر جام از و تشنۂ جرعہ خواہ   بہر گام از و معجزے ہر براہ

کلامش بدل - در فرود آمدن   ز دم جستہ پیشی بزود آمدن

خرامش بسنگ از قدم نقش بند   برنگے کہ نا دیدہ پایش گزند

بہ دستش کشادِ قلم نارسا   بکلکش سوادِ رقم نارسا

دل امید جاے زیاں دیدگاں   نظر قبلہ گاہِ جہاں دیدگاں

بر فتار صحرا گلستاں کنے   بگفتار کافر مسلماں کنے

بدنیا ز دیں روشنائی دہے   بعقبیٰ ز آتش رہائی دہے

بخوے خوش - اندوہ کاہِ ہمہ   با مرزش امید گاہِ ہمہ

ز بس محرمِ پردۂ راز بود   بنزدیکیِ حق سرافراز بود

ز رازے کہ با وے سروے سروش   صدائیش بودے ز اوّل بگوش

جنے قبلۂ آدمی زادگاں   نظرگاہِ پیشیں فرستادگاں

کسائی دہِ نسلِ آدم بخویش   روائی دہِ نقدِ عالم بخویش

بلندی دہِ کعبہ بالاے او   گرامی کنِ سجدہ سیماے او

یمن روشن از پرتورِ روے او   ختن بستۂ چینِ گیسوے او

زبت بندگی - مردم آزاد کن   جہانے بیک خانہ آباد کن

بمحرابِ مسجد رُخ آراے دیر   بہ اندیشِ خویش و دعا گوے غیر

تو گوئی - ز بس دل ز دشمن ربابت   کہ سنگِ درش سنگ آہن ربا ست

نثرِ فارسی مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرّا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جا سکتا ہے ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے. خصوصاً کلیاتِ نظم کا دیباچہ اور خاتمہ، مہر نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں، اور مکاتبات کا ایک معتد بہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوئٹیکل نظم و نسق پر مبنی ہے.

متاخرین میں ابو الفضل ، ظہوری ، طاہر وحید ، اور جلالاے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں. مرزا بیدل کی نثر اگرچہ انکی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے مگر وہ بھی اپنی شان اور آن بان میں بینظیر ہے. اگر یہ بات تسلیم کر لیجائے (اور ضرور

تسلیم کرنی چاہیئے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرزِ انشا پردازی سے استفادہ حاصل کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزا ڈھونڈھنا۔ تقریباً ساٹھ برس گذرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لایق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونو کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے؛ لیکن جب مرزا کی نثر کا اُن دونو کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا کی کوئی ادا اُن کی طرزِ ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضای مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں اُن کو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی لیکن چونکہ لوگوں کو اِس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی نہیں ہے اِس لئے ہم اِس بحث سے قطع نظر کر کے حسبِ وعدہ اُن اصحاب کی ضیافتِ طبع کیلیے جنکو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اُسکی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگا ؤ چلا جاتا ہے مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ انتقاط کرتے ہیں اور ہمکو امید ہے کہ یہ نمونہ اِس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی و وافی ہوگا کہ مرزا نے نثرِ فارسی میں بھی اُسی قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا جیسا کہ نظمِ فارسی میں اُنکو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا تا وقتیکہ اُسکو دلیل و برہان سے ثابت نہ کیا جائے ایک بے معنی بات ہے لیکن ہمکو اُن لوگوں سے جو وجدانِ صحیح اور

ذوقِ سلیم رکھتے ہیں امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرا ہیں۔

چونکہ مرزا کی طرزِ انشا پردازی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں اِس لئے جہاں تک ممکن ہوگا ہم اُنکی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کرینگے جو صاف اور سلیس ہوں اور باایں ہمہ جہاں ضرورت ہوگی کہیں بین السطور میں کہیں برکیٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائینگے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہلِ زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں مثلاً صد کو سَد، شصت کو شست، غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن، گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آذر اور تَذرو وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی اور نیز ہم اِس املا کو صحیح نہیں سمجھتے اِس لئے اِس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقے کے موافق لکھے گئے ہیں۔

نثرِ فارسی کا انتخاب

از مہرِ نیمروز

خطاب زمین بوس مہرِ نیمروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدحِ بادشاہ کے بعد ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کر کے اپنا دردِ دل بیان کیا ہے اور اِس

خطاب کا نام خطاب زمیں بوس رکھا ہے ۔ اُسکو کسی قدر حذف و اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں ۔

"قاآن شیوہ خاقانا! وخواقین خدایگانا! روی آوردنِ من از عدم بوجود بسودای گہرسنجی و گہرفروشی بود، کالاے بیش بہاے من درین چارسو روی روائی ندید، ومتاعِ گرانمایۂ مرا دریں بازار ارزشِ ارزانی نہ شد، ناچار ہرچہ با خویش آوردہ ام۔ چوں گویم کہ با خویش می برم بختے در سفینہ ہا، وپارۂ در سینہ ہا میگذارم و میگذرم ۔ پس ازمن آن گنجِ شایگاں را اگرہمہ باد ببرد گو ببر، واگر ہمہ خاک بخورد گو بخور۔ سینہ آرزوہاے جوان بیرا مدفن ست، لمعۂ نگاہِ کرم چراغِ گورِ غریباں باد۔

نیاگانِ نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب وپشنگ بودہ اند، و فرماندہانِ با فرو فرہنگ فروکردنِ چراغِ ہستی نوردیدۂ تور بہ بادِ آستین کینۂ کیخسرو پشنگیاں را روزِ سیاہ پیش آورد۔ خداوندانِ اورنگ ودیہیم را ازاں برگ وساز ہا جز تیغ گند ناگوں بکف نماند۔ بہ مرز و بومِ بیگانہ روی آوردند، و بہ دستِ مزدِ تیغ زدن ناں خوردند، ہم ازیں نیستاں ایوانِ کہسار نشیمن سلجوقیاں دگربارہ سر با فسر وافسر بگوہر آراستند۔ چرخِ گرندہ چنانکہ خوی اوست ایں نامدارانِ کاؤس کوس را نیز از پای افگند۔

در مشربِ ما خواہش فردوس نجوئی در مجمعِ ما طالعِ مسعود نیابی

مرزا اکثر بلکہ تقریباً ہمیشہ اُن لفظوں کے بعد جنکے آخر میں واو یا الف ہوتا ہے بغیر اضافت کے بھی قدما کی طرز پر یاے زائد لاتے ہیں مثلاً رو یا سو یا پا اور جا کی جگہ روے سوے پاے اور جاے لکھتے ہیں۔

در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی در آتشِ ہنگامۂ ما دود نیابی

از واپسیانِ ایں قافلہ نیاے من۔ کہ در قلمرو ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الراس وے بود۔ چوں سیل۔ کہ از بالا بہ پستی آید۔ از سمرقند بہند آمد۔ در دفترِ سپہبدِ شاہ نشان ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں توقیعِ نوکریِ شاہش نوشتند، و بہ پرگنۂ پہاسو براتِ روزیِ وے و سپاہش نوشتند۔ پدرم پیشۂ پدرِ خویش داشت، و ہم در کارزار جا بہ گذاشت۔ ہمانا گلبنِ ثناے ترا نو آئیں نوا بلبلے ہمی بایست کہ مرا زمزمہ سنج و دستانسراے آفریدند۔

رباعی

غالب بہ گہرزِ دودۂ زادِ شمم زاں رو بصفاے دمِ تیغ است دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلمم

خامہ یسر کہ بفریبِ پندارِ آزادہ روی بسخنِ لااُبالیانہ پرداختم، واندازۂ ارزشِ سخن وپایہ والایِ گوہرِ خویش نشناختم۔ سینۂ من نفسے داشت برواں آسائی نسیمے کہ از نسترن زار وزد، زبانِ زدہ من۔ کہ دَم نجز بہ نا بایست نزدم۔ دہانِ مرا قلمے بود بہ دجلہ باریِ ابرے کہ از قبلہ خیزد بہیدہ کوشِ من۔ کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم۔

باایں فروغِ گوہر و رخشانیِ نہاد زیں ساں سیاہ روز کرا کرد روزگار

با فروفرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگاں ہمنشیں، و با اوباش ہمرنگ، پای بیراہہ پوے، و زباں بہ بیہودہ گوے، در شکستِ خویش گردوں را دستیار، و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار، دل پُر از خار خار، و دیدہ نشتر زار، نہ دستگاہِ خودنمایانہ آرایشے، و نہ

سرو برگِ آزادانہ آسایشے. سرگذشتِ ہر کس ہماں فرمانہاے اِمضا پذیرفتہ سرنوشتِ اوست ؛ در آنچہ بر من رفت دوستاں را با من چہ جای سرزنش، و مرا با دشمناں چہ گنجائی پرخاش.

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج ۔۔۔۔ دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزیِ رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد؛ بفروغِ آں فرّۂ ایزدی کہ فریدوں را بہ فرِّ آبِ دادگری دل افروخت و مرا فرہنگِ سخن گستری آموخت ؛ بداں دَر فرودم آوردند کہ تو نیز چوں حلقۂ چشمے بداں دَر داری، و نتوانی کہ دیدہ برداری. +

تا ہمسایۂ ادیم سپہریاں در سایۂ من اند. و تا خاک نشین آں دَرم فرشتگاں در رشکِ پایۂ من اند. در دل و دیدۂ روشناں جاے من ست، و بر سرِ ماہ و ستارہ پاے من. درین گوشہ گزینی و خوشہ چینی نخست آیۂ رحمتے کہ بر من از بالا فرود آمد، رو دادنِ خجستگیِ زمیں بوسِ کیہاں خدیوِ خداداں بود. دولت روے آورد، بخت از خواب جست، حورِ چشم روشنی گفت، رضواں رضا جوے آمد، چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ بحلی طلبید.

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بہ کفر ۔۔۔۔ نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

کالبدِ خاکیِ مرا چوں پیکرِ گردباد جانے درمیاں نیست ؛ ہمیں یک دو دَمہ سرگشتگی تماشا دارد. اگر عندلیبِ گلشنِ تصویرم کہ بوے گل زمزمہ از وے نتواند دمید، یا سبزۂ جوہرِ شمشیرم کہ روزیدن یا دارد

* ازیں دَر سے میاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے جو بہادر شاہ کے پیر تھے اور مرزا انکے مکان میں رہتے تھے ۱۲

مستانہ نیارد چمید. گسستگیِ پیوندِ نشاط کمن شد، و خون از دلِ ہجراں در چکیدن ست ؛ تا پیوند چہ قدر استوار بود؟ و چہ مایہ بہ زور گسستہ اند.

شبے با دلِ دیوانہ کہ لختے از من ہوشمند تر ست گفتم کہ اگر گفتار نیرو دہی بشاہ وارم کارگاہ بارگاہ عرضہ دارم کہ آئینہ رازم۔ مرا می تواں زدود، و بندۂ سخن طرازم۔ مرا می تواں پرورد. گفت اے ناداں ایں سخن از جاے دگر بود و ہنگام آں گذشت ؛ اکنوں اگر ہمی توانی گفت بگوے ! کہ خستہ ام۔ مرہم می تواں نہاد، و مردہ ام۔ جاں می تواں بخشید.

رباعی

شاہا ہر چند دایہ جوے آمدہ ام ۔۔۔۔ دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام
آبم کہ محیط را بجوے آمدہ ام ۔۔۔۔ رنگم کہ بہار را بہ روے آمدہ ام

اگر چنانکہ بہ دورانِ تو ام۔ بروزگارِ فرزانہ جمشید بودمے۔ جمشید روزگار را آفریں گفتے ؛ و اگر بداں انساں کہ ثنا خوانِ شہریارم۔ فرّخ فریدوں را ستودمے۔ فریدوں چرخ و ستارہ را گروِ گشتے. دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت، و زند آورد، اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتمے۔ آذر از بیمِ من زبانہ نزدے ؛ و از دلفریبیِ بیانِ من کس بشنیدنِ زند نپرداختے. من بدیں فرّخیِ بخت کہ چوں تو خداوند کار فرماے دارم۔ ہر قدر بر خویشتن بنازم جا دارد ؛ سرت گردم ! تو نیز بدیں گرمیِ ہنگامہ بناز۔ کہ ہمچو غالب بندۂ آتشیں نواے داری. اگر باندازۂ ہنر داد التفات می دہی۔ جاے مردمکِ دیدہ بمن باز گزار، و در دل بروی من کشاے.

گویند در عہدِ جہانبانیِ حضرت صاحبقرانِ ثانی بفرمانِ آں خسروِ دریا دل۔ کلیم را صدرہ

بسیم و زر و لعل و گہر سنجیدہ اند، من آں خواہم کہ دیدہ وراں را دستوری دہی تا از کشش و کوشش زر بخند، و یکبار گفتارِ مرا با کلامِ کلیم بسنجند۔ +

پریشاں نوائی من در ستائشِ گفتارِ خویش اگر خود گزاف نباشد، گفتار راست بگستاخی گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہمانم؟ کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردمے، و ہیچگاہ بر خود گمانِ کمالے نبردمے۔ سرمستی ذوقِ برگزیدنِ ایں والا نظر کہ برگزیدہ تست مرا از من برد، و خامہ بے پروا پوے را بدیں روش و آہنگ بخرامش و رامش آورد۔ + + + + + + + + + +

ہمانا بلند نامی سلطانِ دہر در آفاق چشم داشت، کہ چوں منے را کہ بجادو بیانی شہرۂ آفاقم بکردار گزاری گماشت۔ من خود ازاں رو کہ دل و زبانِ ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبانِ شاہ است۔ دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمودہ۔ فرمانِ شاہ است۔

پادشاہاں را ثنا گفتن نہ کارِ ہر کس ست ۔۔۔ دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن انداز و بمن

نامہ نگارِ کردار گزار را بہ تنومندیِ توفیقِ سرانجامِ خدمت۔ سعادتِ جاودانی، و خاقاں را بہ سایہ سوادِ ایں نگارش کہ ظلماتِ آبحیوان ست حیاتِ ابد ارزانی باد۔

فخریہ فقرے مرزا نے مہر نیمروز میں جہاں سببِ تالیفِ کتاب لکھا ہے اُسکے آخر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کسر نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرزِ بیان کی داد لوگوں سے چاہوں تو یہ کوئی بیجا بات نہو گی بلکہ عین تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائیگی اسکے بعد کہتے ہیں۔
"کالا شناسی را نہ آں آئین ست کہ نکوئی کالاے خویش از نظر اندازند، و پرکارِ کشائی را

* خاندانِ تیموریہ کی تاریخ نویسی کیلئے مرزا کو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے تجویز کیا تھا یہاں اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ۱۲

نہ آں دستور ست کہ بہ ہر پیکرے کہ خود کشند عشق نہ بازند۔ مگر مانی آں نقش را کہ خود میزد از اعجاز نمی شمرد؟ و آزر آں بت را کہ خود می تراشید نماز نمی برد؟ یزداں را بندۂ سپاس گزار باشم اگر قلم را بجز جنبشِ آفریں نگویم، و از سخن بہر اندیشہ سپاس نہ پذیرم۔ رفتارِ کبک و تذرو دل از دست برد، و خرامِ ایں رعنا لعبتِ رقاص سرمست نکند؟ حاشا کہ خرامشِ کلک بر ورق ایں مایہ ذوق انگیز تواند بود؛ تیر ست کہ بسنبلہ در حالتِ سرمستیِ تقسیم خودنمایانہ بناز می خرامد۔ ایں پارسی آمیختہ بہ تازی۔ کہ از زمانِ چیرہ دستیِ عرب بر عجم در گیتی پدید آمد۔ خسروی گنجینہ در بستہ بود کہ خامۂ من قفلِ درش را کلید آمد۔ بہ روبرو کجاست تا بنگرد کہ دریں رہروی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجاست تا فرا رسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام۔

خسروی بادہ دریں دور اگر میخواہی ۔۔۔ پیشِ ما آے کہ تہ جرعۂ از جامی ہست

خود ستائی فرو ہلم، و بند پندار گسلم۔ آوخ ازاں روزگار کہ از خوی ہنا سازی و از کار بازی سپری شد، و داد ازاں بیداد کہ در وزیدنِ افزونیِ خشم و کام بر روان و ہوش رفت۔ از کار فرمائے ایں نگارش سپاس پذیرم کہ بپرداختنِ ایں نمط کہ خود را چوں سایہ با زمیں ہموار ساختہ ام، تا پرداختہ ام۔ و بانگیختنِ ایں نقش کہ چشم و دل نگاہ و نفس باہم آمیختہ ام، تا انگیختہ ام۔ دست از کارہای دگر کوتاہ ست، و دل از اندیشہ ہاے دگر بر کنار۔ نامہ نگار کہ از کردار گزاری گفتن در رو دل روے آوردہ بود۔ باز بہ پاے سخن می آید، و جادہ کہ نشاں دادہ اند می پیماید۔

* تقسیم اور احتراق منجمین کی اصطلاح میں دو متقابل لفظ ہیں۔ جب کسی ستارے کا فاصلہ مرکز آفتاب سے ۶ درجہ ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ستارہ احتراق میں ہے اور جب یہ فاصلہ ۱۶ دقیقہ یعنی بہ نسبت احتراق کے ۴۴۴ دقیقہ کم ہو تو کہتے ہیں کہ ستارہ تقسیم میں ہے الغرض ستارے کا تقسیم میں ہونا اسکی عمدہ ترین حالت ہے ۱۲

نگرندگاں ہمہ تن چشم باشند، و شنوندگاں سراپا گوش

طرزِ واقعہ نگاری مرزا نے مہرِ نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں یہاں دو ایک مثالیں اسکی بھی لکھی جاتی ہیں۔

خانِ خطا با خویشتن سنجید کہ با قہرمانِ قومِ مغل مہرورزد مہرانگیز نامہ رواں داشت، و گزیدہ رہ شے را بہ نامہ بری و میانجی گری گماشت۔ فرستادہ آمد، و جہاں پہلوان قبل خاں را زمیں بوسید، و نامہ سپرد، و پیام گزارد۔ صرفہ در آشتی بودنہ در فرو گذاشت۔ قاچولی بہادر را بجاے خود نشاند، و بہمنانیِ نامہ آور توسنِ تیزگام سوے خطا راند۔ فرمانده آں کشور سرانِ لشکر را بہ پذیرہ فرستاد، و مہمان را بخوشتریں نشیمن فرود آورد۔ دو پادشاہِ سپہر بارگاہ بریک خواں نشستند، و ناں خوردند، و راوق آشامیدند، مگر خرد پیشہ قبل خاں را در اندیشہ گزشتہ باشد کہ مبادا خطائیاں زہر بہ بادہ آمیزند، و بدیں رنگ خونِ مہماں ریزند؛ در ہر بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تاختن بروں آمدے و بہ ستیم شگوفہ کردے، و خوردہ و آشامیدہ از دہن فرو ریختے۔ چوں بہ بزم اندر آمدے دگر بادہ ساغر گرفتے، و خوردنی از سر گرفتے۔ خطائیاں بہ شگفت فرو ماندہ کہ یارب ایں چہ نیرومند و زور آور کسے ست کہ از ما بیشتر می خورد و خورش را بروے گرانی نیست، و مَے از ما افزوں تر می کشد و ہشیار تر از ماست۔ میکشاں دانند کہ چوں بادہ بہ زور دمادم خورند، ہرچند ہر بار شگوفہ اندازند، نہ آنست کہ مستی روے ندہد، و تابِ مَے و زبونیِ تنِ مَنش را بہم برزند۔ شبے بادہ بر خرد و زور آورد۔ قبل خاں ریشِ دارائے خطا کہ التاں خاں نام داشت۔

گرفت و بسوے خود کشید، و ناسزا گفت۔ میزباں خشم فرو خورد، و نزدیکانِ خود را کہ ہم از گستاخی باز داشت۔ بامداداں میہماں آہنگِ بازگشت بسرود۔ میزباں کہ از بدمستیِ دوشینہ سرگراں بود۔ چنانکہ میزباناں دامنِ میہماں زود از دست ندہند، و آرزوے دیر ماندن کنند۔ نکرد۔ کلاہ ہاے گوہر آگیں، و کمرہاے زریں، و درخشندہ نگیں ہاے بیش بہا، و پرستہ ہاے پرنیاں و دیبا پیش کشید، و بدرود کرد۔ ہنوز سپہ بر نرفتہ بود کہ بدآموزاں التاں خاں را از جاے بردند۔ و براں آوردند کہ قبل خاں را از راہ برگردانند، و بدرگاہ آورند، و کالبدش را بہ تشنہ و خنجر از ہم فرو کشایند۔ سخن بزمی گزارندۂ ستارہ از سپہر فرود آرندہ۔ بدیں کار کمر بست، و قبل خاں را براہ دریافت؛ و بباز آمدن فریفت۔ رمیدہ رام نہ شد، و از راہ برنگشت۔ فرستادہ تنہا باز آمد و بفرستندہ خبر داد۔ بگروہے از گرداں و یلاں فرماں رفت کہ جلو گسیختہ بشتابند، و ہر کجا یابند اگر بشادی و رادی نیاید بخواری و زاری آورند۔ مگر قبل خاں را براہ دوستی بود از دودۂ ستودۂ سلجوق۔ بکاشانۂ وے فرود آمد۔ دانم از بہر آسایش آہنگِ دو سہ روزہ آنجا بود داشتہ باشد۔ خطائیانِ شوریدہ مغز دراں دہ رسیدند، و خان را دراں خانہ دیدند۔ سخن بداں لابہ ساز کردند کہ خاقان فریب خورد، و خواست کہ سوے خطا برگردد۔ خانہ خدا کہ خرد از مہر قروں داشت۔ نہفتہ بادپائے پیش کشید و گفت کار دگرگوں ست؛ رفتن بخطا خود بہیچ روے روا نیست؛ تنہا بدیں گروہ میاویز، و بریں بادِ توسن نام برنشیں، و سوے ایل و اولوس بگریز۔ ناگزیر بہ نہاں کرد، و جانِ گرامی بہ تیزگامی

۳ یعنی کسیکہ بلطف زبانی و حیلہ سازی ستارہ را از سپہر فرود آرد۔

برد. خطائیاں رمے بازگشتن عنان تافتند، پئے امیدگاہ تگاپوے خویش بر برداشتند. خان سپہرآستان بتخت آرامش جا رسید، و خطائیاں سپس. باقاجولی بہادر و فرزانگان لشکر سگالش رفت کہ چہ می باید کرد. انجام کار بہ بہدید یکدگر بدخواہاں را کشتند، تا از تمنگہ گشتند چہ در روند.

شہریار قبل خاں از یک بانوے نکو دیدار، کہ از قوم قنقرات بود، شش پسر داشت. نخستیں و دومیں بہ اوکین برقاق و قولیہ خاں نام آور، و دیگراں بہ نامہاے دگر روشناس. روزے نخستیں ایں دو برادرِ نام آور، ناگاہ شکارگاہ از ہمرہاں جدا ہمی ماند، و راہ گم کردہ ہرزہ ہمی گردد. تاتار خانیاں، کہ غارتگری پیشہ داشتند، و پیرامن قلمرو مغول ہموارہ راہ می زدند، با ایں شہسوارِ پریشاں رفتار برمی خورند، و چوں مے دانند کہ کیست باسیری می برند، و با التاں خانِ خطائی می سپرند. خاں کہ وے بر پرداشت فرماں می دہد کہ شاہزادہ را بر خرِ چوبیں بہ میخ ہاے آہنیں بر دوزند، و تنِ نازنینش از رواں پردازند. خدیوِ مغولستاں را کہ از پیش رنجور بود بہ جگرتابیِ ایں داغ درد افزود. چوں دانست کہ ناکام ہمی باید مرد دومیں پسرِ خویش قولیہ خاں را بہ جانشینی گزید، و بہ کشیدنِ انتقامِ خونِ برادر وصیت کردہ چشم از تماشاے جہاں پوشید. قولیہ خاں تاتگینِ سلیماں بکف آورد و بفراہم آمدن سپاہ فرماں نبشت. فرماں براں و کینہ خواہاں از ہر سوے بہ تختگاہ روے آوردند.

پئے برداشتن تعاقب نمودن - امیدگاہ و تگاپوے خویش یعنی کسیکہ در طلب او تگاپوے نمودند ۱۲

شہنشاہِ دانادل دیدہ ور — کہ چوں لعل بودے سراپا جگر
براں شد کہ لشکر فراز آورد — بسوے خطا ترکتاز آورد
ز مردان و گردان و گندآوراں — بہ جنبش در آورد کوہے گراں
ازاں رو کہ بایست خونریز شد — منش ہا بخوں ریختن تیز شد
دلیراں ز دشمن کشی دم زدند — ز دم باد بر روے پرچم زدند
ز تاتار تا گرد انگیختند — بہ بنگاہِ خانِ خطا ریختند

التاں خاں دل و دست و عناں و سناں بکار در آورد، و خود را با سپاہے از ستارہ بشمار افزوں تر بہ پیکار در آورد. کوشید و کوشیدن سود نداشت؛ رقمِ فیروزی بنامِ قولیہ خاں کشیدہ بودند. شکیبائیِ گسیل شکستے بر خطائیاں آفتاد، علم ہا واژگوں شد، و اندیشہ بگریز رہنموں. جہانبان التاں خاں بہ گریختن جاں برد، و تن ہاے خستہ و دلہاے شکستہ از میاں برد. بشہر اندر آمد، و در بر روے سپاہ کینہ خواہ بست. قولیہ خاں و لشکریانش نہ آنمایہ برگ و ساز بہ یغار بودند کہ در اندیشہ گنجد. سپاس گزارِ چرخ و اختر گشتند، و گرانبار و سبک عناں برگشتند. پادشاہ بچشم روشنی پیروزی سپاہ و رعیت را صلاے عشرت اندوزی داد. ہنگامہ جشن گرمی پذیرفت، و بزمِ سور آرایش یافت. خواہی ہنگامہ گرم کن و خواہی بزم آراے؛ مرگ را نہ آں خدنگ بہ کماں ست کہ خطا کند؛ قولیہ خاں را نیز بہنگامِ خویش ناوک بر نشاں خورد. چوں پسر نداشت برتان بہادر جاے پدر از برادر گرفت. بسکہ دلیر و مردانہ بود نامش از خانی بہ بہادری در جہاں رفت. بروزگارِ جہانداری ایں شہریارِ دلاور برقِ اجل

خرمنِ ہستیِ قاجولی بباد در سوخت، و پسرش ایرو مچی برلاس بسپہ لشکری رخ افروخت۔

یہ پارہ از احوال امیر تیمور

روزے میانۂ امیر قزغن† و امیر طراغاے* دربارۂ اویوس و تسوتون سخن میرفت، و فرزانۂ فیروزی فرِ امیر تیمور دلاور با پدر ہمزباں بود۔ پدر را از گفتار باز داشتہ خود بشگرفی سخن سرائے شد، و بداں ہنجار زمزمۂ چند بر تارِ گفتار زد کہ امیر قزغن دراں شیوا بیانی و گہر افشانی بوے مہر دل بست، و بآفریں زباں برکشاد بسخن گوے فرہیدہ او را پسر خواند، و ہمدراں بزم او لجاتو ترکاں خواہرِ امیر حسین نبیرۂ خویشتن را بآئینِ دیں و قانونِ شرع بوے سپرد، تا خویشی بر خویشاوندی افزاید، و آمیزشے چون شیر و شکر درمیاں آید۔ امیر جہانجوے پس ازاں پیوستہ با امیر قزغن در بزم ہمنشیں و ہمدم و در رزم پیش تاز و ہیش آہنگ بودے۔ از نبرد آزمایانِ برلاس و دلاورانِ خیتا ہر کہ آں دست برد نگریستے شگفتی فرو ماندے، و "دست مریزاد"، گویاں بداں دست و بازو آفریں خواندے۔ پس از امیر قزغن کہ داماد تعلقِ تیمور ناگاہ در شکارگاہش کشت۔ جہاں پہلوانِ تہمتن تواں بتنہا دامنِ ہمتِ والا گرفت، و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت۔

ہر چند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ　　　در عہدۂ رحمتِ خدائیم ہمہ
در جلوہ و بد چنانکہ مائیم ہمہ　　　شایستۂ نفت و بوریائیم ہمہ

برادر زنِ صاحبقراں ہمانا امیر حسین نیز بوے پیوست، و عہد بست کہ ہر چہ از ملک و مال

† امیر قزغن نام یکے از امرائے چغتائیہ۱۲ * امیر طراغاے نام پدرِ امیر تیمور۱۲ 8 یہ رباعی گویا آیندہ آنیوالے مضمون کی تمہید ہے۱۲

و برگ و ساز گرد آید بریکدگر بخشش کنیم، و باہم جز مہر و با قوم جز آزرم، و با خلق جز داد نہ ورزیم، بخونِ گرمیِ ایں دو گردِ دلاور و دو تیسیر مرد ہم گہر ہنگامہ گرمی پذیرفت، و گزیں دستگاہے و سترگ سپاہے فراہم آمد۔ صاحبقراں نہ از سادگی بلکہ از آزادگی دل با زباں یکے داشت۔ امیر حسین ہموارہ در کمینِ آں بودے کہ انباز را از میاں بردارد، و بیکتائی علم دارائی افرازد۔ از دیدہ وری بسگالشہاے آں نژند اندیشۂ ناراستی پیشہ سپے بردے، و از فرزانگی و مردانگی بہیچگاہ بروئے نیاوردے۔

ستم بجانِ کج اندیش میتواں کردن　　　خجل ز راستیِ خویش میتواں کردن

روزگارے دراز تر از رشتۂ طولِ امل۔ با ملوکِ طوائف و رکبدار و مرزیو و ستیز و آویز گذشت ہمگناں چشم براہ و گوش بر آواز داشتند تا ایل اسفندیار نیرو را از کدام سو چشم زخم رسد، و بویژہ امیر حسین کہ جز بریو و غریو رنگ و نیرنگ کارے نکردے، و در انبازی و دمسازی فتنہ پردازی و شعبدہ بازی شیوہ داشت۔ نیرنگ سازیِ اقبالِ عدو مالِ صاحبقرانِ کشورستاں را نازم کہ ہم آں گروہِ بے شکوہ را سو بسو پاے بسنگ خوردے، و ہم ایں گردِ بے دستبرد را جابجا دست از کار رفتے۔ صد رہ اتفاق افتادہ است کہ ایں نفاق پیشگانِ خرد دشمن خوں گرفتہ را از نژادِ خیتا خاں دست گرفتہ بر تکیہ گاہِ خانی و مرزبانی نشاندہ اند، و زود تر تیغِ شمشیر بر سرش راندہ اند۔ تمناے پیلتناں را مسند و نطع از پئے ہم مہیا بود، و سر سروراں را ناز بالش و خشتِ گور از پسِ یکدگر آمادہ۔

سیرِ ستارہ و روشِ چرخِ نیلگوں　　　اینہا کند ہر آئنہ در مذہبِ حکیم

اما من آں نیم کہ پسندم طریقِ وہم | زاختر چہ شکوہ چوں نبود جز خدا قسیم

نبود بجز ظہورِ صفات و شیونِ حق | صلح و نبرد و فتح و شکست و امید و بیم

توقیعِ معنویست گر انصاف و رستم | تشریفِ خسرویست گر اطلس و گر گلیم

از حق بود افاضۂ ہستی بہر صفت | جز وایہ نبود آنچہ بہ سائل دہد کریم

ہمچنیں بارہا امیر حسین را از درماندگی و زبونی کار سخت افتادہ است، و سلطانِ سام ہم آوردِ افراسیاب ہمتا- بر لابہ گریِ وے بخشودہ بیاری و یاوری دل نہادہ است. کیں ہاے نہانیِ امیر حسین آشکارا بود. ہمہ می دانستند، و خدیو ہمہ داں از ہمہ فزوں تر می دانست. و دامنِ ضمیرِ حق پذیر آزرم† ناگزیر- می گذشتہ باشد کہ مگر ایں سست مہر خوہاے زشت و کردار ہاے نکوہیدہ بگذارد، و جہاندار را دگر بار آشتی و جہانیاں را سپس ہیچ رازدستی نیازارد. آں ناجوانمرد را فرۂ ایزدی کجا کہ بخشیم و کام نگرود، در راہ و دانش و داد رود. در آزردنِ دل آزرم نداشت، و در بردنِ زر شکیب، و در کشتنِ خلق پروا.

تو پارسا طلبی عاشق و من آں ندم | کہ مے بحلقۂ اوباشش آشکار کشد

پایانِ کار لشکریانش از ناخوشی ستوہ آمدہ آں جوان میرِ خداگیر* را با ہر چہار پسرش گرفتہ آوردند و بخداوندگار سپردند. دارائے نبرد آزمائے را آہنگِ عاجز کشی نبود و خوں گرمیِ پاداش (یعنی جوشِ انتقام) نداشت. می خواست بر نابخشودنی بخشودن و گناہانِ نابخشیدنی بخشیدن. از نہادِ اہلِ بزم خروش برخاست. خاصہ شاہ محمد مرزبانِ بدخشاں، و شیخ محمد

† آزرم ناگزیر کسیکہ او را از آزرم در رقت چارہ نباشد۔ * خداگیر کسیکہ بغضبِ خدا گرفتار شدہ باشد۔

بیان سلدوز، و امیر کیخسرو - کہ ریش ہاے نو و ناسور ہاے کہن داشتند - زخمۂ تیز تر زدند و نواہاے خونچکاں خونابہ فشاں فغاں بر آوردند کہ ما قصاصِ خونہاے ریختہ می خواہیم نہ انتقامِ فتنہ ہاے انگیختہ کہ والیِ ولایت آں را بحل تواند کرد. ناگزیر بدیں گفتار فرجام گردار بشرع حوالت رفت. کار آگاہاں و دانش پناہاں خوں ریختن فرمودند، و سادات و علما بہ کشتن فتوے دادند.

پنداری چوں خوں گرفتہ اینہا شنیدہ باشد در دل اندیشیدہ باشد کہ خود را بگریختن از ہنگامہ بدر برد. و سپس در زاویۂ گمنامی کہ ہمسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد. از انجا کہ سلاح و سلب نداشت سراسیمہ از جا رفت، و از خرگاہ بدر آمدہ بجنگِ سیلی و مشت راہِ گریز پیش گرفت. خوں خواہاں بجوں گرمی در روے آویختند، و خونش را کہ بدویدن گرم شدہ بود گرما گرم بر زمیں ریختند.

تو ای ندیم کہ مانی بتازہ روئیِ خویش | بسبزہ کہ سر از طرفِ جوئبار کشد

فریبِ مہر ز گردوں مخور کہ ایں بے مہر | دہد فشار کسے را کہ در کنار کشد

ہوائے تاجِ شہی ہر کرا بود در سر | سرے بمدفنِ شاہانِ تاجدار کشد

شیر خاں را دل دگر بود و زبانِ دگر، بہ لابہ گری و فسوں گستری پیامِ آشتی درمیاں داشت. تا چناں شد کہ ہیچ کس را ستیزہ در اندیشہ نگذشتے. اناں گل و لائے کہ در راہ پیمودہ بودند و روز و شب از رہروی - سنے نے از شناوری - نیاسودہ بودند، پیادہ آزردہ پاے بود،

وسوار فرسودہ اندام، و ستور شپت ریش۔ فریب دوستی از دشمن خوردگاں (یعنی ہمایوں و لشکریانش کہ فریب از شیر شاہ خوردہ بودند) دست از غارت و تاراجِ غنیم کشیدند، و دمِ آسایش غنیمت شمردند۔ پا بپا بہ جادۂ زہِ دامن آشنا شد (یعنی پا بدامن کشیدہ بخواب رفتند) و پیکرہا چوں صورتِ دیبا بہ بستر پیوند پذیرفت۔ سر از بالش بر نمی خیزد تا کلاہ و مغفر راچہ کنند؛ و پیراہنِ حریر برتن گران ست تا چلقد و جوشن کجا برند۔ ہوا نمناک بود، و ابر ترشحہ فشاں؛ تیغ در نیام زنگ بست، و خدنگ بر بارگی گراں گشت۔ سپیدہ دمے کہ تیرگی تار میغ جہاں را فسردہ و گرفتہ بود۔ ہنگامہ سپاہ سازانِ ہنگام جوے یکسرہ بر غنودگاں ریختند۔ شگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفہ ہزاہز در لشکر افتاد۔ کلاہ از کمر، و پاپوش از افشار نشناختند؛ از رختِ خواب جستہ، و بر اسپانِ بے زیں نشستہ، پراگندہ ہر طرف تاختند۔ گروہے "ہر چہ باداباد" گویاں سوارہ خود را بدریا زدند، و ہنرورے چند ساحل جویاں بہ شنا دست و پا زدند۔ تا کداماں بزخمِ دمِ تیغ و کداماں بزخمِ موجِ رود مردہ باشند، و کداماں از طوفانِ ایں دو آب (یعنی آبِ تیغ و آبِ رود) جاں بسلامت بردہ باشند۔ شہنشاہِ بحر و بر (یعنی ہمایوں) نہنگِ دشت نورد دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فرازِ ساحل در آب افگند۔ پاے از رکاب و عناں از دست و اسپ از خمِ راں بدر رفت۔ و شاہسوارے۔ کہ شاہاں ہنگام سواری بوسہ بر رکابش می زدند۔ غوطہ در آب خورد۔ نظام نام آزادۂ از آب کشانِ لشکر۔ کہ پنہاں از خویش اقبال را چشم براہ و گوش بر صدا داشت (یعنی بے آنکہ خبر داشتہ باشد منتظرِ عروج و اقبالِ خود بود) و با خویشتن درایں اندیشہ کہ از ساحل چوں گذر د بر ساحل جا داشت۔

ہوا خواہانہ بداں چستی۔ کہ گوئی گوے دولت برد۔ خود را بآب در زد۔ بارے بدانست آنکار ا بیناں سقاے سخت کوشے بود، و بہ والا دیدِ معنی آشنایان فرخ سروشے بود کہ جہاناں را از گرداب بدر آورد و بر جہانیاں منت نہاد۔

از دستنبو

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں لیکن کتاب دستنبو میں۔ جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے۔ التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبو میں اپنی طرز خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبو کے چند فقرے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں۔

"دریں روزگار۔ کہ ہر زمزمہ را ہنجار، و ہر ہمہ را رفتار، و ہر کجا سپاہے بود از سپہدار، سخن پیوندی بگذار و بگوے کہ خود روز و روزگار، برگشت۔ اختر شناسانِ سپہر پیماے (یعنی منجماں) برآنند کہ دراں روزگار۔ کہ بزمِ نازیزدجرد شہریار پارس از ترکتازِ تازیاں (اہلِ عرب) بہم خورد۔ کیواں (زحل) و بہرام (مریخ) در خرچنگ (برجِ سرطان) انجمن آراے و ہنر آزماے بودند۔ اینک ہماں پایۂ (درجہ) سیزدہم از خرچنگ ہمچناں بہم پیوستن گاہِ (جاے قران) بہرام و کیواں ست، و ایں شورش و پرخاش و خنگ، و خواری و خونخواری و درنگ، نمایۂ (ظہور) آنست۔

دانا بدیں گفتار کے گرود؟ آں تاختنِ لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر، و ایں برگشتنِ

لشکرست از خداوندانِ لشکر، چنانکہ از داستانِ باستانِ پارسایانِ پارس بہم نانشتنِ (عدمِ مشابہت) ایں دو ستیزہ و آویزہ ہویدائی دارد۔ و درآں بارکہ سخن در کیش بود۔ ایرانِ ایں بقرہ و فرہنگِ کیشِ نو (یعنی اسلام) فرجامِ آبادی، و از بندِ آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت۔ و دریں بارکہ گفتار در آئین ست۔ ہندیاں بہ جشیدِ داشتِ کدام آئینِ تازہ شادماں باشند؟ پارسیاں رُخ از آتش تافتند، و بسوے خدا راہ یافتند۔ ہندیاں دامنِ دادگراں (یعنی اہلِ فرنگ) از دست دادند، و بہ شکنجہٴ دامِ ہمدمیِ دَداں (درندگاں) افتادند۔ نمی بینی کہ از دامن تا دام و از داد تا دَد چہ مایہ دوری ست؛ و دانست کہ آرامش (راحت) جز در آئینِ انگریز چشم داشتن کوری ست۔ زخمِ تازیانہٴ تازیاں از خوبیِ آں کیشِ فرخ (اسلام) مرہمے داشت؛ روزگار در نوردِ ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر مید اشت، بار اندوہ از دوش دلہاے نژند (پریشاں و تباہ) برمیداشت۔ اگر در اندیشہٴ رازداناں بہ ہر دانش و داد۔ ازیں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست بمن نشاں دہند، و بر دلِ اندوہگینِ بیمناک سپاس نہند۔ جہانیاں با جہانباناں ستیزند، و لشکریاں خونِ لشکر آرایاں ریزند؛ وانگاہ شادی ورزند، و بر خویشتن نہ لرزند۔ ہاں اے دانندگانِ فرزبود (حکمتِ الٰہی) و شناسندگانِ زیان و سود ایں ہنگامہ بہ آتشِ خشمِ خداوند گرم ست؛ ورنہ کارزارِ پارس انچنیں امید سوز و آرزو گداز نبود"۔

"چاشتگاہِ دوشنبہ شانزدہم ماہ روزہ و یازدہم مئی سالِ یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگرفت در و دیوارِ بارہٴ (قلعہ) و باروے (فصیل) دہلی بجنبید و آں جنبش زمیں را فرا گرفت سخن

در زمیں لرز (زلزلہ) نمے رود؛ دراں روزِ جہاں سوز، بخت برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہِ کینہ خواہ میرٹ بشہر درآمدند؛ ہمہ بے آزرم و شور انگیز، و بخداوندکُشی تشنہٴ خونِ انگریز۔ دیدبانانِ دروازہ ہاے شہر کہ بُرُوں (علاوہ) از ہمگوہری و ہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ ہم از پیش ہم سوگند نیز باشند۔ ہم پاسِ نمک و ہم پاسِ شہر گذاشتند، و مہمانانِ ناخواندہ یا خواندہ را گرامی داشتند۔ آں سوارانِ سرگرانِ سبک جلو (سبک عناں) و پیادگانِ تندخوے تیزدَو چوں درہا باز و دربا ناں را میہماں نواز یافتند دیوانہ وار ہر سو شتافتند، و ہر کرا از فرماندہاں، و ہر کجا آرامشگاہِ آں مہاں، یافتند تا از نکشتند و پاک نہ سوختند روے ازاں سوی برنتافتند۔ مشتے گدایانِ گوشہ گیر، از بخششِ انگریزی توشہ گیر، کہ ناں با تَرہ و دُوغ می خورند، و در شہر دور از یکدگر پراگندہ جابجا روزگار بسر مے برند (یعنی رعایاے شہر) ہمہ تیر از تیز ناشناسندگاں، و از غوغاے دزد در تیرہ شب ہراسندگاں، نہ پلارکے در دست، و نہ خدنگے در شست؛ اگر راست پرسی ایں مردم بہر آبادیِ کوے و برزن اند، نہ براے آنکہ بہ آہنگِ پیکار دامن بہ کمر زنند؛ با اینہمہ ازاں رُو کہ راہِ آبِ تیز رَو بہ خاشاک نتواں بست، دست از چارہ کوتاہ دیدہ ہر یکے در سراے خویش بماتم نشست۔ یکے ازاں ماتم زدگاں منم کہ در خانہٴ خویش بودم؛ چوں غریو و غوغا شنودم تا از تیرہ ہش دم زدم، دراں مایہ درنگ کہ مژہ برہم زدم، آوازہٴ بخوں غلطیدنِ صاحب اجنٹ بہادر و قلعہ دار دراَرک (قلعہ) و دویدنِ سواراں و پیاپے رسیدنِ پیادگاں در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بلند گشت۔ ہیچ مشتِ خاکے نماند کہ از خونِ گل اندامان ارغواں زار نشد، و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی مانندِ خزنہ

نوبہار نشد. ہاے! آں جہانداران داد آموزِ دانش اندوزِ نکوخوے نکونام، واٰہ ازاں خاتونانِ پری چہرۂ نازک اندام، بارُخی چوں ماہ وتنے چوں سیم خام؛ و دریغ آں کودکانِ جہاں نادیدہ۔ کہ در شگفتہ روئی برلالہ وگل می خندیدند، و در خوش خرامی بر کبک و تذرو و آہو مے گرفتند۔ کہ ہمہ یک بار بگردابِ خوں فرورفتند۔ اگر مرگ بربالینِ ایں کشتگاں بمویہ (بگریہ) خرد شد، و دریں سوگ سیاہ پوشد، رواست؛ واگر سپہر خاک گردد و فرو ریزد، و زمیں سراسیمہ چوں گرد از جا برخیزد بجاست.

اے نوبہار چوں تنِ بسمل بخوں بغلط   اے روزگار چوں شبِ بے ماہ تار شو

اے آفتاب روے بسیلی کبود کن   اے ماہتاب داغِ دلِ روزگار شو

بارے چوں آں روزِ تیرہ بشام رسید، وگیتی تاریکتر گردید، سیہ درونانِ خیرہ کُش (بخیرگی کُشندہ) ہم در شہر جا بجا رختِ تن آسانی انداختند، وہم در ارگِ باغِ خسروی را آخرِ اسپاں ونشیمنِ شاہی را خوابگاہِ خویش ساختند. رفتہ رفتہ از شہرہاے دوردست آگہی رسید کہ شوریدگانِ ہر سپاہ، در ہر فرود آمدن گاہ، (منزل) خونِ سپہداں ریختہ اند. گروہا گروہ مردم را از سپاہی وکشاورز دل یکے گشت، و ہمہ بے آنکہ با ہم سخن رود۔ دور ونزدیک یکدست بریک کار کمر بستند؛ وانگاہ چساں پُرزور کمرے وچگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبشِ جوشِ خونے کہ از کمر گذر دگشادنہ پذیرد. پنداری ایں لشکرہاے بے مُزدِ جنگجویانِ بیشمار راجاروب وار کمربند یکے ست. آرے رُفت وروبِ ہند بوم بداں ساں کہ آرامش و آسایش اگر جویند. باندازۂ پرکاہے گاہے نیابند ہمچنیں جاروبِ گیتی آشوب ہمی خواست.

اینک ہزار لشکر نگری ہمہ بے لشکر آراے آراستہ، وبسا سپاہ بینی یکسرہ بے سپہدار بجنگ برخاستہ. توپ وگولہ وساچمہ (چھرا) وبارود ہمہ از خانۂ انگریز آوردہ، وبا گنجینہ دارانِ روے بستیز آوردہ. آیینِ نبرد و ورزش یکبارہ ہمہ از انگریز آموختہ، ورُخ بکینِ آموزگاران افروختہ. دل ست سنگ وآہن نیست چرا نسوزد؟ چشم نیست رخنہ وروزن نیست چوں نگرید؟ آرے ہم بداغِ مرگِ فرمانرہاں باید سوخت، وہم بر ویرانیِ ہندوستاں باید گریست. شہرہاے بے شہریار پُر از بندہ ہاے بے خداوند، چنانکہ باغ ہاے بے باغباں پُر از درختانِ نابرومند؛ رہزن از گیرودار آزاد وبازارگاں از تمغا، خانہ ہا ویرانہ ہا وکلبہ ہا (دوکانہا) خوانِ یغما.

از دیباچۂ ثانی درفشِ کاویانی

غالبِ خاکسار رہرزہ کار را از آسماں بزمیں فرستادند؛ وفرماں دادند کہ دریں بشیبۂ کشاورزی (کاشتکاری) ورزد، وایں فرازناں (فرماں) را بازماں (توقف) نہ پسندد. ناگزیر می بایست (ضرور تھا) کمر بستن وزمیں خستن، گاوراندن ودانہ افشاندن. نادان (کشاورزی نکرد بلکہ) بہوس در زمینِ غزل جاں کند، وازاں گہرہا۔ کہ با خویش آوردہ بود۔ نیمہ دراں زمیں پراگند. ہمانا (گویا) از ہر دانۂ کہ کاشت ہزار دانہ چشم داشت. از مروارید کہ در خاک نہاں کنند شنیدۂ؟ کہ ریشہ سر بر زند. کاش جُو کاشتے تا سود بر داشتے. دانست کہ ہمہ را خاک خورد؛ (یعنی تلف شد ناچار) نیمۂ دیگر را بپیشِ شاہانِ روزگار بُرد. دیدند وپسندیدند ونخریدند. شبے با یکے از رازداناں پژوہش (پرسش) رفت کہ در مبدأ فیاض بخل نیست؛ ابر بر باغ وراغ وچمن ودمن یکساں بارد؛ چراست؟ کہ مردم چندے نادار واندے (چندے) تونگرند؛ گفت راست گفتی؛

توقیعِ سرنوشت ہا یکے ست؛ (یعنی یکسانست) جُدا شناس (مابہ الامتیاز) اگر ہست جز ایں
نیست کہ کار، و بارِ گروہے از ہر یک بر یک ورق، و سوز و سازِ جرگہ (گروہے) از ہر کس بر یک
صفحہ نوشتہ اند۔ آناں ورق از دفتر با خویش آوردند و برات روزی از ہر در کہ مقدر بود بردند
ایناں۔ ازاں رو کہ انفکاکِ صفحہ از ورق صورت نہ بست۔ تہیدست آمدند، و تہی کیسہ زیستند۔
گفتم از چیست؟ کہ در چار سوے دہر ع

بختِ صلۂ مدح و قبولِ غزلم نیست

گفت آں از نیست کہ برات (چٹھی یا چک) نیاوردہ و ایں از انست کہ سخنہاے بلند داری
و بہ ناشناسا زباں (یعنی اجنبی زباں) حرف می زنی۔ گفتم چہ کنم تا از اندوہ باز رہم؟ گفت شکیب
وَرز، و خوں گری؛ و آنچہ از شیخ علی حزیں شنیدہ می گوے ؎

کس زبانِ مرا نمے فہمد — بہ عزیزاں چہ التماس کنم

فشاں دادنِ اغلاطِ برہانِ قاطع سپاس می خواست نہ ستیز؛ در قلمروِ ہند کس نماندہ باشد کہ مرا
بدیں نیکی بد نخواندہ باشد۔ یکے خنجر آورد کہ من قاطعِ قاطعِ برہانم؛ دِگرے اخگر آورد کہ من مُحرقِ قاطعم*
کیست تا از من بداں جوانمرداں گوید کہ از دریدن و سوختنِ کاغذ جز فغان و دُخاں چہ خیزد؟
بزہ مندِ گناہگار، منم؛ اگر در آتش فگنند، و رہ بہ تیغِ دو نیم زنند بہر دو گزند درخورستم (یعنی لائق
ہستم) و بہر دو سزا سزاوار +
سخندانِ راستی جوے را بایستہ آں کہ از ہر کتابِ فرہنگ عبارتِ جامع آں را بدان نگاہِ تیز

* جو کتابیں قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی ہیں اُنمیں سے ایک کا نام قاطعِ قاطع اور ایک کا مُحرقِ قاطع رکھا گیا تھا ۱۲

بنگرد کہ از بس تیزی در جوہرِ لفظ فرو رود۔ تا چگونگیِ پیوندِ الفاظ کہ انگیزش گاہِ معنی ست آشکار
شود۔ ہرگاہ آں را بہ نجارِ اہلِ زباں نہ بیند۔ داند کہ در سوداے زباندانی جز زیاں نہ بیند۔
دِگراں دانند و کارِ آناں؛ مرا نیز خردے و روانے دادہ اند۔ فراز آوردۂ (پیش آوردۂ) اندیشۂ
بیگانگاں را چوں پذیرم؟ و از نیروے خردِ خداداد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس کہ نیرو فراے
دانشِ من دانشمندے+ کسے ست کہ اگر چنانکہ رازداں بود۔ رازگوے نیز بودے ششمیں ساسان*
بشمار آمدے۔

زخویشاں بہ بیگانگی شادمانم — نمانم بکس (در صورت ۱۲) چوں بکس مے (در سیرت ۱۲) نمانم
غریبم و لے روشناسِ عزیزاں — چنارِ سرافراز در بوستانم
گرفتم کہ از تخمِ افراسیابم — گرفتم کہ از نسلِ سلجوقیانم
دل و دستِ تیغ آزمائی ندارم — رہ و رسمِ کشورکشائی ندانم
بمیدانِ معنی خداوندِ رخشم — بمضمارِ پہلو زباں۔ پہلوانم
دو سی سال توقیعِ معنی نوشتم — سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطعِ برہاں۔ کہ صنعتِ نقشبندِ خیالِ من ست، نہ نامۂ اعمالِ من ست کہ دراں جہاں
بمن خواہند سپرد۔ ہمدریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بمقامے چند کلامے چند بفزایم؛
و ایں مجموعہ را۔ کہ قاطعِ برہاں نام نہادہ ام۔ سپس درفشِ کاویانی خطاب دہم۔

+ مراد از آں مولانا عبد الصمد استاد میرزا است ۱۲ * ساسان نام پسرِ بہمن بن اسفندیار بود کہ از پادشاہی بسیاحت و تحصیلِ حکمت و ریاضت پرداختہ و کسے
از اولادِ وے نیز بر طریقۂ وے بودہ اند و ایں ہر چہار را ساسانِ اول و دوم و سوم و چہارم نامیدہ اند من بعد پس از خسرو پرویز ساسانِ پنجم بظہور آمدہ کہ
ساتیر را از لغتِ ژند در زبانِ دری ترجمہ کردہ ۱۲

نازم بخرامِ کلکِ طرز رقمش ... ناماست ز تیزی بدم تیغ دمش
چون اسمِ کتاب قاطعِ برہاں بود ... گردید درفشِ کاویانی علمش

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم۔ سرودنِ سخنہائے ریزہ (متفرقہ) جز افزودنِ ہوش انگیزہ (سبب و باعث) ندارد۔ یاراں جفا کنند، ومن بہ ازائے ہر جفا (بعوضِ ہر جفا) وفا ورزم۔ ہمانا نکوئی وبس یاراں خواہم وبس۔ بند نہند، پند دہم۔ داد دریغ دارند، اندرز دریغ ندارم۔ سنگ زنند، ثمر بارم۔

از تقریظات و دیباچہ ہائے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں اُن میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر پایا جاتا ہے۔ وہ ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں، فقروں اور اُنکے اجزا میں عموماً ایک خاص قسم کا وزن اور قول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں، اکثر جگہ صفات متوالیہ ومتتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ پس سوا اِسکے کہ یہ نثریں شعر کے اوزانِ مخصوص سے جنکو اُسکی ماہیت میں کچھ دخل نہیں۔ معرا ہیں، ہر ایک اعتبار سے اُنپر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے چونکہ یہ نثریں مرزا نے خاصکر اپنے عالی دماغ اور نکتہ سنج معاصرین کی ضیافتِ طبع کے لئے لکھی ہیں اور اُن میں اپنی نوآئیں طرازی اور نادرہ سنجی کا۔ جیسا کہ چاہیے۔ حق

ادا کیا ہے اِس لئے جب تک کہ اُنکے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے عام ناظرین اُن سے کچھ لطف نہیں اُٹھا سکتے اور اِس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائیگا جسکی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گذریگا لہذا اُن نثروں میں سے صرف اِس قدر انتخاب کیا جائیگا۔ جس سے مرزا کی اِن جزیل اور گرانمایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

اِس غرض کے لئے ہم اوّل بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھکر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب پنج آہنگ کا دوسرا آہنگ۔ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جسمیں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبانِ فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں۔ اُسکے اول میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اِس پھیکے سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

وہاں ایک جگہ مضمونِ مذکور کی نسبت لکھتے ہیں "زمینے شور کہ چون ذوق سے در طینتِ زاہد۔ تخم نگلبین را در انجا ریشہ درخاک نہ دود۔ و خارے نا استوار کہ ہر دیوار کہ دراں ریگستاں برکشند پیش از سایۂ خود بخاک افتد"

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو۔ کہ دیوانِ مذکور اور اُسکے نوادر افکار میں آورد اور تصنع یا کسی اُستاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے اِس طرح ادا کرتے ہیں "بنا میزد (یعنی چشم بد دور) نخستیں نقابے ست از روے شاہد

ہر سہت کردہ معنی بجنبشِ نسیم برافتادہ؛ یعنی تنگ کشاکشِ دست ناکشیدہ. باز پسیں جرعہ علیت
از گرمی چراغانِ نیم سوختہ پہلو رخ با فروختن دادہ؛ یعنی داغِ منتِ خس نادیدہ.

ایک جگہ اِس مطلب کو - کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اُسکے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا - اِس طرح بیان کرتے ہیں "سخن آفریں خدائے گیتی آرائے را ستایم کہ تا بنا نخانۂ ضمیرم را از فراوانیِ زنگار رنگ معنی بہ لعل و گہر انباشت، باز دیم را ترازوی مرجان سنجی و خامہ ام را ہنگامۂ گہر پاشی ارزانی داشت.

اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کرکے ہدیۂ ناظرین بالتمکین کرتے ہیں۔

از دیباچہ دیوان فارسی

دیوانِ فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اِس مطلب کو - کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھکر میرے حسنِ بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں - اِس طرح بیان کرتے ہیں "لاے خُمِ میخانۂ سرمدی نسبت ناچشیدگاں - سگالند کہ ہیچدانے را ایں مایہ سیرابیِ نطق از کجا ست؛ غافل کہ نم رشحۂ یک فیض ست کہ سبزہ را دمیدن، و نہال را سر کشیدن، و میوہ را رسیدن، و لب را زمزمہ آفریدن آموخت. و بہ پرتو مہتابِ ازلی ہدایت تسبگیر نکردگاں اندیشند کہ تیرہ سر انجامے را ایں ہمہ روشنائیِ گفتار چرا ست؛ بے خبر کہ فرۂ تابشِ یک نور ست کہ شمع را بہ شعلہ، و قدح را بہ بادہ، و گُل را بہ رنگ، و درون را بسخن برافروخت. + + + + +
داغم از کوتہ نظرانِ تنگ چشم کہ دمیدنِ تازہ گُل از گیاہ، و درخشیدنِ برق بشبہاے سیاہ شگفت ندارند، و جنبیدنِ زبانہاے گویا بہ سخن ہاے نغز و شُخوار انگارند؛ غنچہ مشکیں نفس ست، و باد غالیہ ساے، و گُل کشادہ روے، و بلبل نوا سنج؛ زباں چہ گنہ کردہ است کہ سخن سراے

نباشد. مہر جلوہ بر تابد، و ذرہ بیتابی، و بحر روانی، و قطرہ اشتلم، دل را گہ گفتہ است کہ از شورش ستوہ آید. ہمانا بدانست ایں گروہ بادہ در خمخانۂ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفانِ گذشتہ را تر دماغ ساختہ، حالیا بساطِ بزمِ سخن برچیدہ، و جام و سبو بر سرِ ہم شکستہ، و از اں قُلزُم قُلزُم راوق تہے بر جاے نماندہ، پندارند. کاش با تخمینے - کہ من در فرودیں رَدہ (یعنی صفِ پائیں) بہ حلقہ اوباش قدح می گیرم - فرارسند، تا دارسند کہ مے فراوانست، و ساقی بے دریغ بخش؛ پیمانہا جُرعہ ریز ست، و لبہا العطش گوے. وَ لِلّٰہِ دَرُّ مَنْ قَال.

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان ست   مے و میخانہ با مہر و نشان ست

آرے صہباے سخن بہ روزگارِ من از کہنگی تند و پُر زور ست؛ و شبِ اندیشہ را بہ فرّ دمیدنِ سپیدۂ سحری براتِ فراوانیِ نور ست. ہر آئنہ رفتگاں سرخوش غنودہ اند، و من خرابستم؛ پیشینیاں چراغاں بودہ اند، و من آفتابستم.

اِسکے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کرکے اِس طرح لکھتے ہیں "انصاف بالاے طاعت ست - در ہوائے کہ بالِ بالا خوانی (یعنی خود ستائی) زدہ ام، و در آوائے کہ خود را بہ تسگرفی ستودہ ام؛ نیمہ ازاں شاہد بازی ست؛ یعنی ہوا پرستی. و نیمۂ دیگر تو انگرستائی یعنی باد خوانی. بیداد بیں کہ ہر جا بشانہ خمے از زلفِ مرغولہ مویاں کشودہ شود - بلا در من آویزد تا دل بہ پیچاکِ آں شکن بندمے. و خواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے برادرنگ سروری کج نشیند - ہوس مرا برانگیزد تا بہ پیشش بندہ وار راست ایستمے. شادم از آزادی کہ بسا سخن بہنجارِ عشق بازاں گزاردستم؛ و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردارِ دنیا طلباں در مدح

اہل جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمرِ سبک سیر لختے بہ چامہ و چنگ سرآمد، و پارۂ بدروغ و دریغ رفت، فرجامِ گراں خوابی برنخاست، و آشوبِ ہوسناکی فرونہ نشست۔

اختتامِ دیوانِ فارسی

خاتمۂ دیوانِ فارسی میں اس بات کا عذر۔ کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر دیر لگی کہ اکتالیسؔ برس کی عمر میں اسکے چھپوانے کی نوبت پہونچی۔ اِس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خود سر اور بلند پرواز تھی اسکی رُوک تھام میں بہت سا زمانہ گذر گیا۔ اور اِس مطلب کو اپنے طرزِ خاص میں یوں ادا کرتے ہیں۔

”ہاں وہاں رخشے بداں توسنی کہ عنانش موے و مشامش بوے بر تافتے، و از شموسی (سرکشی) گام بہ رازی نہادہ جز بہ پہنانہ شتافتے۔ از ترسندہ دلی عنانش کشیدہ، و بہ لابۂ آوازِ بوسہ اش آرمیدہ داشتمے۔ چوں پارۂ از راہ بدیں گونہ۔ کہ بر شمردم۔ بُریدہ شد، و روز بلند گشت، ہم جوشِ تُندیِ توسن فرونشست، و ہم دست و پاے سوار از عناں و رکاب خستگی پذیر آمد۔ تابِ مہرِ نیم روز، مغز در سرِ سوار گداخت، و تفتگیِ ریگِ بیاباں نعل در پاے نگاور نرم کرد۔ رایض را دم و گرُتہ را قدم بگداز آمد۔ ہم آب بہ آخر گرائید، و ہم ایں را بہ بستر نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالیِ توسنی سرآمد، و در ہنگامِ گستہ دمی خستگی روے آورد۔ + + + + + + کیست تا از من بپرسد؟ و اگر ناپرسیدہ گویم در دلش فرود آید، کہ دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا (یعنی جنگ ہا) روے دادہ، و پس از آنکہ کاربداں جا رسیدہ کہ ہمہ گراز کوفتگی فرو ماندند۔ بمیانجی گریِ توفیق یکدام قرار دادِ آشتی اتفاق افتادہ۔ خامہ دیر جنبش بود، و شوق زود گراے، (جلد باز) گفتار را از نشیبِ دُور باشِ اندیشہ بر رازنامے فاصلۂ

دل و زباں خوں شد، و اگر ناگہ از دل بزباں رسید۔ والا سیچیِ ہمت آں را بخامہ نسپرد۔ ہرچند منشِ (طبیعت) کہ یزدانی سروش ست در سرآغاز نیز گزیدہ گوے و لپسندیدہ جوے بود۔ اما پیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادہ روی) پے جادہ نشناساں برداشتے، و گتریِ رقاصاں را لغزشِ مستانہ انگاشتے۔ تا ہمرہاں نگاپوپیش خراماں را بخجستگیِ از زشتی مقدمی (یعنی لیاقت ہمراہیِ خویش) کہ در من یافتند۔ مہر بجنبید، و دل از آزرم (مروت) بہ درد آمد۔ اندوہِ آوارگیہاے من خوردند، و آموزگارانہ در من نگرستند۔ شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بیراہہ رویہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، و زہرِ نگاہِ طالبِ آملی و برقِ چشمِ عرفیِ شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہاے نارواد پاے رہپیماے من بسوخت۔ ظہوری بسرگرمیِ گیرائیِ نفس (تاثیرِ کلام) حرزے ببازو و توشۂ بکمر بست، و نظیریِ لاابالی خرام بہنجارِ خاصۂ خودم بچالش (رفتار) آورد“

دیباچۂ دیوانِ تفتہ

دیوانِ تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاطِ قویٰ اور اپنے قلبِ ماہیت کو اِس طرح بیان کرتے ہیں۔ ”ہاں اے غالبِ تیرہ روز، ذرم اختر! کہ بدیں ہستی و کسائیِ شخصیت کہ تراست۔ بداں مانی کہ دانی در عالمِ فرضِ محال سیندے دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ۔ اللہ اللہ چہ مایہ جوشِ سوداست (یعنی غلبۂ مادۂ سودا) کہ ہر نفسے کہ مے کشی۔ چوں خطے کہ از نقطہ بر آورند ہمرنگِ سویداست۔ آں قلم و اندیشہ۔ کہ از روانیِ خامہ و روانیِ گفتار آب و ہوا داشت، و دمے نمش را فرو ردیں پرستار بود، و چاشنگیش را نسیمِ سحری پیشکار۔ بدیں ناخوشی و زشتی مے بایں چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ چمیدن دل از دستِ تماشائیاں نبرد، و غنچہ را چہ روے

داد کہ بہ دمیدنِ پردۂ شکیبِ نظارگیاں نہ وَرَزد۔

آں اثرِ پردۂ سازت چہ شد　　زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد

آں زجنوں پردہ کُشائیت کو　　ولولۂ سلسلہ خائیت کو

آں نفَسِ نالہ کُنندت کجاست　　واں نگہِ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی در جواب گفتہ) کہ سوزِ غم دود از دل برآورد، و گدازِ نفسِ آذر در زبان زد۔ بادلے کہ ہر آئینہ نگداخت، و با زبانے کہ ہمانا نسوخت، عذرِ غمزدگی مسموع نیست۔ بیا تا ہمیں دل بہ زہرۂ اُلْحَذَر نوائے را بسخن نہیم، و ہمیں زبانِ کز نغمہ ایں المفر سرائے رانگفتار آریم (یعنی طوعاً و کرہاً تقریظِ دیوانِ تفتہ بہ نگاریم)

زمن جوے ورِ بُدْ نکو زیستن　　جگر خوردن و تازہ رُو زیستن

سَمَن چیدن و دُرّہ انداختن　　دل افشردن و در چہ انداختن

(مراد از سمن چیدن و دررہ انداختن آنکہ بہ ہمگناں اظہارِ خوشحالی می کنم و اندوہ دروں را کہ دل افشردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم تا بر ہیچکس ظاہر نشود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خوں　　بہ شور آبہ شُستن ز رخسارہ خوں

شگفتن ز داغے کہ بر دل بود　　نہفتن شرارے کہ در دل بود

ستایشِ سخن چشم بد دُور، خمکدۂ سخن را شرابے ست پُر زور کز میں ازاں بہ لائے (یعنی بہ پُر روے) و سپہر ازاں بوئے آنچناں برقص آید کہ اگر کعبہ را حجرالاسود از دیوار و مشتری را عمامہ از فرق فرو افتد شگفت نماید۔

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر فارسی کا سب سے بڑا حصہ اُنکے مکاتبات و مراسلات ہیں جنیں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں اسی لئے ہم اِس حِصّے میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کرینگے اور جہاں تک ہوسکیگا مشکل فقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائیگا۔ اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اُنکو بھی چھوڑ دیا جائیگا۔

مرزا علی بخش خاں فیروزپور جھرکے میں ہیں؛ نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا ہی اور اُنکی جگہہ شمس الدین خاں مسند نشین ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خاں کو کلکتے پہنچکر خط لکھا ہے اُسمیں لکھتے ہیں۔

"میر فضل مولےٰ خاں نام یارے داشتم؛ او را نا گرفت (ناگاہ) در عرضِ راہ بہ مرشد آباد یافتم در نوردِ گفتگوہاے ویرس و جوہائے کہ رفت۔ از جامہ گذاشتنِ (یعنی از مردن) فخرالدولہ بہادر بمن خبر داد؛ و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں برگفتند۔ آوخ ! کہ چراغِ روشنِ ایں دودماں مُرد، و شبستانِ آرزو ہا تیرہ و تار شد۔ از جانبِ شما اندیشناکم؛ و دانم کہ آنچہ شما را پیش آید دلخواہ نباشد۔ ناکساں را روز بازار خواہد بود؛ و فرومایگاں را گرمی ہنگامہ۔ زود اکہ انجمن از ہم پاشد؛ و پراگندہ ہچند گردانید۔ دولت روے گرداند؛ و آسودگی برخیزد۔ زینہار ہوشمندی را کار باید بست؛ و ہموارہ بخود نگراں باید بود"

ایک اور خط کو جو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے اِسطح شروع کرتے ہیں "جانِ برادر!

سخن را از فراوانی بر روے ہم افتادن ست، وگرہ در گرہ گردیدن۔ ومن آں می خواہم کہ اندک گویم، وسود بسیار دہد، وشنوندہ آں راز وددریابد۔ واین بسیچ (قصد) روائی پذیر نیست مگر آنکہ گویندہ دراں کوشد کہ نشستن از گفتن آں مایہ سود تر نزد کہ سر ایں ہر دو رشتہ با ہمد گر نتوان تافت، و نقش یکے در آئینہ دیگرے نتواں یافت۔ زمانے گوش بمن دارید و فرارسید کہ چہ می گویم، وازیں گفتن چہ می خواہم، وشمارا دربرابر آں چہ می باید کرد، و اندازۂ آں بایست تا کجاست،، اسکے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کئے ہیں۔

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسۂ اکبر آباد جو میرزا کے ہموطن ہیں اور اُنھوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہونچنے کی شکایت کی ہے اُنکے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔

امروز شرارۂ بداغم زدہ اند　　نشتر برگِ صبر و فراغم زدہ اند
از کثرتِ شورِ عطسہ مغزم ریش ست　　تا عطرِ چہ فتنہ بدماغم زدہ اند

جنبشِ خامۂ عیسوی ہنگامۂ مطاعِ مکرمِ مخدومِ اعظم را نازم کہ بہ احیاے ہوسہاے مُردہ ساحتِ خاطر را عرصۂ محشر ساخت، و بازارِ رستخیز گرم کرد۔ خار خارِ دیریں آرزوہا سراز دل بدر آورد، بیاد آمد کہ مرا ہم در گیتی وطنے، واز مہربانان انجمنے بودہ است۔ چوں نشتر پرسش بمغزِ اندیشہ فرو بردہ اند (یعنی احوال پرسیدہ اند) خونچکانی نواہا تماشا کردنی ست۔ درازیِ زمانِ فراق۔ کہ بگمانِ مخدوم شانزدہ سال ست وبدانست نامہ نگار کم از بست سال نیست سترتیز کرنگے بودہ است کہ نقشِ آسایش از صفحۂ خاطرہا ستردہ اند۔ آغاز ورود بہ دہلی

کہ دُردِ بادۂ غفلتے بہ قدح داشتم (یعنی تقیۂ ہوا وہوس در سر بود) لختے از عمر بہ پیمودنِ جادۂ کامرانی و ہوس گذشت، و بے راہہ خرامیدہ شد۔ تا سراز مستی بگردید (یعنی بدمستی سے سر پھر گیا) و اندراں بیخودی پاے مصطبہ پیما بہ گوے فرو رفت (گڑھے میں اُتر گیا یعنی ایک ایسا صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہوگئے) لاجرم در ہم شکستہ سراپاے، وگرد اندوہ سر و روے، برخاستم۔ ہنگامۂ دیوانگی برادر یک طرف، و غوغاے وام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہِ لب، ونگاہ روزنۂ چشم، فراموش کرد، و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ و تار شد۔ بالبے از سخن دوختہ، وچشمے از خویش فرو بستہ۔ جہاں جہاں شکستگی، وعالم عالم خستگی، با خود گرفتم۔ واز بیدادِ روزگار نالاں، وسینہ بردمِ تیغ مالاں، بکلکتہ رسیدم۔ فرماندہاں سرتر بگی وکوچک دلی (یعنی مہربانی و شفقت) کردند، ودل را نیرو بخشیدند۔ آں ہمہ بخشایش۔ کہ شاہدہ رفت۔ امیدِ کشایش آورد، و ذوقِ آوارگی و ہواے بیاباں مرگی۔ کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود۔ بدل نماند۔ وہوس آتشکدہ ہاے یزد و میخانہاے شیراز۔ کہ دل را بسوے خود کشیدے و مرا بہ پارس می خواند۔ از ضمیر بدر جست۔ (یعنی بشاہدۂ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت) دو سال دراں بقعہ مجاور بودم، چوں گورنر جنرل آہنگِ ہندوستاں کرد پیشاپیش دویدم، و بدہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، وکار ساختہ شدہ۔ صورتِ تباہی گرفت۔ اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ، ودل بمرگِ ناگاہ نہادہ، بکنجے نشستہ ام، و در آمیزش بروے بیگانہ و آشنا بستہ،،

”من اگر با اینہمہ رنج و اندوہ۔ کہ پارۂ ازاں باز گفتم۔ در نگارشِ نامہ وسپارشِ پیام کاہل قلم

وکوتاہ دم باشم، و بزرگانِ وطن را بیا دنیارم؛ در عالمِ انصاف بزہ مندنیستم۔ آماگرانمایگانِ جہانِ مہر و وفا۔ کہ ازدُور افتادگاں نپرسند و از مرگ و حیاتِ دوستاں باز بجویند۔ اگر گفتگو میاں آید، دسمندِ شکوہ عناں برعناں (یعنی بمقابلہ یکدگر) تازد گوے دعوی چگونہ خواہند بُرد، و قطع نظر از حریفِ آب دنداں (یعنی حریفِ مغلوب) کہ مَنَم۔ خداے توانا را چہ جواب خواہند داد"

"کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست   مرا در دہر پنداری وطن نیست"

مولوی نور الحسن نامے ایک نوجوان نے کلکتے سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اُسکے ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لئے بھیجا ہے۔ اُسکے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اُسمیں لکھتے ہیں۔ "پدید آمد کہ خاطرِ عاطر را بجانبِ نثر گرایشے، و ہنگامۂ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در انجا (در کلکتہ) آرایشے ہست۔ بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے نہادہ آید، و ہم اندریں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید۔ دم سردیِ شما (یعنی کم شوقیِ شما) بہ دانش آموزی۔ انچہ دیروز (یعنی در زمانۂ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام۔ یاد میکنم؛ و خوں گرمیِ شما (یعنی سرگرمی شما) در خرد اندوزی۔ انچہ امروز مے نگرم خود را بدیں شادی کنم۔ ہمانا در اندیشہ نہالے بر ہگذر دارم بداں زودی۔ کہ ثمر از شاخ افتد۔ نخلے شدہ، و رُطب بار آوردہ، بسنے نے ہنگامہ یوسفے در نظر دارم بداں خوبی کہ دل از فرشتہ رُباید۔ از بندِ حجاب بدر آمدہ، و ہر ہفت کردہ۔ خواستہ آید کہ مسودۂ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، و من آں را نگریستہ، و نشستِ ہر کرشمہ و انگیزہ بذلہ را بایستگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحبِ من! اگر بدانستہ اید کہ گفتار جز بگفتار سرو نگردد، و سخن جز بہ سخن شناختہ نشود، ہر چند ارادتِ شما ذریعۂ سعادتِ من و خرسندیِ شما موجبِ رضامندیِ من ست لیکن

تحریر در میاں نہ گنجد، و میانجی گریِ خامہ کار بر نیاید۔ آرے نگارش یکدست است و گفتار لخت لخت۔ ستردنِ یک لفظ از میانہ، و آوردنِ لفظِ دیگر بجاے آن بر نشانہ۔ دانا شناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرس و جو دارد۔ وحقِ ایں پرسش نتواں گزارد۔ مگر بہمزبانی۔ دریں تزدیکی یکے از برادراں۔ کہ در برادراں از وے عزیز ترے نیست۔ سخن ہاے پراگندۂ مرا کہ عبارت از نثر ست۔ گرد آوردہ، و صورتِ سفینہ دادہ است۔ نزیں پس آں مجموعۂ پریشانی را پیشِ شما مے فرستم، تا دستمایۂ سگالش در سخن و یاز نمائندۂ اندازۂ نکوئی فن تواند بود + + + + +

نواب مصطفٰے خاں مرحوم نے۔ جب کہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے۔ مرزا کو خط لکھا ہے اور اُسمیں اُنکی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے، اپنے نتائج افکار میں سے کچھ اُنکو بھیجا ہے اور اُن سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں درخواست کی ہے۔ مرزا نے اُسکے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے اُسمیں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں۔

"تا دُکانم در کشادہ بود، و رنگ رنگ متاعِ سخن بروے ہم نہادہ، کس از مشتریاں حلقہ بر در نزد، و سوداے خریداری از ہیچ دل سر بر نزد۔ چوں دُکاں را کالا، و زباں را حرفہاے جگر آلا (یعنی آلودہ بخونِ جگر) نماند۔ روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفٰے خاں) پدید آورد کہ نقدِ رائجِ سخنِ خود را بہ بہاے گفتارِ نا سرۂ من می دہد، و گوہر را بہ پلۂ بیعانگیِ خزف می نہد۔ + + + ہاں وہاں اے خریدارِ دکانِ بے رونق! از فراوانیِ مسرتِ ورودِ مسعودِ ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا۔ با آنکہ نکوئی خواہِ خویشتم۔ بر من بہ رشک آورد۔ حوصلۂ مرا۔ کہ فرسودۂ غمہاے دہرم۔ گنجائیِ ایں مایہ شادی کو؟ و اندیشۂ مرا۔ کہ دل شکستۂ دوریاشِ یارانم۔

فرجامِ پذیرائیِ ایں ہمہ قبول کجا؟ روزگار را از آزارِ خویش چگونہ پشیماں گیرمے کہ اینچنیں شادی را بجز در پذیرمے۔ و دوستاں را تاکجا قدرِ ناشناس پندارمے کہ از شما انیقدر ستایش در بارۂ خویش باور دارمے۔ حقا کہ نہ آسان ست ستودہ شدن بہ زبانِ شیوا بیاناں (یعنی فصحا) و دشوار تر از انست اندازہ نمائی باندازہ داناں"

"قبلۂ من چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و برفرقِ فرقداں سا افشاندم (یعنی مجموعۂ نظمِ فارسی) اکنوں آہم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست۔ گوئی پس از نخستنِ آں گنج گنجداں گرفتہ، و از سخن ہر چہ از ازل آوردِ من بود گفتہ شد + + + + + + + + + + + +

نواب مصطفٰے خاں مرحوم نے تذکرۂ گلشنِ بے خار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لئے بھیجا ہے اسکو دیکھکر مرزا نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے "من کہ زبانم در ستایش بیقرار ست و اندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ۔ امید کہ دراں پایہ بزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ نشوم، و بدیں مایہ جرأت بزہ مند نگردم۔ بنا میزد (چشم بد دور) تذکرہ ترتیب یافتہ و مجموعہ فراہم آمدہ کہ پیش طاقِ بلندنامی را نقش و نگارست، و نہالِ نکو سرانجامی را برگ و بار۔ رہرو نظر چوں بہ بیدائے کنار ناپیدائے ذوقِ سخن گام تماشا بردارد توشہ بہ ازیں برکمر نتواند بست۔ خضر با آں ہمہ جگر تشنگی کہ سکندر داشت لبش بر شحۂ ازیں تر نتوانست کرد، و آں آب از دریا بخشیدن بود۔ شما گروہے را از دور و نزدیک بہ سخن زندگانیِ جاوید بخشیدید، و ایں لختے از عمر بکار دیگراں کردن ست۔ جاوداں زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند۔ و ہمگناں را بہ نکوئی نام برآمد۔ بارے گہر سُفتنِ خامہ و گوہریں نگشتنِ نامہ در ردیفِ الف بہ نگارشِ اشعار پر دیں نثار

حضرتِ آرزدہ[†] از چہ روست؟ ہر چند ذکر مخدومِ برچنیں مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوارِ شانِ فضیلت باشد لیکن اگر بمقتضائے فرطِ محبت جرأتے بکار رفت گناہے نبود، و در تلافیِ آں بہ پوزش نیاز نے افتاد"

(عذر، حاجت)

حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے جب کہ وہ کلکتے میں مقیم ہیں خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیجد یجیے اُسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"دردمند نوازا! نسیمِ دردِ مشکیں رقم ہا، غنچۂ ایں راز را پردہ کشائے، و شمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد کہ روزگار ہر گز لکِ تطاولِ زمانِ فراق نقشِ بے اعتباری ہائے من از صفحۂ خاطرِ احباب نستردہ و ترکتازِ صرصرِ بیدادِ جدائی خاکسار یہائے مرا از یادِ عزیزاں نبردہ است"

"در معرضِ طلبِ نثر فرو ماندہ تر از اں میزبانِ بے دستگاہم کہ ناگرفت (اچانک) مہمانے عزیزش از راہِ دور در رسد، و بیچارہ بسا گرد سراپائے سرمایۂ خویشتن بگردد تا شوربائے دود آلودے و نانِ کشکینے (یعنی نانِ جویں) فراز آرد۔ من و ایمانِ من کہ بگرد آوردنِ نثر پراگندہ نپرداختہ و خود را دریں کشاکش نینداختہ ام۔ چہ پیدا ست کہ فرو ریختۂ کلکِ ایں کس (یعنی من) نقشے ست نغز یا زشت (یعنی زشت) یا رقمے ست فرہمند (یعنی خوب) در صورتِ اول چہ لازم ست خود را بہیچ فروختن، و وبالِ نظارۂ آیندگاں بہ گلم خریدن، و در شقِ ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگاں چہ بردہ اند و گذشتگاں چہ یافتہ کہ مارا آرزوئے آں دایہ (یعنی دریوزہ) بتیاب دارد۔

[†] اول مسودے میں مفتی صدر الدین خاں مرحوم متخلص بہ آزردہ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا مگر مرزا نے جب یہ خط لکھا تو نواب صاحب نے اُن کا بھی تذکرہ درج کردیا۔

انصاف بالاے طاعت است - بدعوی گاہے کہ توانائیِ قتیل را بفرو ہیدگیِ فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگیِ روش) مسلّم داشتہ، ولواے نور العین واقف بشیوائیِ شیوہ (یعنی بخوبیِ طرز) برافراشتہ باشند - باکہ باید گفت کہ نتایجِ طبعِ ما کجائی ست، و ما را چہ لذت دریں جگر خائی ست - سطرے چند کہ دیباچگیِ دیوانِ ریختہ کسوتِ حرف و رقم پوشیدہ، و دودِ سودائے کہ بآرائشِ سفینۂ موسوم بہ گلِ رعنا از سویدا جوشیدہ است ارمغان می فرستم و از شرم تنک مایگی آبِ گردیدم والسلام۔

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسیٰ جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے اسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں "دریں ہنگام - کہ فرماندگی از اندازہ گذشتہ و دل با فسردگی خوے گرفتہ است - ندانم چہ سے نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگرستن نگہ از ناز بدیدہ در نمی گنجد، و دریں نگارش خامہ از شادی در بناں (سرِ انگشت) مے رقصد بخت را برسائی ستایم و پندارم کہ بطورِ معنی رسیدہ ام - خود را بگرانمایگی آفریں گویم و انگارم کہ موسے را بآید بیضا دیدہ ام - اگر مخدومِ مرا بگرفتنِ عیارِ ایں دعوی حیرتے روے دہد، وایں پایہ بالاخوانی وخود نمائی از من عجب آید - گویم ہاں انصاف، سخن برکنایہ می سرایم نہ بگزاف - موسیٰ اشارہ بہ سیدی مکرمی میر موسیٰ جان، و ید بیضا عبارت از دیوانِ فروغانی عنواں -

زہے دیواں کہ مدادش از دودۂ چراغ طور ست، و غلافش از دیباے حلّۂ حور - قلزمِ معنی را سفینہ است، و جواہرِ مضموں را گنجینہ - - - سبحان اللہ سخن بروزگارِ مخدومِ بپایۂ بلند رسید، و از دوبارہ رونقِ دیگر پدید آمد - اینکہ نارسیدنِ نامۂ من بخاطرِ عاطر جاے گرفت، و شکوۂ آں بزبانِ قلم رفت - مرا آبرو افزود، و ارزشِ مرا در نظرم جلوہ گر ساخت - خوشا من کہ دراں

چشم و دلم جاے باشد، و چوں نامۂ من نرسد بہ آرزو ارزد - گرد سرِ ایں نوازش گردم، و بریں پرسش جاں برافشانم - - - - - - - -

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعۂ خط موسومہ لالہ ہیرالال کے معلوم ہوئی ہے اُس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں -

"قبلہ و کعبہ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرالال را ہواے دیدنِ عنقا در سر، و ناگاہ شامگاہے بہ نشیمنِ تنہائیِ من گذر، افتادے - آں در گرفتنِ آتش گرداگردِ والا کاشانہ، و سوختنِ خانہ و رختِ ہمسایگاں از ہر کرانہ، و نرسیدنِ آسیبے بملازماں دراں میانہ، از کجا شنودمے؟ و اگر نہ شنودمے ہر آئینہ ہم حقِ دوستانہ پرسش - کہ شیوۂ غمخواری و اندوہ ربائی ست - ناگزاردہ ماندمے، و ہم ایزدی نیایش کہ لازمۂ حق شناسی و سپاس گزاری ست بتقدیم نرسیدمے - ہاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں لالہ ہیرالال) کامیابِ پیام و نامہ، و آشنایاں جگر تشنۂ رشحۂ خامہ!!

وائے برمن کہ رقیب از تو بمن بنماید   نامۂ واشدۂ مُہر بہ عنواں زدۂ

"ہماناآں سوزندہ آذر سرگرمیِ شوق از من فراگرفتہ بود کہ بیتابانہ گردِ سر گردید، و اندراں اشتلم (شدت) زبانہ و شرارہ در خویشتن نگہداشت - ہیہات من کجا و ایں ہمہ دعویِ بلند از کجا!! خود نمائیہاے گمانِ تاثیرِ مہر و وفاست کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لاے و یافہ سرائے دارد، ورنہ آں را کہ از شعلۂ آہِ جگر سوختگاں دامن نسوزد، عجب نیست اگر آتشِ افروختہ پیراہن نسوزد - شکوہ بیکیش، و پیغارہ (طعنہ) برطرف، خداے توانا را شکر گویم کہ بلاے بی زنہار

از بندگانِ خویش بگرداند، وتابے بصراں را دیدہ و دیدہ وراں را ثمرہ بدست افتد۔ کرشمۂ نیروے جبرئیلؑ و معجزۂ آسودگیِ خلیلؑ را در نظرہا تازہ کرد + + + اگر دانستمے کہ پیشِ خود شرمساری نخواہم کشید، ومرا اندریں محال طلبی بر من زبانِ طعنہ دراز نخواہد شد۔ ازاں مخدوم بے عنایت پاسخِ ایں نامہ و تفصیلِ ایں ہنگامہ درخواستمے و پرسیدمے کہ دراں ہنگام کہ آتش زبانہ زد، و نگہ بسراغِ تیرگیِ دودے و تابشِ ہنودے فرارسید۔ شما چہ می کردید؟ و نورِ چشمِ مردمی و فرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود؟ وپس ازانکہ رستخیز در ہمسایہ آشکار شد، و ہنگامۂ ہر در انجمن افتاد۔ سراسیمگیِ درونیِ پرستاراں و بیتابیِ برونیِ ہواداراں چہ قیامت آورد؟ و اینہمہ آشوب چہ مایہ دیر کشید؟ و فرجامِ کار کہ فسردۂ ایمنی دادند۔ بر کارخانۂ دواب و بُنگۂ بارکہاراں (یعنی اسباب ایشاں) کہ اینہا را جز باطرافِ کاشانہ محل نیست، و بیشتر ازینہا طعمۂ آتش بلکہ افروزینۂ (ایندھن) آتش ہست۔ چہ گذشت؟ لیکن۔ چوں ارزشِ التفات از من سلب کردہ، ومرا اینک در دل فرود آوردہ اند کہ حالیا دراں گوشۂ خاطرم جاے نماندہ۔ ہرچہ گفتہ ام بطریقِ آرزوست نہ بسبیلِ سوال۔ والسلام

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوقِ ملاقات اور غزلِ تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے اسکے اوّل او آخر کے فقرے یہ ہیں "سحرگاہے کہ دلم از دردِ شانہ۔ چنانکہ مومنؔ[+] مہرپیشہ از رنجِ ہمسایہ درآزار باشد۔ بیقرار بود، و دستم از آشکارِ بیتابیِ دل رعشہ دار، فرخندہ سروشے از در درآمد، و سپردنِ بہارساماں نامۂ گل بجیبِ تمنا ریخت۔ ہرچند نامہ سپارہ مسِ امید را کیمیا،

+ دل کو مومن سے، اور شانہ کو ہمسایہ سے تشبیہ دی ہے۔

و دیدۂ جاں را توتیا آورد، و تارکِ اقبال را افسر، و پیکرِ آرزو را زیور بخشید، لیکن ازانجا کہ آں قدسی مفاوضہ از شعر و غزل۔ چوں نامۂ اعمالِ زاہد از ذکرِ مَے و شاہد۔ سادہ بود، دل سوادِ آں نیاسود، و خمارم بداں یک دو جرعۂ صہبا نشکست۔ بقیہ ہیئے ہیئے! نہ فسردۂ دیدارے کہ دل نشاطِ آں تواں بستن، و نہ کرشمۂ غزلے کہ لب بزمزمۂ آں تواں کشودن۔ + + + + + + + امید کہ ازیں بعد زود نہ دیر بانشاے غزل شادم فرمایند، و نویدِ کوتاہی نہادنِ روزِ فراق کہ اندریں موسم کہ خسرو انجم بہ اسدؔ[+] جاے دارد عجب نیست۔ بفرستند۔ دولت و اقبال روز افزوں باد۔

جواب نامۂ شیخ امیر اللہ سرورؔ تخلص "رسیدنِ دلنوازنامہ دل را تنومند و شاخِ آرزو را برومند ساخت۔ گلہ از نارسیدنِ پاسخِ نامہ ہاے خویش مے کنید، و از خدا شرم ندارید۔ من خود از جانبِ شما گرانی داشتم کہ کجائید؟ و چہ در سر دارید؟ بارے پردہ از روے کارِ شما برگرفتم، و دانستم کہ یک چند مرا فراموش کردہ بودید؛ ناگاہ ورودِ جناب مولانا تراب علی بداں بقعہ افتاد؛ شنیدید کہ فلانی (یعنی غالب) از سخت جانی ہنوز زندہ است؛ مہرِ کہن بجنبید، خواستید کہ بنامہ یاد آورید؛ از فراموشیِ روزگارِ گذشتہ اندیشہ کردید؛ لاجرم دروغے چند برہم بافتید، و آزادیبای دیباچۂ نامہ ساختید۔ از حالِ من پرسیدہ اید، چہ گویم کہ گفتن نیرزد، چنانکہ گفتہ اند

شکستہ دل ترازاں ساغرِ بلورینیم | کہ در میانۂ خارا کسی زند ورہا
خیرہ سر، و آشفتہ راے، نہ زباں سخن سراے، ونہ دل از سراسیمگی برجاے۔

+ یہ خط مرزا نے اس وقت لکھا ہے جب آفتاب برج اسد میں تھا۔ چونکہ اسد مرزا کا تخلص اور انکے نام کا جزو ہے اس لئے آفتاب کے برج اسد میں ہونے سے یہ شگون لیا ہے کہ ایسے وقت میں آپ کا مجھسے ملنا کچھ دور نہیں ہے۔

چہار سال می گذرد کہ مقدمۂ من باجلاسِ کونسل درپیش ست، و دلم از تفرقۂ بیم و امید ریش. حکمے کہ قطعِ خصومت تواند کرد، بنیامدہ، و ہنگام بپایاں رسیدنِ تیرہ شبِ ناامیدی درنیامدہ. حالیا براں سرم کہ چوں جزوِ اعظمِ کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ بہادر بدیں دیار درآید بدامنش درآویزم، و داد خواہم، و استدعائے صدورِ حکمِ اخیر کنم. گرد بے برآنند کہ نواب عالی جناب بدہلی نخواہد آمد، و ہم ازاں رہگذرہا باجمیر خواہد رفت. اگر ہمچنیں ست بدا من و روزگارِ من، و آہ و آخ از دوریِ راہ و درازیِ کارِ من.

خواستہ اید کہ نتائجِ طبعِ والائے شما بنگرم و از تراویدہ ہائے کام و زبانِ خود بشما ارمغانے فرستم. فرصتِ آں کجا؟ و دماغِ ایں کو؟ آمد آمدِ نواب گورنر، و دریوزۂ اخبار از ہر در، ترتیبِ افرادِ مقدمہ، و تمہیدِ نگارشِ حال، سنجیدنِ اندیشہ ہائے رنگا رنگ، و سگالیدنِ اندازہ بیاں. آں مایہ دستیاری و غمخواری از کسے چشم ندارم کہ چوں ورقے انشا کردہ باشم نقلِ آں تواند برداشت، یا چوں دفترے از بہرِ نگرستن پریشاں کنم آں اوراقِ پراگندہ را فراہم تواند کرد. بہر رنگ چند روز دگر معاف دارید، و تا زمانیکہ بمن پیوندید گاہ گاہ بنامہ زنگ زدائے آئینۂ وداد باشید + + + + +

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں اُنکو نواب امین الدین احمد خاں مرحوم کے باب میں جبکہ وہ رئیسِ فیروزپور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے کلکتے گئے ہیں، اِس طرح لکھتے ہیں، و مخدومِ غالب! اگر نہ اندوہِ سترگ بند بر دلم نہادہ بودے من

دانم و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد و در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد کردمے. صرفۂ شما (یعنی سو شما) در ناکامیِ من ست (جسکے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) ورنہ اگر تابِ توان داشتمے آں قدر با شما درآویختمے کہ شما را دامن و گریباں بزیاں رفتے، و مرا سر و رو شکستے. آخر از خدا بترسید، و از روے داد بسنجید کہ کارِ من و شما بداں رسد کہ روزہا بگذرد و بنامہ یاد نہ گردم. گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) کہ در بندِ گزارشِ اندوہے تازہ ام شکوہ کجا بخاطرِ ناشاد مے رسد. اگرچہ اندریں ورق گنجائیِ ایں دو سطر نیز نبود لیکن اندیشہ براں بسجید کہ مبادا دوستِ ادا ناشناسِ من مرا از خود خُرسند داند، و بدیں گماں از تلافی فارغ باشد و من زیاں زدۂ جاوید و گسستہ امید باشم.

بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعائے اصلی بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین احمد خاں بہادر ابنِ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ را ہماں موجِ بلا کہ زورقم شکستہ بود (یعنی تعدیِ رئیسِ فیروزپور) خانہ بسیلابِ فنا داد. خونِ وفایم بگردن کہ دریں سفر از ہمپائیش باز ماندم. واماندگی و بیچارگیِ من از ینجا تواں سنجید کہ دنداں بہ جگر نہم، و امین الدین احمد خاں را در سفر تنہا گذارم. اگر قاضیِ محبت بدیں جرم بر نطعم نشاند، و بہ تیغِ بے دریغ خونم ریزد، سزاوارم. و لطف دریں ست کہ ہر چند دریں باب بگفتار گرایم، و ہنگامۂ پوزش آرایم شرمساری بیشتر گردد، و خجلت افزاید. مگر سراج الدین احمد بتلافی برخیزد تا از گرانیِ تشویرِ شرمندگی سبکدوش گردم، و گردِ خجلت از چہرہ برافشانم. یعنی کمر بہ غمخواری و رہرو نوازی استوار

بندید، و خود را دست دیرینۂ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و غمگساری بجا آرید کہ ایں دردمند دور از خانماں (یعنی امین الدین خاں) اسد اللہ روسیاہ را فراموش کند، و شما را بجائے او داند۔ و نیز بہ برادرِ والا قدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد و شما را دریابد - داند کہ اسد اللہ پیش از و بہ کلکتہ رسیدہ است۔ قطع نظر ازیں مدارج کہ برشمردم - آخر خدائے ہست و دادے ہست۔ افسانۂ ناکامی و ستمکشیِ ایں فروغِ ناصیۂ سعادت یعنی امین الدین احمد خاں خارہ را دل بگدازد، و آہن را آب گرداند،،

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں " گوہرآگیں نامۂ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید، و دیدہ و دل را فروغ و فراغ بخشید۔ نارسیدنِ نامہ مرا با فسردگیِ شوق حمل کردید، چرا بہ مرگِ من حمل نکردید؟ تا از ادا شناسی ہائے شما خرسند بودمے، و شما را اہلِ دل و دانشور شمردمے۔ من دا ایمانِ من کہ رشتۂ مہرِ شما بہ مغزِ دل و دیدہ، و محبتِ شما با جاں در آمیختہ، تا زندہ ام، بندہ ام۔ وفا آئینِ من ست، و موتوٹ دینِ من ست۔ اگر در نگارشِ نامہ درنگے روے دہد بر فراموشی محمول نشود۔ دردہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر، و تفرقہ ہا در خاطر، و سوداہا در سر۔ چہ گویم چہ می کنم، در روز و شب چگونہ بسر می برم"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اسٹرلنگ صاحب فارن سکرٹری گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں " عمرِ من و جانِ من! پس از رسیدنِ گرامی نامہ در بندِ آں بودم کہ پاسخ گزارشوم و ماجرائے خود شرح دہم۔ ناگہاں دی کہ دوشنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود آوازہ در افتاد کہ مجموعۂ مکارمِ اخلاق را شیرازۂ وجود

از ہم گسیخت ؛ شمعِ ایوانِ سروری مُرد، و نہالِ باغِ آگہی را برگ و بار فرو ریخت۔ دستگیرِ واماندگاں را دست از کار رفت، و گرہ کشائے بستہ کاراں را ناخن بشکست۔ خاکم بدہن، چگونہ گویم؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ نمیداند؟ کہ مستر اندرو اسٹرلنگ مُرد، و از گیتی جز نامِ نیک با خود نبُرد۔ کاش رُوے گداختہ (پگھلی ہوئی کانسی) بروزنۂ گوشم ریختندے تا نشنودمے کہ چہ شد۔ اکنوں امید غمخواری از کہ بایدم داشت؟ و دل را بخیالِ گردشِ چشمِ کہ تسکین دادن؟ رپوٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر در خصوصِ دادخواہیِ من بہ صدر فرستادہ است۔ چگویم کہ چہ مایہ امید کاہ و اندوہ فزائے بودہ است تکیہ بر کارسازیِ آں چابک خرامِ بیدائے قضا (یعنی اسٹرلنگ) داشتم اکنوں از شش سو فلک بکامِ دشمن ست۔ زنہار در پاسخِ ایں نامہ درنگ روا مدارید، و بنویسید کہ آں والا گہر را چہ روے داد، و آں گلبنِ روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند، و پس از وے سرانجامِ دفتر کدہ چہ شد و جایش کہ گرفت۔ اللہ بس ماسوی ہوس۔

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں " والا نامہ رسید، و نویدِ فراقِ دائمیِ مرزا احمد رسانید۔ چہ مایہ سنگیں دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیتِ دوست انشا می کنم و اجزائے وجودم از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بدہلی می آیم؛ وعدہ فراموشِ بے مروت راہ گرداند، و تا خہ بسرمنزلِ دیگر راند۔ گرفتم کہ خاطرِ دوستاں عزیز نداشت، چرا بحالِ خُردسالانِ خود نہ پرداخت، و سایہ از سرِ شاں باز گرفت۔ وائے بے یاریِ یارانِ وے، و دریغا

بے پدریِ پسرانِ وے ۔ ہرچند از مرگ نتواں نالید، و گسستنِ تار و پودِ پندارِ ہستی را چارہ نتواں کرد۔ لیکن انصاف بالائے طاعت ست، ہنوز ہنگامِ مردنِ مرزا احمد نبود۔ چرا آں قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدے، و روئے نظارہ فروزش دگربارہ دیدے۔ چرا آں مایہ درنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے، و کارہا باندازۂ دانشِ وے رواں گشتے، حیف کہ ہمیں پسرش خردسال ست، و باشد کہ بہ حقیقت سرمایۂ پدر دانا، و بگرد آوردنِ زرہائے پراگندہ توانا، نباشد۔ و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ چنگ آرد بباد دہد، و بر فرودستانِ خود ستم کند، و کہیں برادراں را ناکام گزارد۔ ہر آئینہ دریں حال اینے باید ہوشمند و حق شناس کہ گرد چارہ برآید، و غمخواریِ بے پدر ماندگاں نماید۔ بلّٰہ دَرُّ من قال ؎

مرا باشد از دردِ طفلاں خبر
کہ در طفلی از سر برفتم پدر

واللہ کہ تیمارِ آں بیچارگاں عینِ فرض و فرضِ عین ست ہم بر شما و ہم بر مرزا ابوالقاسم خاں۔ بیکسیِ ایں جماعہ در نظر باید داشت و غافل نباید بود۔ اِن اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اِس طرح کرتے ہیں

"زینہار صدر زینہار اے مولوی سراج الدیں! بترس از خدائے جہاں آفریں۔ کہ چوں قیامت قائم گردد، و آفریدگار بنشیند، من گریاں و موئیہ کناں دراں ہنگامہ آیم، و در تو آویزم، و گویم کہ ایں آنکس ست کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت، و دلم برد، و چوں من از سادگی بروفا تکیہ کردم، و ایں را از دوستاں برگزیدم۔ نقش کج باخت، و بمن بیوفائی کرد۔ خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟ وائے بر من کہ روزگارہا

گذرد و خبر ندانستہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا بپاداش وفاست بسم اللہ ہر قدر توانی بیفزائے۔ کہ اینجا مہر و وفا فراوان ست، لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد۔ و اگر خود ایں تغافل بہ بادافراہ (یعنی بپاداش) جرمے دیگرست بخت گناہ را خاطر نشانِ باید کرد، و آنگاہ انتقام باید کشید، تا شکوہ درمیاں نہ گنجد، و مرا زہرۂ گفتار نباشد۔ ستم کہ معاشِ من از گونہ گوں رنج و رنگ رنگ عذاب بہ معادِ کفار ماند، خوں در جگر، و آتش در دل، و خار در پیراہن، و خاک بر سر، ہیچ کافر بدیں روز گرفتار مباد، و ہیچ دشمن ایں خواری مبیناد۔ راست بہ تنہا روی مانم کہ در صحرا پایش بگل فرو رود، و ہرچند خواہد کہ بالا جہد نتواند و فرو تر رود۔ والا قدر نواب امین الدین احمد خاں بہادر گیتی را بر رویش دیدمے، و وصالش را زندگی دانستمے، بہ کلکتہ رہگرا شد۔ دیگر زندگی از بہر کہ خواہم و دل را بدیدارِ کہ شادماں دارم۔ واماندگیِ من از ینجا تواں سنجید کہ نتوانستم ہمپایش کردن، و در وا داشتم او را تنہا گذاشتن +

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمہ کے بگڑ جانیکا حال اسطرح لکھتے ہیں

"کارِ من بہ داد گاہِ دہلی۔ چنانکہ دانستہ باشید۔ تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد باز بداں در (یعنی در سپریم گورنمنٹ) رسم، و درد دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ فغان ہوا و ماہیانِ دریا را بر خود بگریانم۔ ہیہات! اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ ہم بدیں تفریق۔ از روئے دفترِ سرکار ثابت شدہ بودے بایستے کہ صاحبانِ صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش، آنچہ تو بازیافت وانمودہ یافتنی از اں افزوں تر

نیست، وقرار داد نیز ہماں ست۔ لاجرم دیوانہ بودمے اگر دریں کشور باز آمدمے، وبا یک قبیلہ (یعنی با جمعے کثیر) کہ خویشاں و برادران من اند۔ بستیزہ برخاستمے۔ وبہ باطل ستیزی نام برآوردمے + + + + + + +

چکنم کہ کار برگشت، وروزگار برگشت۔ خدارا بنگر، وبہ دردِ دل من وارس۔ کولبرگ بتوسط کرنیل ہنری املاک برمن مہرباں شود، وریوٹے کہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید۔ بصدر فرستد، وجوابے کہ سودمند تر ازاں نتواں سنجید۔ از صدر حاصل نماید؛ ہنوز آں جواب درراہ باشد کہ کولبرگ معزول گردد۔ وہاکنس۔ کہ بجاے کولبرگ نشیند۔ آنچہ برہم زدن ہنگامۂ سلطنتے رابس باشد۔ ازبہرمن بصدر نویسد، ومن دراں داوری (معاملہ) از مسٹر اسٹرلنگ چشم یاوری داشتہ باشم؛ ہنوز آں رپوٹ بصدر نرسیدہ باشد کہ مسٹر اسٹرلنگ رہرو راہ عدم گردیدہ باشد۔ چوں از ہمہ بگسلم، وبدامن جارج سوئٹین بہادر آویزم، گرم از جا برخیزد؛ ودامن بر شغل جہانبانی افشاند۔ سبحان اللہ! معزول نگردد مگر کولبرگ، برگ ناگاہ نمیرد مگر اسٹرلنگ بولایت نرود مگر جارج سوئٹین؛ درخور ایں صدمہ ہاے جاں کاہ نباشد مگر اسداللہ داد خواہ + + + + + + + + + + +

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط " دلنواز نامہ پس از عمرے رسید، وعمرے دیگر بخشید؛ تا عمر باندوہ سپری شدہ را تلافی تواند کرد۔ اما شاد کردن وے کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشند نہ آسانست۔ منم کہ چوں نامۂ شما رسیدے مستانہ از جاے برجستمے، وجہاں جہاں نشاط اندوختمے۔ اینک تا چشم بسواد ایں صحیفہ دوچار شد گیتی

در نظرم تیرہ وتار شد۔ نخست آنچہ بنظر درآمد خرد آشوب خبرے بود کہ دل تا جگر خوں کرد۔ یعنی از جہاں رفتن خواہر عزیز شما۔ ہے ہے! ایں مخدومۂ مرحومہ ہماں ست کہ تا در کلکتہ خبر رنجوری وے شنودہ بودید دل از دست رفتہ بود، وسراسیمگی سراپاے خاطر را فروگرفتہ در نظر دارم کہ از مردنش بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد۔ توانا ایزد پاک شمارا شکیب عطا فرماید، وتنومندی دل وتوفیق ثبات ارزانی دارد، وایں سانحہ را در روزنامۂ عمر شما خاتمۂ مکارہ ومقطع مصائب گرداند۔

آشکارا شد کہ مخدوم مرا از علاقۂ تازہ خشنودی نیست۔ ہر آئینہ انکشاف ایں معنی غبار ملال بردل فرو ریخت۔ خدارا دلتنگ نتواں شد، وکلکتہ را غنیمت باید پنداشت۔ شارستانے (معمورہ) بدیں تازگی در گیتی کجاست۔ خاک نشینی آں دیار از اورنگ آرائی مرز بوم دیگر خوشتر۔ من وخدا کہ اگر متاہل نبودمے، وطوق ناموس عیال بگردن نداشتمے؛ دامن بر ہر چہ ہست افشاندمے، وخود را دراں بقعہ رساندمے۔ تا زیستمے دراں مینوکدہ بودمے؛ واز رنج ہواہاے ناخوش آسودمے۔ زہے ہواہاے سرد، وخوشا آبہاے گوارا، فرخا بادہ ہاے ناب، وخرما ثمرہاے پیش رس۔

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعے کا قطعۂ تاریخ لکھکر بھیجا ہے اور انھوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح وستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے۔ جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گذرا ہے تو اُسکا شکریہ اور

ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے "دو گنامے را نامور ساختن، و ہیچ را ہمہ پنداشتن، عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ، خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روے نماید، وآں بزرگ مرحمت بے استدعاے سائل بظہور آید۔ نگرندہ اگر دیدۂ حق بیں دارد۔ بنگرد کہ واجب تعالےٰ شانہٗ اجزاے ممکنہ را۔ کہ در کتم عدم متواری بودہ اند بمحض عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ، و بداں معدومات منّت نہادہ۔ حقا کہ اگر تاملے بسزا کردہ شود رقم گشتن قطعۂ تاریخ در آئینۂ سکندر ازیں عالم خبر می دہد۔ وچوں ناخواستہ اینچنیں نوازش بمیاں آمد۔ ہر آئینہ روائیِ خواہش را چگونہ چشم نتواں داشت۔ لاجرم در گزارشِ مدعا فصلے بمیاں نہادہ آرزو را سر انجام گفتگو دادہ می شود۔

نہفتہ مباد کہ قدر شناسیِ حکام رنگِ آں ریخت کہ فاضلِ بے نظیر و المعیِ یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داریِ عدالتِ دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار رہا نید۔ حقا کہ اگر از پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک واماند، و باز آں پایہ را بسر رشتہ داریِ عدالتِ دیوانی سنجند، ہنوز ایں عہدہ دونِ مرتبۂ وی خواہد بود۔ بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خاں (رئیسِ جھجھر) پانصد روپیہ ماہانہ براے مصارف خدامِ مخدومی معین کرد و نزدِ خود خواند۔ روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت ولیعہد خسرو دہلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر مولانا را۔ تا پدرود کند۔ سوے خود طلبید، و دو شالۂ ملبوسِ خاص بدوشِ وے نہاد، و آب در دیدہ گردانید، و فرمود کہ "ہرگاہ شما می گوئید کہ من

رخصت می شوم۔ مرا۔ جز اینکہ بپذیرم۔ گریز نیست۔ امّا ایزدِ دانا داند کہ لفظِ وداع از دل بزباں نمی رسد اِلّا بصد جرِ ثقیل"۔ تا اینجا سخن ولیعہد بہادر ست۔ غالب مستہام از شما می خواہد کہ واقعۂ تودیعِ مولوی فضلِ حق، و اندوہ ناکیِ ولیعہد بہادر، و بدرد آمدنِ دلہاے اہلِ شہر بعبارتے روشن و بیانے دلاویز در آئینۂ سکندر بقالبِ طبع در آرید، و مرا دریں تفقد منّت پذیر انگارید۔ والسّلام

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب نشاں دیں جس سے انکے مفصل حالات معلوم ہوں۔ نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لئے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے اُسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"ہر نسیمے کہ زکوے تو بجانم گذرد ۔ یادم از ولولۂ عمرِ سبکبار دہد

رسیدنِ مہر افزا نامہ دل بُرد، و جاں بخشید۔ اگرچہ آں جاں با من نماند، و ہم بر سرِ آں نامہ بفشاندن رفت، لیکن سپاسِ دلربائی و جاں بخشی باقی ست۔ امید کہ تا جانِ بخشیدۂ یزداں در تن ست گزاردہ آید۔

مخدومِ من در رسیدن نامۂ پیشیں (دو دل و متردد) چرا ست؟ ہنوزم نشاطِ ورود آں نمیقہ در دل، و سوادِ سطورِ آں صحیفہ در نظر جا دارد۔ چوں فرماں چناں بود (یعنی در نامۂ پیشیں) کہ غالبِ خویشتن نشناس۔ لختے از رسم و راہِ سترگانِ پارس برگوید، و کتابے ازاں گروہ نشاں دہد کہ رازِ آں دیریں کیش، و سازِ ایں باستانی زباں۔ ازاں اوراق

تواں یافت، لاجرم دانشِ من (علمِ من)، اندازۂ سرانجامِ پاسخِ آں برتافت (تحمل نکرد) چوں دوبارہ گفتند کہ خواہش چنیں ست۔ ناچار مُہرِ خموشی از دہاں و پردۂ شرمِ نادانی از میاں برداشتہ میگویم کہ روائیِ ایں خواہش از ہیچکس چشم نتواں داشت، و خود را بہ بندِ ایں پژوہش و تلاش خستہ نتواں کرد۔ نگارندۂ دبستانِ مذاہب با اینہمہ لافِ آشنا روئی (واقفیت) آنچہ میگوید نہ ہمہ است و نہ ہمہ بر جای خود ست (یعنی نہ مکمل ست و نہ سراپا صحیح ست) پارسیانیکہ در صورتِ بمبئی آشیاں دارند۔ زینہار گماں نبری کہ از آں گروہ (یعنی از اَختر گانِ پارس) جز نامِ نشاں دارند۔ آں پویہ و آں ہنجار (یعنی آں روش و آں طریق) و آں نگارش و آں گفتار ندانند، و جز تخمہ و نژاد از روے شیوہ پارسیاں نمانند۔ پارسیاں از گرانمایگانِ روزگار، و برگزیدگانِ دادار بودہ اند، و بہ روزگارِ فرمانروائیِ خویش دانشہاے سودمند (علومِ مفیدہ) و کُنشہاے خرد پسند (اخلاقِ پسندیدہ) داشتند۔ گشایشِ رہ از خراشِ ہفت سپہر، و نمایشِ اندازۂ گردشِ ماہ و مہر، پدید آوردنِ رخشندہ گہرہا از تہِ خاک، و بدر کشیدنِ بادۂ ناب از رگِ تاک، پژوہشِ اسبابِ خستگی و رنجوری، و گزارشِ احکامِ پزشکی (طبابت) و چارہ گری، پردہ کشائیِ فہرستِ اسرارِ کیائی (سلطنت) و فرماندہی، و رصد بندی، تقویمِ آثارِ بندگی و فرمانبری، عنوانِ بیک دگر بستنِ رنگ رنگ گہرہا، و ہنجارِ سرہ کردنِ گونہ گوں ہنرہا، دارو گیاہا فراخورِ ہر درد بکار اندر آوردن، و پرندگانِ ہوا و درندگانِ دشت را نشکار اندر آوردن، بکوتاہیِ سخن۔ والائیِ اندازِ ہر گونہ بینش، و پیدائیِ اندازۂ کمالِ آفرینش، ہمہ در آئینۂ اندیشہ ایں فرزانگاں روے نمودہ۔ و انگیزشِ شائستگیِ گفتار و کردار۔ کہ اکنوں بہ اندکے ازاں بسیار نازند۔ از مغزِ دانشِ ایں فرہنگیاں بودہ است۔

گنجینہ خسروانِ پارس را از ہر علم دفترے بود، و ہر دفتر از گرانمایگی گنجِ گوہرے۔ چوں دولت ازاں طائفہ روے برتافت، و سکندر ابنِ فیلقوس بر ایراں دست یافت، کتبِ خاصۂ خسروی بتاراج رفت۔ اما آنچہ پراگندہ بود و گمنامان بہر گوشہ و کنار داشتند۔ بر جا ماند۔ تا بروزگارِ پیروزیِ تازیاں دراں کشش و کوشش از ہر جا گرد آمد (فراہم آمد) و بفرمانِ خلیفہ۔ افروزیۂ گلخنِ گرمابہاے (حمامہاے) بغداد شد۔ ہانا احکامِ آذر پرستی ہم بآذر باز گشت۔ زباں آورانِ عرب پارسی را بتازی آمیختند، و زبانے تازہ برانگیختند۔ اکنوں کیست تا بداں زبانِ کہن سخن درست تواند گفت، و ازاں دیریں آئیں براستی خبر تواند داد۔ پژوہندۂ ایں راز را کامِ دل برنیاید؛ و من ضامن کہ ہر چہ پس از فراواں جستجو فراہم آرد۔ نہ آنچناں باشد کہ دل بداں تواں نہاد۔

دیگر آنچہ کلکِ مشکبار بداں رفتہ کہ نتیجے از گفتارِ ناروائے خود برنگارم، و لختے از ماجرائے خود برگزارم۔ اندیشہ را بہ لب گزیدن و خرد را بہ تنگفت زار (در محلِ تعجب) افگند۔

چگویم از دل و جانے کہ در بساطِ من ست　　ستم رسیدہ یکے ناامیدوار یکے

ازچہ بداں ارزم و مرا ایں پایہ از کجا باشد کہ ستودگاں مراستایند، و گفتارِ مرا در تذکرۂ شعرا جا دہند۔ از فرجامِ فرہمندیِ ہستی (یعنی از شان و شکوہ ہستی) و سر و برگِ پیدائی۔ کہ نزدِ آشکارا بیناں زود زوال، و بوالا دیدِ یکتا گزیناں (یعنی قائلانِ وحدتِ وجود) نمودِ بے بود ست۔ آنچہ بمن دادہ اند زبانے ست یا فہ سرائے و خامہ ایست بیہودہ پوئے۔ من ہم از بے مایگی چوں کودکاں کہ درم از سفال سازند و بہ گنجینہ داری نازند۔ سرودۂ زباں

وبیہودۂ خامہ را (یعنی کلامِ خود را) پارہ پارہ بہم بستہ وریزہ ریزہ یکجا کردہ، بگمانِ نام آوری
کہ دل از تابِ اندوہ وناروائی آں خوں ست - دیوانے ترتیب دادہ جابجا بنظرگاہِ التفاتِ
یاراں فرستادہ ام - بزرگانے کہ بہ پرسشِ غالب مستمند روے آرند - سوادِ ہر غزلے کہ
خواہند ازاں اوراق بردارند، کہ انتخاب والتقاطِ اشعار حوالہ بہ راے نامہ گرد آور (یعنی
مؤلفِ تذکرہ) است، نہ باشارہ وایماے سخنور + + + + + + امّا اگر گزارشِ حالِ سخنور
ہوس ست، خود ایں مایہ بس ست کہ چوں در جریدۂ آں فن از من سخن رانند سخن را
درستایشِ من بدیں گونہ بہ کرسی نشانند کہ از ناکسانِ روزگار وبیکسانِ دہلی دیار مسلمان زادہ
ایست کافر ماجرا، وگبریست مسلماں نما، کہ از غلط نمائی غالب تخلص میکند وبدیں ننگ
نازش می نماید۔

خرسندیِ غالب نبود زہیمہ گفتن — یک بار بفرماے کہ اے ہیچکسِ ما

پنہاں نماناد کہ در اصلِ آفرینش از دودۂ روز فروزتگان، وحلقہ بخت برگشتگانِ ستم رسیدہ
وروے بہی نادیدہ کسم؛ آرایشِ سخن پیشکش (یعنی برطرف) ترک نژادم، ونسبِ من
بافراسیاب وپشنگ مے پیوندد. بزرگانِ من از انجا کہ باسلجوقیاں پیوندِ ہم گوہری داشتند،
وبعہدِ دولتِ ایشاں رایتِ سروری وسپہبدی افراشتند. بعد سپری شدنِ روزگارِ جہانبانیِ
آں گروہ (یعنی سلجوقیاں) چوں ناروائی (کساد بازاری) وبینوائی روے آورد - جمعے را
ذوقِ رہزنی وغارتگری از جاے برد، وطائفہ را کشاورزی پیشہ گشت. نیاگانِ مرا بہ
توراں زمیں - شہرِ سمرقند آرامگاہ شد. ازاں میانہ نیاے من از پدرِ خود رنجیدہ آہنگِ ہند

کرد، وبلاہور ہمراہیِ معین الملک گزید. چوں بساطِ دولتِ معین الملک در نوشتند -
بدہلی آمد، وبا ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر پیوست. زاں پس پدرم عبداللہ بیگ
خاں بشاہجہان آباد بوجود آمد، ومن بہ اکبرآباد. چوں پنج سال از عمرِ من گذشت - پدر از
سرم سایہ برگرفت. عمِّ من نصراللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا بناز پرورد، ناگاہ مرگش
فراز آمد. کما بیش پنج سال پس از گذشتنِ برادر پے ہمیں برادر برداشت، ومرا دریں
خرابہ جا تنہا گذاشت. وایں حادثہ کہ مرا نشانۂ جاں گدازی وگردوں را کمینہ بازی بود
درسالِ ہزار وہشت صد وشش عیسوی بہنگامِ ہنگامۂ لشکر آرائی وکشورکشائیِ صمصام الدولہ
جرنیل لارڈ لیک بہادر بروے کار آمد. چوں عمِّ مرحوم از دولتیانِ دولتِ اہلِ فرنگ، وبا
انبوہیِ چار صد سوار برکابِ صمصام الدولہ، با سرکشاں سرگرمِ جنگ بود، وہم از بخشش ہاے
سرکارِ انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافاتِ اکبرآباد بہ جاگیر داشت - سپہ سالارِ سرکارِ
انگلشیہ بہ خوں بہاے آفتاب (یعنی نصراللہ بیگ خاں) کلبۂ تارِ گدایاں را چراغ، وما
بینوایاں را بعوضِ جاگیر بمشاہرہ از خارخارِ جستجوے وجہ معاش فراغ بخشید تا امروز
کہ شمارۂ نفس شماریِ زندگانی بہ چہل وچار میرسد - بداں راتبہ خرسندم، وبداں مایہ قانع
در سخن از پرورش یافتگانِ مبدأ فیاضم، وسوادِ معنی را بفروغِ گوہرِ خویش روشن کردہ ام
از ہیچ آفریدہ حقِ آموزگاریم بہ گردن، وبارِ منتِ رہنمائیم بر دوش نیست -

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم — زاں رو بصفای دمِ تیغ ست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر — شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلمم

نامہ بپایاں رسید، و شرمِ پراگندہ گوئی و درازنفسی برمن استیلا کرد. دیدہ وراں دانند کہ گفتنی فراواں بود، وافسانہ پریشاں؛ تا کجا اندک گفتمے، وگفتار را از درازی نگاہ داشتمے. مرا در آنچہ رفت گناہے نیست. واگر خود گناہ است، دوست کریم ست وکرم عذرخواہ. والسلام

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے باپ رائے چھجمل دہلوی نے مرزا کو جبکہ وہ کلکتے میں ہیں ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسندنشین ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اسکی جبلت میں ہے۔ اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "دا ایکہ گفتی فلانی روشِ حکیمانہ دارد، و دنیا را کار آگاہانہ می گذارد۔ با ایں ہمہ اندوہنا کی خندہ ام درگرفت، و عنانِ ضبطِ خویش از کفم بدر رفت. ندانی کہ بر اسپانِ بادرفتار برنشستن، و گروہا گروہ مردم را پیشاپیش دوانیدن، تن را بلباسِ زنگارنگ برآراستن، و معدہ را بہ الوانِ خوردنیہا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بیروں راندن، و غبارِ معصیت بر فرق افشاندن، از حکما نیاید؛ و بزرگاں را نشاید. کار دانشوراں چیست؟ در زاویۂ آبادی در بن کوہے نشستن، و از شش جہت در بروے خلایق بستن، تن را بریاضت فرسودن، و جاں را بہ بیخودی پالودن. ہر کہ حکیم خردگزین ست کار و بارش این ست. بے برگ و نوائے از شکنجۂ گوناگوں حسرت بدرجستہ بہ فراخ نائے سرخوشی (مستی) رسیدہ است؛ از کجا کہ آزادہ رو و بالطبع کریم بود. ہنوز آدعیۂ منی از ریاح غلیظۂ صالحۂ کبدیۂ ممتلی دارد؛ ہر آئینہ بفرمانِ باد ست. روزے چند باش تا بنگری گرہ بر کیسۂ زرزناں، و در حسرتِ زرِ تلف کردہ زاری کناں. ایں کہ فلاں و بہماں را از نزدِ خویشتن راندہ است۔ حقا کہ روے در مصلحتے

نداشت، و ہر چہ کرد از بیخردی و ابلہی کرد. چہ۔ اگر دانا بودے، و خرد داشتے۔ آناں را کہ راندہ است نہ راندے، و کار ہا از آناں گرفتے. و ایناں را کہ با خود در یک پیرہن جا دادہ است۔ چوں غبار از دامن افشاندے؛ و ہرگز بہواے ایناں نرفتے. کودکی و بیجا اصلی ورزید؛ مگر در ایامِ صاحبزادگی و ولیعہدی از آناں دلے پُر داشت، و با ایناں لختے رام بود. از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن، و در دامِ ایناں بدیں کوری در آمدن۔ نہ بفرمانِ دانش است نہ بفرمانِ بینش؛ حکیم کرا میگوئی؟ و کرم پیشہ کرا میخوانی + + + + چوں سخن دریں باب بسیار ست نامہ بدعا ختم می کنم. دیدہ را بینشے درست و دل را دانشے سودمند روزی باد.

مولوی محمد علی خاں صدر امینِ باندہ جن سے مرزا باندے میں ملکر کلکتے روانہ ہوئے ہیں۔ کلکتے میں پہنچکر انکو سفر کی تمام روئداد لکھی ہے اسکے آخر میں لکھتے ہیں "در روز پنجشنبہ چارم شعبان پارۂ از روز برآمدہ در کلکتہ رسید. غریب نوازیہاے وہابِ بے منت را نازم کہ در چنیں دیار خانۂ چنانکہ باید، و ہر گونہ آسایش را بکار آید؛ ہم اورا باندازۂ فراغ خاطرِ آزادگاں ففضائے، و ہم اندر و مانند دہانِ آز دنیا طلباں بیت الخلائے؛ در گوشۂ صحن پر از آبِ شیریں چاہے، و بر طرفِ بام در خورِ اہلِ تنعم آرامگاہے۔ بے آنکہ جستجوئے رود، یا گفتگوئے شود بمنت و بے زحمت بکرایۂ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسید؛ و آدم و چارپا را تکیہ گاہِ آرامش گردید. و بہ نور از رنجِ راہ آسودہ منشورِ لامع النور (یعنی سفارش نامۂ مولوی محمد علیخاں) را شعلِ راہ مدعا ساختم، و در کشتی نشستہ آہنگِ ہگلی بندر کردم. بلطفِ ملاقاتِ نواب علی اکبر خاں طباطبائی اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد۔ رواست؛ و اگر گویم کہ مرا برمن برشک آورد نیز جا دارد. بجذبکہ

خرد آفریدہ و خرد دور برگزیدہ - بدیں گرانمایگی و صاحبدلی در بنگالہ دیگرے نخواہد بود. یارب ایں گوہر گرامی از کدام کان ست، وایں گرامی گوہر (گرامی ذات) از کدامیں دودمان. بارے چوں نخستیں صحبت بود۔ بچارہ جوئی و مصلحت پرسی در دِسر ندادم، دو دو سہ ساعت نشستہ بتعمدہ باز آمدم. آوخ (افسوس) کہ دریں روزہا نواب را با حکامِ ہگلی درخصوصِ زمینے کہ وقفِ امام باڑہ است معارضہ درپیش و دل سرگرمِ فکرِ کارِ خویش ست. وللہ در القائل.

همہ را ماتمِ حسرتِ دنیا دیدم چوں بعشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم

روزگار فرمانبر و بخت فرماں پذیر باد.

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں "از نوادرِ حالات اینکہ سخنوراں و نکتہ دانِ ایں بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزمِ سخنے آراستہ بودند. درہر ماہِ شمسی انگریزی روزِ یکشنبہ نخستیں سخنگویاں در مدرسۂ سرکارِ کمپنی فراہم شدندے، و غزلہائے ہندی و فارسی خواندندے. ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است دراں انجمن می رسد، و اشعارِ مرا شنودہ ببانگِ بلندی می ستاید، و بر کلام نادرہ گویانِ ایں قلمرو تبسم ہائے زیرلبی می فرماید. چوں طبائع بالذات مفتونِ خودنمائی ست ہمگناں حسد می برند، و کلانانِ انجمن و فرزانگانِ فن بردو بیتِ من اعتراضِ نادرست برآوردہ آں را شہرت می دہند. وبے آنکہ مرا زباں بپاسخ آشنا شود - از دانشوراں - کہ مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خاں و مکرمی مطاعی مولوی محمد محسن از آنانند - جوابہا می یابند، و پسِ زانوے خموشی مے نشینند. چنانچہ ہم

بہ فرمانِ ایں دو بزرگوار مثنوئے انشا کردہ ام، و بعد از اظہارِ عجز و انکسارِ خویش جوابہائے اعتراض دراں ابیات موزوں ساختہ؛ و آں مثنوی (یعنی مثنوی بادِ مخالف) پسندیدۂ طبعِ عالمے افتادہ است. انشاء اللہ العظیم زیں بعد عریضہ کہ بہ والا خدمت خواہد رسید ورقے ازاں ابیات در نوردِ آں خواہد بود"

نواب ضیاء الدین احمد خاں اکبرآباد گئے ہوئے ہیں مرزا انکو اپنے قدیم وطن اکبرآباد کی یاد میں دلّی سے اس طرح لکھتے ہیں "جانِ برادر! اشک و آہِ غالبِ نامراد، یعنی آب و ہوائے اکبرآباد بہ شما سازگار باد. گرفتم کہ خود را بسفر گرفتہ (یعنی فرض کردہ اید) و نزدِ خود (یعنی بدانستِ خود) از من دُور تر رفتہ آید؛ اما چوں ہنوزم در وطنید، ہمانا کہ نزدیک با منید. شادم کہ شوقِ دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر با شما فرستاد تا ہمدریں غربت (یعنی در دہلی) دادِ شادمانیِ دیدارِ وطن نیز توانم داد. زینہار اکبرآباد را بچشمِ کم (یعنی بچشمِ حقارت) ننگرید، و از رہگذرہائے آں دیار الحفیظ گوی، و الاماں سرائے، نگذرید، کہ آں آباد چہ ویرانہ وآں ویرانہ آباد بازی گاہِ ہمچو من مجنونی، و ہنوز آں بقعہ را در ہر کفِ خاک چشمۂ خونی ست. روزگارے بود کہ دراں سرزمیں جز مہرگیا (نام رستنی) نرستے، و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے. نسیمِ صبح دراں گلکدہ (یعنی آگرہ) بہ مستانہ وزیدن دلہا را آں مایہ از جا برانگیختے (یعنی بشورش آوردے) کہ رنداں را ہوائے صبوحی از سر، و پارسایاں را نیتِ نماز از ضمیر فروریختے. ہر غنچہ ہر ذرۂ خاکِ آں گل زمیں را از تنِ پیامے بود دلنشیں، و ہر برگِ آں گلستاں را از جانِ دردے بود خاطرنشاں؛ اما تازگیِ وقتِ شما را در نظر داشتہ درد و پردۂ شورش انگیختہ بود،

دعائے"

وچشم براہ داشت کہ کے نویسند، ودریغ کہ ہیچ گاہ ننوشتند کہ رخش سنگین (یعنی اسپِ سنگیں کہ در اکبرآباد معروف است) دعاے مرا بکدام ادا پذیرفت؟ ودریا بپاسخِ سلامِ من بزبانِ موج چہ گفت؟

نواب عبداللہ خاں صدر الصدر میرٹھ برادرِ نواب محمد سعید خاں مرحوم رئیس رام پور نے مرزا کو لکھا ہے کہ رئیس ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھو مگر اُس زمانے میں مرزا پریشاں بہت ہیں اسلیے اُنکے جواب میں لکھتے ہیں "خدامِ بلند مقام کہ سرانجامِ قصیدہ از غالبِ بے نوا چشم داشتہ اند مگر آں فرسودہ روانِ افسردہ دل را۔ کہ ہنوز نمردہ است۔ زندہ پنداشتہ اند۔

گمانِ زیست بود بر منّت ز بیدردی — بدست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

کاش گشایشِ ایں کار چوں صنعتِ نقاشی وگلدستہ بندی تنہا بکوششِ دست وبازو صورت بستے، تا چشم از خستگیِ دل پوشیدمے، وفرماں پذیرانہ در پردازشِ کار کوشیدمے۔ چہ کنم چوں سرِ ایں رشتہ در دستِ دل ست۔ تا دل بر جاے نباشد زباں سخن سراے نباشد۔ دیدہ وراں صاحبدل دانند کہ چہ قدر ہا دیدہ ودل بہم آمیختہ شود، تا نقشے۔ بداں نشگرفی کہ بالغ نظراں پسندند۔ انگیختہ شود۔ ایں دلِ شکستہ بہم نہ پیوستہ۔ کہ در سینۂ من، وہمانا دشمنِ دیرینۂ من ست۔ زنہار بکارِ سخن گستری نیاید، ومعنی آفرینی را نشاید + + +

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے کچھ غزلیں اوّل ہی مرتبہ اصلاح کے لئے بھیجی ہیں اُسکے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں "خواہشِ حکّ واصلاح مہر افزود۔ چندانکہ دیدہ بداں سواد دوختم تازیبا صورتے بنظر در نیامد، ہنجار ورَوِش خود از نیروہاے درونی ست۔ آرے

نے خامہ در بنانِ ہر کس خرامے دیگر دارد۔ آموزش را دریں پردہ راہ نیست، واگر گویند ہست، ہر آئینہ مے توانم گفت کہ نیست مگر بہمنشینی وہمزبانیِ آموزگار، وبسر بُردنِ روزگار در سرہ کردنِ گفتار۔ چوں صحبت صورت ندارد، وگفتہ آمد کہ ہرچہ بہر نمط گفتہ اند نہ غلط گفتہ اند می باید حلقہ بردرِ دل زد، وہمت از مبدا فیاض دریوزہ کرد۔ بکثرتِ مشق، وفراوانیِ ورزش وپیرویِ راہروانِ راہ داں، کشایش ہا روے خواہد نمود، واندیشہ را دستگاہ وگفتار را سرمایہ خواہد افزود"

مولانا فضل حق مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے سب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اُسکی داد چاہی ہے وہ خط بجنسہ لکھا جاتا ہے "سبحان اللہ! باآنکہ از فرامش گشتگانم، ودانم کہ دوست مرا بہ دو جَو بلکہ بہ نیم خَس برنگیرد۔ ہرگاہ بساز دادنِ آہنگِ گلہ روے آرم، وسنجم کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، واز قہرماں اندیشہ دُور باشے (یعنی امتناعے) درمیاں نیست۔ ہر آئینہ۔ بدیں شادمانی کہ ہنوزم با دوست روے سخنے ہست۔ آنچناں برخویشتن مے بالم کہ غمِ جاں گدازِ فراموشی فراموش، ولب از زمزمہ کہ دل در بندِ سرودنِ آنست (یعنی شکایت) خاموش می گردد۔

ازخویشتن بذوقِ جفا با تو ساختیم — باما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روزہا ہواے آں در سر افتاد کہ بیتے چند در توحید مجیباً لعرفی گفتہ آید۔ چوں کوششِ اندیشہ بجاے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند، ونہ مرا جاے۔ تا گزیر آں ابیات را بکسے

عرضہ میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بہ سخن پرورش تواند کرد، و پایۂ ہر یک بہر یک تواند نمود۔ والسّلام

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجائے خود ایک دفترِ طویل الذیل ہے کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کر کے لکھی ہیں اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں سے انتخاب ہو سکتے ہیں مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اس لئے ہم اسی قدرِ قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِس انتخاب کے بعد ہمکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے اُن مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں چند مخصوص کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اِس طرح کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحد المضمون پائی جائیں اُنکو ایک دوسرے کے محاذی لکھدیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا۔ کہ کون سا بیان کس پایہ کا ہے اور کون سا کس درجے کا۔ ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر اور مہر نیمروز سے نقل کرتے ہیں ظہوری نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں جن میں سب سے اوّل معرفتِ الٰہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں اُنکو پادشاہی اور درویشی کا

جامع قرار دیا ہے اور مثل ظہوری کے نظم و نثر دونو میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ چنانچہ ہم دونو کتابوں سے وہ مقامات مقابل یکدگر نقل کرتے ہیں۔

ظہوری	غالب
تا جداریِ لفظ و معنی بہ حشمتِ ثنای تارکِ آرائیست	از انجا کہ بعدِ ہر دَور طورے دیگرست، و پس از ہر انجام
کہ سمیِ خلیلِ خود یعنی ابراہیم عادل شاہ را در ہفت اقلیم	سرانجامے جداگانہ؛ در ہر عہد عہد اسمے دیگرست
بہ نُہ صفت یگانہ و ممتاز گردانیدہ اول معرفت	(یعنی اسمے دیگر از اسماے الٰہی) و در ہر وقت وقتے
کہ با وجود حُجُبِ کثرت در مشاہدۂ شاہدِ وحدت۔	کشایش طلسمے دیگر۔ فرۂ ایزدی (شانِ الٰہی) کہ جیدے
معنی کلام معجز نظام "لو کُشِفَ الغِطَاءُ مَا ازدَدتُ	را بنام آوریِ شکوہِ عز و غنا از سیاوخش دیدے، و آندے
یقیناً"، وصفِ حالِ او ساختہ، گلستانِ نیت	را بہ نشانمندیِ فقر و فنا فروغ بخشیدے۔ مظہرے
و بوستانِ عقیدتش از خس و خاشاکِ شک و شبہہ	کامل و مرآتے۔ و شن خواست تا دراں مظہرِ ظہور
پرداختہ مجموعۂ عرفانِ موحداں فردے از	ہر دو رنگ، و دراں مرآتِ رُویتِ ہر دو صورت یکبارہ
دفترِ ستائش، عُنفُ واشتُلم ماسوے	رو دہد۔ اورنگ و منبر یکے شد، دو سادۂ مسند و سجادہ را
پسندیدۂ طبعِ مُواسایش۔ بہ توضیحِ بیانش	دوئی از میاں رفت۔ درفشِ کاویانی (کہ نشانِ پادشاہی
فنا نماے بے نشاں (یعنی ذات بی نشاں)	ست) از عصا و ردا (کہ ہر دو شعارِ درویشان ہر دو
ہمہ دلنشیں و خاطر نشاں۔ بہ اقتاجہاں گرد	درفش جمع آمدہ) منت پذیرفت کہ پیمبدی من بہ پیوندِ
تا کیدِ نظر بر دو بیناں نینداختن، و بہ مقتضاے	این دو جزو باز بستہ است، و عصا و ردا درفش را سپاس
تمہید بہ احوالِ اُحولاں نپرداختن۔ زنار را	گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش) نقشِ جمعیتِ ما

ظہوری

باسُبحہ نہ پیوندیست کہ گسیختنش برکت کشِ کُنشتیان (یعنی قسیساں) نہ خندد، وکفررا باایماں نہ سرِیست کہ صداعش صندل چارہ ازپیشانیِ برہمناں نبرد ۔ از صدمۂ توحیدش دوئی دریکی گریختہ، و بہ علاقۂ تجریدش خودی درتوئی آویختہ۔ گوشے حق شنو، چشمے حق بیں، دلے حق جو، خاطرے عرفاں زا، سینۂ معرفت خیز، تارکے آسماں سا، جبہۂ سجدہ ریز۔

مثنوی

پاے رفعت برآسماں دارد
سرِ خدمت برآستاں دارد
درعبادت بہ گفتن ودیدن
طرزِ او طرزِ حق پرستیدن
خلوتِ دیگران وصحبتِ او
وحدتِ این وآن وکثرتِ او

غالب

رسانشتہ است۔ بیکدگرخوردنِ ایں دوقدح (یعنی فقروسلطنت) مجمع البحرینے پدیدآورد، وسرہم آوردنِ ایں دوقوس نقشِ دائرۂ پدیدارکرد۔ ازسرجوشِ فروغِ مہروماہ بافشردن وپالودن وسرشتن بیکدیگر ساختند، وبہرفروغِ گزندِ چشم بدازپروین وپرن براں پیکر سپند سوختند، سرش راتاجِ شاہی افراختند، ودلش رابنورِ الٰہی فروختند۔ +++++زہے درانجمن خلوت نشیں، وبپادشاہی کارآگہی گزیں۔ پادشاہاں درانجمن ازاں کارآگاہ آدب آموختہ، وکارآگاہاں درخلوت ازاں پادشاہ فیض اندوختہ۔+++

مثنوی

اے کہ ازرازِ نہاں آگہ نۂ
دم مزن از رہ کہ مردِ رہ نہ
در+ ہزاراں مردمردِ رہ یکے ست
آدمی بسیار اما شہ یکے ست
ورتو مے پرسی کہ مردِ راہ کیست
جزسراج الدیں بہادرشاہ کیست

+ [illegible]

ظہوری

دردلش این وآں نے گنجد
ہیچ جزحق دراں نے گنجد
بُت شکن گشت چوں خلیل نخست
بادش ارزانی اعتقادِ درست
کُفر درفکرِ نکتۂ عرفاں
شرک درشکرِ نعمتِ ایماں
طینتش باج خواہِ طینت ہا
نیتش پادشاہِ نیت ہا
درعبادت زہے تومندی
بندگی درخورِ خداوندی
سرِ وحدت بمغز بُرد ازپوست
ہمہ اُو کرد خویش راہمہ اوست

غالب

درطریقت رہنماے رہرواں
درخلافت پیشواے خسرواں
آنکہ چوں ازرازِ وحدت دم زند
دفترِ کون ومکاں برہم زند
آنکہ چوں درنئے نوارا سردہد
نے شود تخلے کہ شبلی بردہد
شبلی ازمنبرد ہدآوازِ عشق
شاہِ ما برتخت گوید رازِ عشق
عشق دارد پایۂ ہرکس نگاہ
منبرازشبلی وتخت ازپادشاہ
انچہ ابراہیم ادہم یافتست
بعدِ ترکِ مسندِ جم یافتست
شاہِ ما دارد بہم دررہروی
خرقۂ پیری وتاجِ خسروی
شاہی ودرویشی اینجا باہم ست
پادشاہِ عہد قطبِ عالم ست

شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرزِ بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اسمیں وہ فخریہ فقرے جو اُسنے اپنے دیوان اور اپنے
کلام کی شان میں لکھے ہیں اُسی قسم کے فقرے مرزا نے بھی دیوانِ فارسی کے دیباچے میں
انشا کئے ہیں. سو دونو دیباچوں میں سے ہم ملتے جلتے فقرے انتخاب کرکے اس مقام پہ
مقابل یکدگر لکھتے ہیں.

حزیں

ہمایوں خطہ ایست لبالب از جواہرِ کلم، و جواہرِ حکم،
روح پرور ہوایش ربیعی اعتدال، و جداولِ
سطورش از ماء معین مالامال. خاکش شکیں نفس
و شمیمش عنبر آگیں، آبش خمار شکن و نسیمش
مسیح آیین. از صبوحیِ فیضے کہ ساقیِ کلکش پیمودہ.
سیاہ مستانِ حروف سر در کنارِ ہم غنودہ اند، و از
نشۂ ہوش بردارے کہ دستِ فکرت در جام و سبوے
الفاظش ریختہ. خردمستانِ معنی فشیدِ شوق سرودہ.
بنام ایزد حُسنِ لیلی ست کہ از طرفِ خیامِ الفاظ
سر بر زدہ در جلوہ گری ست، یا شورِ مجنونے ست
کہ از وادیِ تفسیدہ دل برخاستہ در پردہ دریست.

غالب

بنام ایزد نخستیں نقابیست از روی شاہدِ ہنر کردِ
معنی بجنبشِ نسیم بر افتادہ، یعنی کشاکشِ دست
ناکشیدہ. باز پسیں چراغیست از گرمیِ چراغانِ
نیم سوختۂ پہلو رخ بہ افروختن دادہ، یعنی داغِ
منتِ خس نادیدہ. کہن داغہاے جنون ست
سراسر بناخنِ شوخیِ نفس خراشیدہ. گرما گرم
خونابہ در رفست بہ تلفِ پنہانیِ دل ناگاہ از تارو
تراویدہ. کاغذی† پیرہنانند (یعنی دادخواہانند)

† الفاظ کو اس لئے کہ وہ کاغذ پر مرقوم ہیں کاغذی پیرہن کہا
ہے اور کاغذی پیرہن دادخواہ کو کہتے ہیں دوسرے فقرے میں
معانی کو اسلئے کہ انکی روغنی حروف کی سیاہی میں پوشیدہ ہے
مشعل بکف اور سیہ پوش کہا ہے ۱۲

حزیں

یوسفستانے ست از گلِ پیرہنان در موج،
نگارستانے ست سیمیں بدنانش فوج در فوج.
سہی پیکرانند در خیابانِ سطور دوشادوش،
مغاں شیوہ دلبرانند از بادۂ ناز گرم نوشانوش.
نازک بدنانند حجاب پرورد، گل پیرہنانند
تنہا گرد. پختہ مغزانند برشتہ پوست،
بیگانہ نغزانند آشنا دوست. صوفیانند در
وحدت خانۂ عشق مستِ سماع، سوختگانند
سپند آسا مستِ وداع. درویشانند
تجرد کیش، فرو کیشانند از ہمہ در پیش.
شیر صولتانند از جوشنِ خط پلنگینہ پوشش،
دریا دلانند از شورشِ عشق در جوش و
خروش. آئینہ پیکرانند آئینہ تاب،
پاکیزہ گوہرانند یکسر خوشاب. گلبرگہاے
شبنم زدۂ بہاری ست، خراشیدہ نالہاے
بلبلِ شاخساریست.

غالب

چوں پیکرِ تصویر از حیرتِ واقعہ خاموش (یعنی
اپنی بے قدری سے حیران ہیں) مشعل بکف گرگانند
(یعنی فریادیانند) چوں آذر از دودِ دل سیہ پوش...
نگویم دود چراغست یا لالہ و داغ؛ اما سوختگی را
سرگذشت است و خستگی را روئیداد. نگویم تجلی و طور
یا جنت و حور؛ اما نازش را قلمرو ست و آرایش
را سواد (نواح) طلسمِ شعلہ. دود ست باز بستۂ زرد شت
خیال؛ شعلہ پنہاں، دود پیدا، دل لوحِ طلسم
و زبان طلسم کشا. ہنگامۂ ابر و بادست بر انگیختۂ جادوی فکر،
ابر گہر پاش، و باد الماس فشاں، اندیشہ طومار نیرنگ،
و لب افسوں خواں. دود کیا ہیست باندازِ پیچ و تابے کہ از
شعلہ در دل افتادہ است. بر اہوا تتق بستۂ خیلِ غزاتے ست (سراپردہ ۱۲)
بسامانِ خیشبے کہ در کمیں گاہ رو دادہ است. از
دام بدر جستہ. جمالیست در پردۂ نمایشِ خویش مشاطۂ
حقیقی را ستایش نگار. نہالے ست در سایۂ پیوندی
خویش نخلبندِ ازل را سپاس گزار.

مرزا اور ابو الفضل کی طرز بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہر نیمروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں جو شیخ کے اکبرنامہ میں مذکور ہیں، مگر چونکہ مرزا نے اُن واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے اس لئے دونو کتابوں کی طرز بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادہ واقعہ دونو کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔

اکبرنامہ	مہر نیمروز
ترک بزرگترینِ فرزندانِ یافث بود	ترک ابنِ یافث نشانِ جہانداری یافت و ترکان ایں
ترکان او را یافثِ اوغلان گویند	والا نسکوہ را۔ ازاں روکہ بہ ترکی شہریارِ جوان را اوغلان
و بہوشیار دلی و کارگزاری و عیت پروری	گویند۔ یافثِ اوغلان گفتند۔ داد و دانش آئیں داشت،
از ہمہ برادراں امتیاز داشت۔	و دریں ہر دو شیوہ روشہائے گزیں داشت۔ خانی و مرزبانی
بعد از رحلتِ پدر بر تختِ فرمانروائی	را فرہنگ ہا پدید آورد، و فرماندہی و فرمانبری را اندازہ
نشست، و دادِ مردمی و مردانگی و	برنہاد۔ نزہتگاہِ سیلول با سلیقا را۔ کہ چشمہ ہائے رواں
مظلوم پرستی داد۔ و در جائے کہ ترکاں	و گل و میوہ فراواں داشت۔ از بہرِ آرامش گزید۔ از نے و
او را سیلول باسلیکائی میگفتند، و	علف و چوب و گیاہ نشیمن ہا افراختے، و پوستِ دام و دد را
چشمہ ہائے آب سرد خوشگوار و گرم	پوششِ تن ساختے۔ گویند نمک بروزگارِ وے پدید آمد،
عافیت بخش و مرغزار ہائے دلکش	ورنہ ازاں بیش ترہ و گوشت ہمچناں بے نمک ہمی خوردند۔
داشت اقامت فرمودہ۔ از چوب	ترکانِ شمشیرزن را بفرمانِ فرزانۂ شیر افگن (یعنی یافث اوغلان)

اکبرنامہ	مہر نیمروز
گیاہ خانہ ہا اختراع کرد، و خرگاہ	یرنہاد (دستور) و قرارداد آں بود کہ ازاں ہمہ برگ و ساز کہ از مردہ
پدید آورد۔ و از پوستِ بہائم و سباع	مُروری (میراث) باز ماند جز شمشیر بہ پسر ندہند و ہمہ بدختر باز گذارند
لباس پوشیدنی دوخت۔ و نمک در	کہ ہر آئینہ تیغ جوہر دار فردِ فہرستِ گنجینۂ سیم و زر بلکہ کلیدِ فتحِ
زمانِ او ظاہر شد۔ و در آئینِ او آں	ہفت کشور ست۔ اگر بریں یلارکِ الماس گوں دسترس
بود کہ پسر را جز شمشیرے میراث ندہند	ست مرد را دست مایۂ ناز بس ست۔ بالجملہ ایں ہمہ رسم و
و تمام خواستہ دختر را باشد۔ و گویند کہ	آئیں نہاد و پایانِ کار پس از دو صد و بیست و چہل سالہ بیداری
او معاصرِ کیومرث اول ملوکِ عجم ست	بخوابِ عدم سر بزمیں نہاد۔ بزرگانِ دودہ پس از یافثِ
و او اولِ سلاطینِ ترکستان ست۔	اوغلان بہ فرزندِ بختِ بلندش النجہ خاں چشم روشنی
و عمرِ او دو صد و بیست و چہل سال بود۔	گفتند۔ گلبن کج نہاد و راستی پیشہ گزید۔ بہ پیرامونِ دانش
النجہ خاں بہترینِ فرزندانِ ترکی	نگذشتے، و با بداں ہمزباں نگشتے۔ آزادہ رو بود و دل بیادِ یزداں
بود۔ چوں پیمانۂ زندگی ترکی پر شدن	در گرو داشت۔ تاج و تیغ و نگیں در زندگانیِ خویش، بہ نوبادۂ
گرفت او را بمشورتِ بزرگاں بر	باغِ کامرانیِ خویش دیباقجی خاں جواں بخت نوجواں سپرد،
تختِ سلطنت نشاندہ۔ او خود	خود ازیں خارزار دامن برچید۔ و بآفریں خانہ۔ کہ تواں را صومعہ
دوربیں را پیشوائے خود ساخت	گوئی آرمید۔ دو صد و پنج سال پارۂ بہموداری اقبال و پارہ بپرستاریِ
در عدالت گستری روزگار گذرانید۔	ذوالجلال در جہانِ گذراں ماند، و بہنگامِ ناگزیر در گذشت۔
چوں پیر شد عزلت اختیار فرمود۔	دیباقجی خاں کہ ہم ز نظرگاہِ پدر او رنگ آرائی بود۔ او رنگِ خسروی

اکبرنامہ	مہرنیمروز
دیباقچی بعد از عزلتِ پدر واشارتِ عالیشِ فرماں روا شد. کیوک خاں فرزندِ رشیدِ اوست. پدرش در ہنگامِ پدرود کردنِ جہاں سریرِ خانی بَاو عنایت فرمود. او قدرِ سلطنت را دانستہ در لوازمِ آں اہتمام بجاے آورد. النجہ خاں پسرِ اوست در آخرِ عمرِ پدر ولیعہد شد. دادِ داد و دہش را از اندازہ بیروں بُرد. و ترکاں در زمانِ دولتِ او مستِ دولت شدہ از راہِ خردمندی عدول نمودند. و چوں مدّتے براں بگذشت او را دو پسر بیک شکم آمد. یکے را مغل نام کرد و دیگرے را تاتار. و چوں	را بہ نمطے تازہ آراست، اما بداں دانشوری و دادگری کہ جز دانش نہ جُست و جز داد نہ کرد. روزنامۂ عمرش چہل رقمِ یک صد و ہشتاد و شش سالگی پذیرفت درنوشتند، دبارنامۂ کلکلی وگرونکشی بنامِ پسرِ فرخ اخترش کیوک خاں نوشتند. ستودۂ ستایش درخورِ کار آگاہی آبروی پادشاہی افزود. و یک صد و چہل سال از مرگ اماں یافت. فرزانہ تا از شاہی نشاں یافت جہاں را بخوشی و خشنودیِ جہانیاں را بہ مہر و آزرم نگاہداشت. سرانجامِ کارِ جہان و جہانیاں را بفرزندِ خویش النجہ خاں گذاشت. بہ تردستی دریاکف، و بہ بیدریغ بخشی ابر کردار بود. دہش را بر داد بیشی داد. و فرودستاں (زیردستاں) را بہ دہش از خواہش بے نیاز ساخت. سبکسراں بادِ برُوت (یعنی بہ کبر و غرور) از جا رفتند. و از دائرۂ کیش و آئین بدر زدند. آرامشداد (یعنی انتظام) کنار گرفت، و بت پرستی صورت پذیرفت. بانوی ایں فرمانروا با برگ و نوا دو پسرِ توام زاد. اورنگ نشیں (یعنی النجہ خاں) یکے را مغل خاں و دیگرے را تاتار خاں نام نہاد.

اکبرنامہ	مہرنیمروز
بحدِ کاردانی رسیدند ملک خود را بہ دو حصہ بخش کرد یک نصف را بہ مغل داد و نصفِ دیگر را بتاتار. و چوں پدرِ بزرگوارِ ایشاں ودیعتِ حیات سپرد. فرزنداں با یکدگر موافقت نمودہ ہر کدام در ولایتِ خویش خود آرائی می کردند.	ہر دو را بناز پرورد. چوں بہ برنائی رسید قلمروِ خویش را دو نیم کردہ نیمہ بہ مغل و نیمہ بہ تاتار نامزد کرد و خود بیکصد و بیست و ہفت سال در گیتی درنگ ورزیدہ پَے رفتگاں برداشت. اللہ اللہ ایں را نیز چوں روزِ فرو رفتگانِ دگر روز فرو رفت ؎ ریزد آں برگ و ایں گل افشاند ہم خزاں ہم بہار در گذر ست

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور اُنکے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اُسکا دکھانا مقصود تھا۔ ختم ہوگیا؛ مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب اُن تصنیفات میں شمار نہیں ہوسکتی جنکی آجکل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے؛ اور جو اہلِ وطن کی موسمی بیماریوں کے لئے براہِ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں۔ کیونکہ اِس مضمون کے لکھنے پر ہمکو اُس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے جسکی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن میرسد از دل بہ لبِ ما عشق ست کہ بربستہ زبانِ ادبِ ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا جاتا ہے اُسکو چاہو اُس متعقدانہ جوشِ عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کردیتا ہے، اور چاہو اُس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے؛ بہرتقدیر یہی وہ چیز تھی جسنے ہمکو اِس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہمکو یہ دعوی ہے کہ ہمنے اِس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے؛ اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیرخواہی اُسکے لکھنے کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض

طبیعت کے اقتضا سے نہ کہ عقل کی صوابدید سے سرانجام کیا جائے اُس سے لوگوں کو بواسطہ یا بلا واسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہونچے؛ ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے، اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے۔ گو اُنکو خود خبر نہیں کہ ہم کہاں جارہے ہیں اور کیوں جارہے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اُنکی سعی محض بے حاصل اور اُنکی کوشش سراسر بے سود ہے۔ اِسی طرح کوئی ذرہ ذراتِ عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطراری حرکت سے نظامِ کلّی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

"اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز برہِ تو روی نیست در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری"

یادگارِ غالب کو ہمنے دو حصوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مرزا کی لائف یعنی اُنکی زندگی کے حالات اور اُنکے اخلاق و عادات کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں اُنکے کلام کا انتخاب ہے۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں۔ جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں۔ کوئی مہتم بالشان واقعہ اُنکی شاعری و انشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا؛ باانیہمہ اُسمیں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہلِ وطن کے لئے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا، اور نو برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہوا۔ اُنکی ننھیال۔ جہاں اُنھوں نے پرورش اور نشو و نما پائی۔ آسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے صغرِ سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھگئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور حدت کی ایک آگ بھری ہوئی تھی جسکے بھڑکانے کے لئے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا

سایۂ تربیت بچپن میں سر سے اٹھ جانا، ننھیال کی مرفہ الحالی، نانا نانی کی نازبرداریاں اور خود مرزا کا ذکی الحس ہونا؛ یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوانِ شباب میں انکا جادۂ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا اگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال کی تمام املاک اور ویہات کی صفائی نہو لی نشئے ہرن نہوئے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر میں سنبھلے مگر وہ جو مشہور ہے کہ "صبح کا بھولا شام کو آجائے تو بھولا نہ جانو" انھوں نے اپنے فضل وکمال، حسنِ معاشرت، شریفانہ خصائل، اور کریمانہ اخلاق سے - جو کہ انکے ذاتی جوہر تھے - وہ عارضی دھبے اس طرح دھو ڈالے کہ گویا کبھی ان سے دامن آلودہ نہوا تھا جس فن پر انھوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا اسکو اخیر عمر تک نبھا دیا؛ غفلت اور بدمستی کے عالم میں بھی اسکا خیال نہ چھوڑا؛ اور باوجودیکہ زمانہ قدردانوں سے خالی تھا اسکو اس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اسکا منتہاے کمال تھا۔

اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلہ اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی؛ بلکہ جن اللّے تللّوں میں بچپن اور جوانی گذری تھی اسکے لحاظ سے یہ کہنا چاہئے کہ وہ اخیر دم تک خورِ بعد الکور میں مبتلا رہے۔ اسکے سوا امراض جسمانی سے کبھی فرصت نہیں ملی اور اپنے ہنر کی کسادبازاری کا رنج ہمیشہ سوہانِ روح رہا۔ باوجود اسکے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک انکی رفیقِ حال رہی۔ اگرچہ نظم ونثر میں جو زارنالیاں انھوں نے کی ہیں وہ بظاہر بے صبری اور تنگ حوصلگی پر - جو ایک اخلاقی کمزوری ہے - دلالت کرتی ہیں؛ لیکن درحقیقت یہ انکی شاعری و

انشاپردازی کے میدانوں میں سے ایک میدان تھا جسکی زمین انکے پانو کو لگ گئی تھی۔ اول تو خود یہ مضمون ہی ایشیائی شاعری کا جزوِ اعظم ہے؛ دوسرے ہر شاعر ایک خاص راگنی کا کلانوت ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب کے شعرا میں امرء القیس گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عیش کے بیان میں مشہور تھا، اعشےٰ حسنِ طلب اور وصفِ شراب میں ضرب المثل تھا اور اسی طرح ہر شاعر کی شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی۔ علیٰ ہذا القیاس ایران میں فردوسی رزم کا دھنی تھا، نظامی بزم کا، اور سعدی موعظت کا۔ چونکہ مرزا خاصکر رنج ومصیبت کے بیان میں ید طولےٰ رکھتے تھے اس لئے یہ مضمون اکثر ان کے قلم سے تراوش کرتا تھا۔

اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ - اس وجہ سے کہ زمانہ اسکا اندازہ کرنے سے عاجز تھا - پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہئے تھا نہیں بٹھا سکے؛ مگر وسعتِ اخلاق حسنِ معاشرت اور صلح کل سے انھوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے دوستوں اور ہوا خواہوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہونچ گئی تھی؛ اور ہر ایک کے ساتھ انکے برتاؤ کا طریقہ ایسا مہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں انکے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھکر خبر لینی، نوکروں اور لگے بندھوں کو عسرت کے وقت اپنے سے علحدہ نہ کرنا، درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی اور انکی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور انکے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاسِ وضع اور خودداری کو ہاتھ سے

نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب و ملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں
صفائی اور خلوص سے ملنا، یہ اور اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دار الخلافتہ کی قدیم
سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں اُنکی ذات میں جمع تھیں. خصوصاً وفاداری، حق شناسی
اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کے قدیم خاندانوں کا شعار تھا مرزا
کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی. چونکہ اُنکے چچا نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک
کی مہمات میں شریک رہے تھے اور اُنکی وفات کے بعد گورنمنٹ نے اُنکے پسماندوں
کے لئے۔ جنمیں سے ایک مرزا بھی تھے۔ کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن کے مقرر کردیا تھا،
مرزا نے۔ جیسا کہ اُنکی تحریرات سے ظاہر ہے۔ اخیر عمر تک گورنمنٹ کے اِس احسان کو
فراموش نہیں کیا. تمام عمر ملکۂ معظمہ اور وائسراؤں اور لفٹننٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور
افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی، بعض افسروں کی وفات پر
دردناک مرثیے لکھے اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگانِ دامنِ دولتِ انگلشیہ
سے سمجھتے رہے. غدر کے زمانے میں فوجِ باغی کے ظلم و ستم سے جو اثر اُنکے دل پر
ہوا تھا وہ اُنکی کتاب دستنبو سے۔ جو غدر کے حالات پر اُسی شورش و فتنہ کے زمانے
میں اُنھوں نے لکھی تھی۔ ظاہر ہے. ۱۲۵۰ھ میں ولیم فریزر صاحب رزیڈنٹ و کمشنر
دہلی کے بے گناہ مارے جانے پر جو سخت صدمہ اُنکو پہنچا تھا وہ اُنکے اُس خط سے جو
شیخ امام بخش ناسخ کو اِس واقعہ کے ہوتے ہی اُنھوں نے لکھا تھا۔ ظاہر ہے. وہ اِس
خط میں لکھتے ہیں "یکے از ستمگرانِ ناخدا ترس۔ کہ بعذابِ ابدی گرفتار باد۔ ولیم فریزر را

کہ رزیڈنٹ دہلی و غالبِ مغلوب را مُربّی بود۔ در شبِ تاریک بضربِ تفنگ کشت، و مرا
غمِ مرگِ پدر تازہ کرد. دل از جاے رفت، و سترگ اندوہے سراپاے اندیشہ را فرو گرفت
خرمنِ آرمیدگی پاک بسوخت، و نقشِ امید از صفحۂ ضمیر سراسر سترده شد"
اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصنافِ سخن سے زیادہ معلوم
ہوتی ہے اور اُنھوں نے جا بجا اِس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ
اہلِ جاہ کی مداحی میں صرف ہوا، مگر ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو فن مرزا نے
اختیار کیا تھا اُسکی تکمیل اُنکے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اِس خاص صنف
یعنی قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف تھی؛ کیونکہ فارسی شاعری کی ابتدا اِسی صنف
سے ہوئی اور کوئی شاعر جسنے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا
گیا. یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی، اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اِس آلودگی
سے پاک نہیں رہا. خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اُسکو شعرا میں شمار کرنا
نہیں چاہیئے اور اِسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا
جانتے تھے. بڑی دلیل اِس بات کی۔ کہ مرزا نے جس قدر قصیدے اہلِ دنیا کی مدح
میں انشا کئے ہیں اُن سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی۔ یہ ہے کہ اُنکا ممدوح مخاطب
صحیح ہو یا نہو، اور اُس سے حسنِ کلام کی داد ملنے کی توقع ہو یا نہو۔ وہ ہمیشہ قصیدے
کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا
کمالِ شاعری اُسی طرح ظاہر کرتے تھے جیسے متنبی سیف الدولہ کی یا عرفی خانخاناں

کی تعریف میں کرتا تھا مع ذلک چند قصیدوں کے سوا - جو دوستوں کی ترغیب و تحریص سے اُنھوں نے کسی امید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیسوں کی مدح میں لکھے ہیں - باقی اُنکے تمام قصائد یا توحید و نعت و منقبت میں ہیں، یا اپنے معزز اور لائق ہمعصروں کی تعریف میں، اور یا اُن لوگوں کی شان میں جنکو وہ اپنا مُربّی اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور جنکی مدح سرائی کا فرض بطور شکرگزاری و منعم پرستی نہ بامید صلہ و انعام ادا کرتے تھے ؛ جیسے قلعۂ دہلی کے بادشاہ و ولیعہد، یا ملکۂ معظمہ اور وائسرایان کشورِ ہند اور دیگر اعیان و ارکانِ سلطنتِ انگلشیہ، یا فرمانروایانِ ریاستِ رامپور و الور وغیرہ۔

باایںہمہ جس مؤثر طریقے سے مرزا نے اہلِ دنیا کی مدح سرائی پر افسوس کیا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ دیوانِ فارسی کے دیباچے میں اپنی شاعری کے متعلق بہت سے فخریہ فقرے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں " دریوائے کہ بالِ بالاخوانی زدہ، و دردادائے کہ خود را بہ شگرفی ستودہ ام (یعنی جس دیوان پر میں نے اس قدر فخر کیا ہے) نیمہ ازاں شاہد بازی ست یعنی ہوا پرستی (اس سے مراد غزل سرائی ہے) و نیمۂ دیگر تونگر ستائی ست یعنی باد خوانی (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے) بیدادیں! کہ ہرجا بہ شانہ۔ خمے از زلفِ مرغولہ مویاں کشودہ شود بلا در من آویزد تا دل بہ پیچاک آں شکن بندمے ؛ و خواری نگر اکہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے بر اورنگِ سروری کج نشیند ہوس مرا برانگیزد تا بہ ستیش بندہ وار راست ایستمے۔ شادم از آزادی کہ بیاسخن بہ ہنجار

عشقبازاں گزاردستم ؛ و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردارِ دنیا طلبیاں در مدحِ اہلِ جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمرِ سبک سیر لختے بہ چامہ و چنگ سر آمد، و پارۂ بہ دروغ و دریغ رفت"

یہاں تک جو کچھ کہ مرزا کی لائف کے متعلق ہمکو لکھنا تھا لکھا گیا۔ اب ہم چند سطریں اُنکے کلام کے انتخاب کی نسبت لکھنی چاہتے ہیں۔

ہمنے اس کتاب میں - جیسا کہ مکرر بیان ہو چکا ہے - مرزا کے کلام کا انتخاب صرف اس غرض سے درج کیا ہے کہ شاعری و انشاپردازی کی غیر معمولی استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی - جہاں تک کہ اُنکی نظم و نثر اُس پر شہادت دے سکتی ہے - صاحبانِ ذوقِ سلیم پر واضح و لائح ہو جائے۔ اگرچہ فی الحقیقۃ طریقۂ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے لیکن اگر بالفرض اُسکا پورا ہونا تسلیم کر لیا جائے تو بھی بظاہر اُس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔

زمانۂ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے اسیطرح لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ قدیم طریقے کی شاعری (اگرچہ ابھی تک اُسکا نعم البدل پیدا نہیں ہوا) روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے۔ نظم و نثر میں بجائے صنعتِ الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جو باتیں پہلے محاسنِ کلام میں داخل تھیں اب اُنمیں سے اکثر داخلِ عیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلط ابھی بہت کچھ باقی ہے اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا مگر زمانے کا رُخ قدیم شاہراہ سے

یقیناً پھر گیا ہے؛ اور آیندہ تمام قافلوں کو جو اِس وادی میں قدم رکھنے والے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ضرور ہے۔ پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کر لیا جائے تو بھی اِس زمانے میں اُنکی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنے اور اُنکے مبلغ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا بظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے جسکا وقت گذر گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اُسکو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا؛ خصوصاً ہندوستان کی لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے ایسی یورپ کے موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بعض نامور شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے ابتک استفادہ حاصل کرتے اور اُس سے صدہا اسلوب بیان اخذ کرتے ہیں تو ہمارے ہموطن کیونکر اُس سے استغنا کا دعوے کر سکتے ہیں۔ جس طرح زمانۂ حال کے انجنیر قدیم عمارتوں اور پرانے کھنڈروں سے انجنیرنگ کے متعلق صدہا مفید نتیجے استخراج کرتے ہیں اسی طرح اِس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم لٹریچر سے بہت کچھ لٹریری فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمنے مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے اور ہمارے لٹریچر نے اُسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہمکو انگلش لٹریچر سے کون سی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہئے اُسوقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہیگا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ہمنے اِس کتاب میں دکھایا ہے اگرچہ ممکن ہے کہ وہ زمانۂ حال کے مذاق کے موافق نہو لیکن اس سے مرزا کے کمالِ شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعرا۔ جو اپنے زمانے میں مسلّم الثبوت تھے۔ آج اہلِ زبان اُنکی طرزِ شاعری کو نام رکھتے ہیں؛ خصوصاً متوسطین کے طبقے میں جو لوگ جامی کے بعد ہوئے ہیں اور جنمیں تقریباً وہ تمام شعرا داخل ہیں جنھوں نے صفویّہ اور مغلیّہ کے عہدِ حکومت میں ایران یا ہندوستان میں عَلَمِ امتیاز بلند کیا تھا اُنکی شاعری کو۔ جیسا کہ رضا قلی خانِ ہدایت نے اپنے تذکرۂ مجمع الفصحا میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے۔ آج اہلِ زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ سب قدما کی روش کو پسند کرتے ہیں اور اُنھیں کے تتبع کا دم بھرتے ہیں۔ حالانکہ متوسطین کے طبقے میں بڑے بڑے نامور شعرا گذرے ہیں جنکے کمال اور اُستادی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ پس درحقیقت کسیکی شاعری یا انشا پردازی کا پبلک کے موجودہ مذاق کے خلاف ہونا اِسکے سوا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جو شے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی وہ اب دوسری وضع کے سانچے میں نہیں سما سکتی۔

اگرچہ مرزا کی شاعری نے شعرائے متوسطین کے محدود دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا؛ وہی چند میدان جن میں اُنھوں نے گھوڑے دوڑائے تھے ہمیشہ مرزا کی جولانگاہ رہے؛ لیکن جس درجے کا ملکۂ شاعری اُنکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اُس سے پایا جاتا ہے کہ جس طرح دریائے مواج جدھر رُخ کرتا ہے اُدھر اپنا رستہ برابر نکالتا چلا جاتا ہے؛

اسی طرح وہ جس میدان میں قدم رکھتے اُسکو کامیابی کے ساتھ طے کرجاتے۔ وہی بارود جو آتشبازی میں بچّوں کا جی لُبھاتی ہے جب اُسکو دوسری طرح کام میں لایا جاتا ہے تو بڑے بڑے قلعوں اور پہاڑوں کو پرکاہ کی طرح اُڑا دیتی ہے۔ اور وہی ایک چیز تھی جسنے کہیں صرف احباب کے جلسوں اور امیروں کے درباروں کو گرم کیا اور کہیں ملکوں اور قوموں میں حبِ وطن اور قومی ہمدردی کی آگ لگادی۔

اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری کسی خاص زمانہ یا خاص ملک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا؛ پس یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں ہوتی تھی ویسی متاخرین میں نہیں ہوسکتی؛ یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے ویسی ہندوستان کے شعرا میں نہیں ہوتی۔ ملکۂ شاعری کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسی مصوری کی قابلیت یا سُریلی آواز؛ جس طرح ان دونو صفتوں کا ہر زمانے اور ہر ملک میں اعلےٰ سے اعلےٰ درجے پر پایا جانا ممکن ہے اسی طرح اعلےٰ سے اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور مختلف شانوں میں ظہور کرتا ہے؛ اور سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈال دیتا ہے وہ سوسایٹی کا دباؤ اور اُسکا مذاق ہے۔ انیس اسی ملکۂ شاعری کے ساتھ جو اُسکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اگر چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتا، اور اُسی سوسائٹی میں نشو و نما پاتا جسمیں فردوسی نے نشو و نما پائی تھی تو ہمارے نزدیک اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ رزمیہ نظم میں وہی رتبہ پاتا جو فردوسی

نے پایا تھا؛ اور فردوسی اُسی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ جو قدرت نے اُسکے دماغ میں ودیعت کی تھی۔ اگر ہندوستان کی اُس سوسائٹی کے سایے میں پلتا جو انیس کو میسر آئی تھی تو یقیناً وہ شاعری میں وہی صنف اختیار کرتا جو انیس نے اختیار کی تھی اور اُس میں انیس سے کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ کرتا۔ اسی بنا پر ایران کا ایک متأخر شاعر کہتا ہے۔

نیست اندر زمانہ محمودے　　　ورنہ ہر گوشہ صد چو عنصر نیست

اور اسی اصول پر غالب مرحوم کہتے ہیں۔

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی　　　مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

مرزا نے جس وقت شعرِ فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اُس وقت ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا، ایک نظیری و عرفی وغیرہ کی طرز جو اکبر کے زمانے سے چلی آتی تھی؛ دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شایع ہوئی اور علوی و صہبائی پر آکر ختم ہوگئی۔ جو لوگ شعرِ فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے وہ انھیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے۔ اگرچہ حافظ اور خسرو کی غزل اُن سے بہت زیادہ مقبولِ خاص و عام تھی مگر اُن وجوہات سے جو متأخرین کو طرزِ جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جن کا ذکر ہم دوسرے حصّے میں کر چکے ہیں۔ مرزا نے اوّل بیدل کی روش پر چلنا شروع کیا؛ پھر اس نظر سے۔ کہ اہلِ زبان اس طرز کو ٹکسال باہر خیال کرتے تھے۔ نظیری و عرفی کی

طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر۔ جو ایسے ناپرساں زمانے میں پیدا ہوا ہو
اور جس نے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقلید
نمونہ نہ دیکھا ہو۔ وہ سوا اِسکے کہ اُن کا اتباع اختیار کرے اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ
اُسنے اِس طرزِ شاعری میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اور اُن لوگوں کی پیروی
کا کہاں تک حق ادا کیا ہے۔ سو اُسکو اِس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے جیسے دُو اور دُو
چار؛ البتہ جو لوگ شعرِ فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ اکبری دورہ کے شعرا اور مرزا
کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد امید ہے کہ مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد
کا اعتراف کرینگے اور اِس بات کو تسلیم کرینگے کہ زمانے کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اِس
شخص کو جس روش پر ڈال دیتا وہ ضرور اُسمیں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب
حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گذرے تو اُسکے کلام کی روانی اور بیساختہ پن
دیکھکر اُنکو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا؛ اور اِسی لئے اُنکے سب سے
پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی
اور بیساختگی پائی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اب دوسری چال چلنے کا وقت نہیں رہا تھا
اِس لئے اِس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اِس کتاب میں۔ جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے۔ مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا بجا
نظیری و عرفی وغیرہم کا۔ جنکو خود مرزا اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم پلہ قرار دیا گیا ہے
سو قطع نظر اِسکے کہ کوئی قطعی دلیل اِس دعوے پر قائم نہیں ہو سکتی، اور ناظرین کے

ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اِسکا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں دُو اور سوال پیدا
ہوتے ہیں؛ اول یہ کہ ایک زباندان آدمی شاعری میں اہلِ زبان کے برابر ہو بھی سکتا
ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پَیرَو اپنے پیشرووں کے ساتھ مساوات کا درجہ
حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے۔ دنیا
میں ابتدا سے آج تک نہ صرف شعر و شاعری میں بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشہ میں
اکثر پیرو اپنے پیش رووں کے صرف برابر ہی نہیں بلکہ اُن سے فائق اور افضل
ہوتے رہے ہیں۔ فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے؛
مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بقدم
چلے ہیں مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ قاآنی قصیدے میں تمام قدما سے
بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو۔ جو یقیناً اُسکے پیش رو تھے۔
غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے۔ جو
اُن سے پہلے ہوئے۔ بازی لے گئے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری
میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں بلکہ صرف اُن کا ہم پلہ قرار دیا جائے تو اِس میں
کون سی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دُو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے؛
ایک امیجنیشن یعنی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال
پر قدرت۔ انمیں سے پہلی لیاقت۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ ممکن ہے کہ ایک زباندان

بہ نسبت اہلِ زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے، اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواص اہل شہر کے بمراتب افضل و اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت اگرچہ بظاہر اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُسمیں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاصکر اُس حصۂ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے اہلِ ایران کی برابری کرسکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون عربی زبان کی نسبت۔ جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے۔ لکھتے ہیں کہ "ایک عجمی (یعنی غیر عربی) فصحاے عرب کے کلام کی ممارست سے اہلِ زبان میں شمار ہو سکتا ہے" پس فارسی زباں جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے اس بات کے زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحاے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہلِ زبان میں شمار کیا جائے۔

مذکورہ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ مرزا کو ملکۂ شاعری کے لحاظ سے اکبری دورے کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں یا اُن سے کم سمجھیں یا اُنکے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری لیاقت سو اُسکی نسبت پہلے حصے میں جابجا ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحب زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحص اور کثرتِ مطالعہ اور غوّاصیِ فکر اور مشقِ سخن اور خاصکر اپنی خداداد لٹریری قابلیت سے یقیناً وہ مرتبہ حاصل کرلیا تھا جس سے ایک زباندان مثل اہلِ زبان کے مستند سمجھا جا سکتا ہے۔ لارڈ مکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غیر مادری زبان

میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہوسکتا۔ بے شک اُنکا ایسا سمجھنا یوروپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ یوروپ کی شاعری درحقیقت نیچر کی ترجمانی ہے۔ اُسکا میدان اُسی قدر وسیع ہے جس قدر نیچر کی فضا۔ اُسکے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہئیں۔ ادا نہیں ہوسکتے؛ بلکہ ایشیائی شاعر جو اس طریقۂ شاعری سے نابلد ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اُسکی مشکلات سے عہدہ برا نہیں ہوسکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاصکر متاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں انھیں معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گئے ہیں نئے نئے اسلوبوں اور نئی نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا ہی کمالِ شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی فی نفسہ ایک بہت بڑا کمال ہے لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے جسکو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے اور بشرطیکہ اُسمیں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو اُسکو شعراے اہلِ زبان کی طرح بلکہ بعض صورتوں میں اُن سے بہتر استعمال کرسکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے، کیونکہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے؛ اُسنے اس صنف کو چھوا تک نہیں۔ عرفی نے بیشک چند مثنویاں لکھی ہیں، مگر صاحبِ آتشکدہ نے اُن میں سے صرف ایک کی نسبت لکھا ہے کہ "بد نگفتہ است" اور باقی کی نسبت اُسکا یہ قول ہے کہ "بسیار بد گفتہ"، حکیم ہمام کا بیٹا حکیم حاذق عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے۔

مثنویش طرزِ فصاحت نداشت　　　کانِ نمک بود و ملاحت نداشت

البتہ ظہوری کے ساقی نامہ نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے مگر اُسکا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا۔ بخلاف مرزا کے کہ اُسکو مثنوی پر بھی تقریباً اُسی قدر قدرت ہے جیسی قصیدے اور غزل پر۔ نثر میں نظیری و عرفی دونوں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ ظہوری کی سہ نثر کو ہندوستان میں بہت فروغ ہوا ہے؛ مگر اُس میں اول سے آخر تک ایک بے مزہ کہانی یعنی ابراہیم عادل شاہ کی مدح و ستایش کے سوا دوسرے مضمون کا نام نہیں جس سے لکھنے والے کی قدرتِ بیان معلوم ہو۔ پس اگر ظہوری کی طرزِ بیان اور طرزِ عبارت آرائی کے حسن و قبح سے قطعِ نظر کی جائے تو بھی اُسکے حق میں اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُسکو مدحیہ نثر لکھنی اچھی آتی تھی۔ بخلاف مرزا کے کہ وہ اپنی طرزِ خاص میں ہر طرح کے مضامین لکھنے اور ہر طرح کے مقاصد ادا کرنے پر یکساں قدرت رکھتا تھا؛ خصوصاً فخر و خودستائی، غم و اندوہ اور شکایت و زارنالی کے مضامین جس خوبی و لطافت اور بانکپن کے ساتھ مرزا نے نثر میں بیان کئے ہیں اُسکی نظیر نہ صرف ہندوستانیوں کی نثر میں بلکہ متاخرین اہلِ ایران کی نثر میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم یہ باتیں ایسے زمانے میں لکھ رہے ہیں کہ گو ہر شخص آزادی سے اپنی راے ظاہر کر سکتا ہے۔ لیکن فارسی زبان ہمارے ملک میں بمنزلہ مُردہ زبان کے ہوگئی ہے؛ اور اِس لئے لوگوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں اِسکے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دیکھو، پڑھو، سمجھو،

اور جانچو۔

الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری راے کا ماحصل یہ ہے کہ اُنکا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا، مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا، اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں؛ اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں جو ممکن ہے کہ اہلِ زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرے ہوے ہوں، مگر ایسی کسروں سے کسی زباندان یا اہلِ زبان کا کلام پاک نہیں ہو سکتا؛ اور نہ ایسی جزوی فروگذاشتوں سے کسیکی اُستادی میں فرق آسکتا ہے ولِلّٰہ دَرُّ القائل۔

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست　　　در یدِ بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

مرزا کے اُردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصے میں بقدرِ ضرورت بحث کر چکے ہیں۔ مرزا کا موازنہ شعراے اُردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہو سکتا ہے؛ کیونکہ غزل کے سوا دیگر اصناف میں اُنکا کلام کَاَنْ لَمْ یَکُنْ ہے؛ اور اُردو کی نثر میں دیگر شعرا بمقابلہ مرزا کے صفرِ محض ہیں۔ مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر و سودا کی روش پر نہیں ہے؛ مگر خواصِ اہلِ ملک جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں۔ اُنکے چیدہ و برگزیدہ اشعار کو میر و سودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے۔

مرزا کی نثر اُردو نے تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کی ہے اور خاص و عام

نے بالاتفاق اُسکو پسند کیا ہے ۔ اُنھوں نے اُردو خط کتابت میں ایک خاص طرز ایجاد کی ہے جو تمام مُلک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر لوگوں نے اپنی بساط کے موافق اُسکی اپیروی کی ہے ۔

اِن تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی - امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اُٹھا ؛ اور چونکہ زمانے کا رُخ بدلا ہوا ہے اِس لئے آیندہ بھی یہ امید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اِس سرزمین پر پیدا ہوں گے ؎